نمبر	عنوانات	صفحات

اَلْحَث عَلیٰ الازْدِیَادِ مِنَ الْخَیْرِ فِیْ أَوَاخِرِ الْعُمُرِ

اخیر عمر میں نیکیوں کی کثرت

نمبر	عنوانات	صفحات

كَثْرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ ا
نیکی کے راستے بہت ہیں

نمبر	عنوانات	صفحات

كَثْرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ ۲
نیکی کے راستے بہت ہیں

كَثْرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ ۳

نیکی کے راستے بہت ہیں

الاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ ۱

عبادات میں درمیانی راہ

الاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ ۲

عبادات میں درمیانی راہ

اَلْمُحَافَظَةُ عَلیٰ الْأَعْمَالِ

اعمال کی پابندی

المُحَافَظَةُ عَلیٰ السُّنَّةِ ۱

سنتوں کا اہتمام

نمبر	عنوانات	صفحات

اَلمُحَافَظَةُ عَلیٰ السُّنَّةِ ۲

سنتوں کا اہتمام

وُجُوبُ الْاِنْقِيَادِ لِحُكْمِ اللهِ تَعَالىٰ

حکم الٰہی کی تابعداری

اَلنَّھْیُ عَنِ الْبِدَعِ

بدعات سے ممانعت

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً
کسی نیک یا برے عمل کی بنیاد ڈالنا

نمبر	عنوانات	صفحات

اَلدَّلالَۃُ عَلٰی خَیْرٍ
بھلائی کی طرف رہنمائی

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۲۹	خزانچی کو بھی چند شرائط کے ساتھ صدقہ کا ثواب ملتا ہے	۳۵۶

النَّصِیُحَةُ
خیر خواہی اور بھلائی

الأَمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهُیُ عَنِ الْمُنْکَرِ ۱
بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا

الْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ ۲

بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا

الأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ ۳

بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ أستعین



اللہ ذوالجلال والاکرام کے فضل وکرم سے ''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کی ﴿جلد سوم﴾ ناظرین کے ہاتھوں میں ہے اور قارئین جانتے ہیں کہ یہ سلسلہ ریاض الصالحین کے ان مبارک اسباق کی تحریری شکل ہے جو مجمع عام میں دیا جاتا ہے، حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری (دامت برکاتہم وعمت فیوضہم واطال اللہ بقائہٗ بالصحۃ والعافیۃ التامۃ) احادیث کا ترجمہ و تشریح فرماتے ہیں، لوگ پوری رغبت سے شریک ہوتے ہیں، انہماک سے سنتے ہیں اور فیضیاب ہوتے ہیں۔

درِ فیضِ محمد وا ہے، آئے جس کا جی چاہے

برادرانِ اسلام! حدیث کے اصلاحی مضامین کے مبارک سلسلہ سے وابستگی بڑی سعادت ہے، ادارہ کے لئے بھی اور قارئین کے لئے بھی اور مجلسِ درس میں شرکت کرنے والوں کے لئے بھی۔ ایسی بابرکت محفل میں پیار ومحبت سے دوسروں کو لانا اور ایسی کتابوں کی جانب دوسروں کو متوجہ کرنا؛ جہاں سعادتِ عظمیٰ ہے وہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک آسان طریقہ بھی ہے۔ بدی اور فتن کے ایسے دور میں جہاں ہر طرف برائیوں کا بول بالا ہو، اسی کی نشر واشاعت ہو رہی ہو، اور اسی کی لوگوں کو دعوت دی جارہی ہو، معروف سے روکا جارہا ہو اور منکر کا حکم دیا جارہا ہو، جس کی خبر ۱۴۰۰؍سال پہلے ہی حضرت صادق ومصدوق ﷺ دے چکے ہیں؛ کسی صالح انسان سے خود کو منسلک کر دینا اور اس سے قرآن وحدیث کا درس

لینا؛ایسا گوہرِ نایاب ہے،جس کی صحیح قدر و قیمت اس فانی جہاں سے رخصت ہونے کے بعد ہی معلوم ہوگی۔آج ضرورت ہے نبوی تعلیمات سے واقف ہوکرانہیں اپنی زندگیوں میں اتارنے کی اوراس کے انوار سے تاریک معاشرہ کومنور کرنے کی۔صالحین اوراہلِ دل کا یہ مقدس گروہ ہمارے لئے جائے پناہ ہے،ان کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوجانے سے شرور وفتن سے حفاظت ہوتی ہے،دل کوسکون واطمینان ملتاہے۔آج دنیا جس راستہ پر جارہی ہے اور لے جارہی ہے وہ پریشانی اورڈپریشن(Depression)والا ہے۔ ہماہمی اور رواروی کے اس زمانہ میں اگرگھروں میں ایسی کتابوں کواجتماعی طور پر بھی پڑھااورسنا جائے توانسان بہت حدتک شرعی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔

جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ مزاجِ شرع کو پہچانے بغیراس کے تقاضوں کو چاہتے ہوئے بھی پورانہیں کرسکتے؛ وہیں یہ بھی ایک سچائی ہے کہ علماء ربانیین،اہل اللہ،بزرگوں کی مجالس اوران کی صحبتوں سے استفادہ کیے بغیرآدمی مزاجِ شرع کوکماحقہٗ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ چونکہ آج کل اس کی ضرورت کااحساس نہیں رہا؛اس لئے ہرجگہ نقصان نظرآتا ہے۔

اگرکوئی شخص صحیح معنیٰ میں اسلام کے مزاج سے واقف ہوناچاہتاہے،نیزاپنے مزاج میں اعتدال،استقامت،صبروتحمل وغیرہ امور پیدا کرنا چاہتاہے تواسے قرآن واحادیث میں ان مضامین کا،نیزان موضوعات پر دستیاب کتابوں کا مطالعہ کرنااور بیانات سننے کے علاوہ ایسے حضرات اہل اللہ سے باقاعدہ عقیدت مندانہ وابستگی جملہ شرائط وآداب کی بجاآوری کے ساتھ قائم کرنی ہوگی؛جن کے فیضِ صحبت سے مزاج شناسی بھی حاصل ہوجائے اورطبیعت و مزاج میں اعتدال واستقامت بھی پیدا ہو،اوراستقامت درحقیقت اعتدال کالازمی ثمرہ ہے۔

ہمارے ملکی وملی ،سیاسی وسماجی ،انفرادی واجتماعی تمام مسائل کا حل تعلیماتِ نبویہ میں مضمر ہے،اسلامی تعلیمات کی برکات اورغیر اسلامی نظام زندگی کی قباحت وشناعت سمجھاتے اور بتاتے ہوئے علماءِ امت کے گلے اور مفتیان کرام کے قلم خشک ہو گئے،علماء اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں اور جس کے مقدر میں اسلامی تعلیمات کی مٹھاس چکھنا لکھا گیا ہے وہ اس کو گلے لگا کر اپنے دامن کو بھر لیتے ہیں۔ وَالْفَضْلُ مَاشَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَآءُ .

جادو وہ جو سر چڑھ بولے

بڑی سٹپٹانے والی حالت تب ہوتی ہے جب اغیار ہمیں تعلیمات اسلامی کی اہمیت اور فضائل بتاتے اور سمجھاتے ہیں،اس کو اس کے علاوہ کیا تعبیر دی جائے کہ برسہا برس سے خزانوں کے مالک اور راز دار ہو کر بھی ہم مفلسوں اور قلاشوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ شریعت وسنت کی پاکیزہ ہدایات سے اپنی انفرادی واجتماعی زندگیوں کو معطر و منور بنا کر اغیار کو متأثر کر کے انہیں اپنے بارے میں جاننے اور معلوم کرنے پر مجبور کرتے؛ آج ہم خود ہی ان کے لٹو بن کر ان کی تھوکی ہوئی گندگیوں کو چاٹ کر خود کو اور سماج کو متعفن وآلودہ بنا رہے ہیں۔

آج ہماری بہو بیٹیاں جس تیزی سے بے پردگی کی جانب لپک رہی ہیں اس سے کئی گنا تیزی سے اسلام کے ازلی دشمن یہود ونصاریٰ کی بیٹیاں-اور وہ بھی کوئی ناخواندہ یا سادہ لوح نہیں بلکہ پڑھی لکھی، سنجیدہ اور سمجھدار- پردہ کو گلے لگا کر خود کو دامن اسلام سے وابستہ کر کے عزت وتحفظ کا ایک عجیب وغریب احساس کر رہی ہیں۔اگر نو مسلم خواتین کا سروے کیا جائے تو شاید ان میں کی اکثریت وہ ہوگی جو اسلام کی ''پردہ'' کی تعلیم سے متأثر ہو کر

حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔

ہمارے لئے تو ایک ہی بات پلے باندھ لینے کے لئے کافی ہے جو خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے دوٹوک انداز میں کہی تھی: ﴿نَحْنُ قَوْمٌ أَعَزَّنَا اللهُ بِالْإِسْلَامِ، فَإِذَا ابْتَغَيْنَا الْعِزَّةَ بِغَيْرِهِ؛ أَذَلَّنَا اللهُ﴾ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے اسلام ہی سے عزت دی ہے، اگر ہم نے اسلام کے علاوہ کہیں اور عزت ڈھونڈی کہ قعر مذلت میں پڑے۔

آج ہمارا پورا نوجوان طبقہ احساس کمتری میں مبتلا ہے، وہ جس شعبہ میں بھی عزت دار بننا چاہتا ہے؛ وہاں غیروں کی نقالی کو اپنانا ضروری سمجھتا ہے، حالانکہ دوسروں کا طریقہ اگر ڈاڑھی منڈوانا ہے تو ہمارا طریقہ تو ڈاڑھی بڑھانا ہے، اپنے پاؤں صحیح سالم ہوتے ہوئے بیساکھی کون استعمال کرتا ہے؟ آج ہر ملک و مذہب کے ماڈل (MODEL) وقتاً فوقتاً بڑے طمطراق اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ نت نئے فیشن اور اسٹائل (STYLE) لانچ (LAUNCH) کرتے ہیں، تو ہم نے بھی کبھی جرأت وہمت کے ساتھ اپنی کوئی اسٹائل لانچ کیوں نہیں کی؟ کیا ہمارے کسی طریقہ میں نعوذ باللہ کوئی خرابی یا کمی یا برائی ہے؟ ہرگز نہیں۔ لیکن ہاں! ہم میں خود اعتمادی نہیں، ہم احساس کمتری کا شکار ہیں۔

آج شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ پوری ہمت و پامردی کے ساتھ ہدایاتِ اسلامیہ اور تعلیماتِ نبویہ کو اپنا کر سنتوں کا ایسا اسٹائل بھرے سماج میں لانچ کرے کہ جس کی نورانیت سے پورا معاشرہ جگمگا اٹھے، جنرل نالج کے طور پر اسلام کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کر کے بصیرت پیدا کرے، علمی و عملی اعتبار سے مضبوط بن کر تعلیماتِ اسلامیہ میں حرف گیری کرنے والوں کو ایسا دنداں شکن جواب دے کہ وہ اسلام اس کی اعلیٰ تعلیمات کی

بالادستی ماننے پر مجبور ہوجائیں۔

''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کا یہ سلسلہ بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہے، اس کتاب کا مطالعہ ان شاء اللہ تعالیٰ اسلام کے براہ راست سمجھنے کے لئے بہترین پلیٹ فارم ثابت ہوسکتا ہے، اسے غور سے پڑھئے اور ہر پہلو کو بخوبی سمجھئے، اس کی شفافیت (પારદર્શિકતા) کو دیکھئے، کوئی بھی پہلو ڈھکا چھپا اور گول مول نہیں ہے، سیدھی سادی باتیں ہیں، کوئی اینچ ہے نہ پیچ، کیونکہ مذہب اسلام فطری مذہب ہے ﴿فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا﴾

کسی موضوع پر ٹھوس مطالعہ کرنے سے انسان کو بصیرت حاصل ہوتی ہے، جب بصیرت حاصل ہوتی ہے تو خوداعتمادی پیدا ہوتی ہے اور خوداعتمادی ہی اثر انداز ہوتی ہے۔ خوداعتماد شخص دوسروں کو متأثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا، بقول حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ: ''تم دنیا کے اسٹیج کے ایکٹر نہیں ہو، تم تو دنیا کی تعمیر کے فیکٹر ہو۔'' (الفرقان جولائی ۲۰۰۷ء صفحہ ۱۲)

آج تو ہمارا نوجوان ایکٹر ہی نہیں ہے بلکہ ایکٹروں کا خوشہ چیں اور خاکپائے فاسقاں بننے میں فخر محسوس کرتا ہے، بس! فلاں خان کی ایک جھلک نصیب ہوجائے، اور فلاں کپور کا سایہ پڑ جائے، اس کے جیسے بال ہوجائیں، اور اس کے جیسے کپڑے اور چشمے پہن لوں:-

؎ کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا

نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم   نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

اس جلد کے موضوعات (Chapters) یہ ہیں:-

﴿۱﴾ اَلحَثُّ عَلٰی الأزْدِیَادِمِنَ الْخَیْرِفِیْ أَوَاخِرِالْعُمُرِ
اخیر عمر میں نیکیوں کی کثرت

﴿۲﴾ کَثْرَۃُطُرُقِ الْخَیْرِ
نیکی کے راستے بہت ہیں

﴿۳﴾ الاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ
عبادات میں درمیانی راہ

﴿۴﴾ الْمُحَافَظَۃُ عَلیٰ الْأَعْمَالِ
اعمال کی پابندی

﴿۵﴾ الْمُحَافَظَۃُ عَلیٰ السُّنَّةِ
سنتوں کا اہتمام

﴿۶﴾ وُجُوْبُ الِانْقِیَادِلِحُکْمِ اللہِ تَعَالٰی
حکم الٰہی کی تابعداری

﴿۷﴾ اَلنَّھْیُ عَنِ الْبِدَعِ
بدعات سے ممانعت

﴿۸﴾ مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْسَیِّئَةً
کسی نیک یا برے عمل کی بنیاد ڈالنا

﴿۹﴾ اَلدَّلَالَۃُعَلٰی خَیْرٍ
بھلائی کی طرف رہنمائی

﴿۱۰﴾ التَّعَاوُنُ عَلیٰ الْبِرِّوَالتَّقْوٰی
نیکی اور تقویٰ میں مدد و تعاون

﴿۱۱﴾ النَّصِیْحَةُ
خیر خواہی اور بھلائی

﴿۱۲﴾ الأَمْرُبِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّھْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ
بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا

﴿۱۳﴾ قول اور عمل میں تضاد پر سخت سزا

﴿۱﴾ اخیر عمر میں نیکیوں کی کثرت:- امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے تحت ایک آیت کریمہ اور پانچ احادیث مبارکہ جمع فرمائی ہیں، آیت کریمہ دیکھنے کو ایک ہے لیکن ہزار باتوں پر حاوی ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم نے اس کی تفسیر کا حق ادا فرمادیا ہے، ضمناً علمی فوائد بھی آگئے ہیں، دلچسپ باتیں ہیں، دل کو چھولینے والا مواد ہے۔ عمر کا وہ کونسا مرحلہ ہے

جب انسان پر حجت تام ہوجاتی ہے۔ یہ کہنے کا منہ نہ رہے کہ مجھے وقت نہیں دیا گیا تھا، اس باب کی پہلی حدیث میں اس سوال کا جواب ہے۔ واقعی جو ساٹھ کو پار کر چکے ہیں ان کے لئے غفلت کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کو اخیر عمر میں کیا کرنے کی تاکید کی گئی، اور آنحضور ﷺ نے اس پر کس طرح عمل کیا، اسے اس باب کی دوسری اور تیسری روایت میں صاف کیا گیا ہے، ضمناً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی منقبت حضرت فاروق اعظم کی نگاہ میں مفسر قرآن کی وقعت، سورۂ نصر کی تفسیر وغیرہ علمی فوائد ہیں۔

چوتھی روایت میں بتایا گیا ہے کہ وحی کی اکثریت آنحضور ﷺ کی عمر شریف کے کس مرحلہ میں نازل ہوئی۔ آخری روایت میں سفر آخرت کے لئے ہمہ وقت مستعد اور کمر بستہ رہنے کی طرف لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ نیکی کے راستے بہت ہیں:- اس موضوع کا حاصل یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کسی ایک ہی چیز میں محدود نہیں ہے، بہت سے راستے ہیں جن سے نیکی اور بھلائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس عنوان کے تحت علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن اور احادیث میں سے منتخب کر کے وہ آیات واحادیث پیش فرمادی ہیں؛ جن کو خیر وطاعت بتایا گیا ہے۔

یہ درحقیقت شریعت کی جامعیت اور اس کے کامل ومکمل ہونے کا ایک حصہ ہے کہ خیر کو دو چار چیزوں میں محدود نہیں کر دیا گیا۔ بعض مزاج تنوع پسند ہوتے ہیں، بعض ہرفن مولیٰ بھی ہوتے ہیں جو کسی میدان میں پیچھے رہنا نہیں چاہتے۔ نیز یہ بات بھی ہے کہ خیر کو اگر دو چار چیزوں میں ہی محدود کر دیا جاتا تو بہت سے لوگ وہ ہوتے جو چاہتے ہوئے بھی انہیں انجام نہ دے سکتے، مثلاً صدقہ خیرات، کنواں کھدوانا، بور کروانا وغیرہ، اگر خیر کو انہی چیزوں

میں محدود کر دیا جاتا تو ایک غریب شخص جو خود اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا گزارا ہی بمشکل کر پاتا ہے؛ اس کے لئے خیر کے ان کاموں میں حصہ لینا مشکل ہو جاتا۔ اس لئے شریعت نے بتا دیا کہ راستہ سے کانٹا پتھر وغیرہ تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دینا بھی ایک نیکی ہے، کسی سے ہنس کر مل لینا بھی نیکی ہے، نرمی سے بات کرنا بھی نیکی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس عنوان کے تحت ایک بہت ہی اہم بات یہ ہے کہ جب خیر کے راستے مختلف ٹھہرے تو کسی ایک راستے کو اختیار کرنے والے کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے راستے والے کو غلط سمجھے یا گمراہ کہے اور تنہا خود کو صحیح سمجھے، جیسا کہ آج کل بہت سے لوگوں سے یہ غلطی ہوتی ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم نے اس ذہنیت کی اصلاح کی جانب توجہ دلائی ہے۔

غرض یہ کہ خیر کیلئے شریعت کی طرف سے اتنے سارے راستے اور (Options) دیے گئے کہ ہر طبقہ کا انسان اپنی اپنی سہولت حیثیت اور فرصت کے مطابق خیر میں حصہ لے سکتا ہے، بشرطیکہ خود انسان کو اندر سے شوق و رغبت بھی ہو۔ اگر خود کو ہی شوق و رغبت نہ ہو؛ تو بہانے بنا لینا بہت آسان ہے: ؎

کیسے گلے رقیب کے، کیا طعنِ اقرباء ❁ تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

تو آیئے! مضمون کو پڑھیں اور معلوم کریں کہ وہ کون کون سے کام ہیں؛ جو خیر ہیں اور ہم ان میں سے کن کن کو انجام دے سکتے ہیں۔

﴿۳﴾ عبادات میں درمیانی راہ:- طاعات کے معاملہ میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لینا یعنی عبادات کو انجام دینے کے معاملہ میں نہ اتنی سستی دکھانا کہ سرے سے عبادت ہی حذف کر دی، اور نہ اتنا غلو ہو کہ چند ہی دنوں میں آدمی تھک جائے اور اکتا کر ایسا چھوڑ

بیٹھے کہ فرائض کا بھی خیال نہ رہے۔

شریعتِ اسلامی اپنا ایک مخصوص مزاج ومذاق رکھتی ہے جو وہ اپنے متبعین میں دیکھنا چاہتی ہے، اس مزاج ومذاق کا ایک پہلو طاعات وعبادات میں اعتدال کا ہے، شریعت کے اسی مخصوص مزاج کو اجاگر کرنے کے لئے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب (ألاقتصادُ فی الطاعۃ) قائم فرمایا ہے، اور متعلقہ آیات ونبوی ارشادات (علیٰ صاحبھا الف الف تحیات) پیش فرمائے ہیں۔

قرآنِ کریم یہود ونصاریٰ کو ایک نہیں، دو دو جگہ خطاب کرکے فرماتا ہے: کہ تم اپنے دین کے معاملہ میں (بھی) غلو مت کرو۔ (سورۂ نساء آیت نمبر ۱۷۱، سورۂ مائدہ آیت نمبر ۷۷) سوچنے والی بات ہے کہ دین کے معاملہ میں غلو کی اجازت نہیں؛ تو پھر کسی اور چیز میں کہاں سوال رہ جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مزاج اندھا دھندی والا نہیں ہے کہ آؤ دیکھا، نہ تاؤ؛ بس کیے ہی جاؤ! بلکہ اسلام اعتدال پسند اور اعتدال طلب دستور العمل ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ جوشیلا، غالی اور اندھا دھند آدمی معاشرہ کے سامنے شریعت کی شکل وصورت کو بگاڑ کر پیش کرتا ہے، جو سرسری سوچ رکھنے والوں کو دین سے متنفر کرتا ہے، ایسے شخص کو لوگ باوجود متشرع ہونے کے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

کسی رسالہ میں ایک قصہ پڑھنا یاد ہے کہ ایک عیسائی کسی عابد سے متأثر ہوکر مسلمان ہوگیا۔ عابد اُسے فجر کی نماز کے لئے اپنے ساتھ لے گیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد حسبِ عادت خود بھی اوراد وتسبیحات وغیرہ میں مشغول رہا اور اسے بھی اسی طرح مشغول رکھا، ظہر سے فارغ ہوکر طویل نفلوں کے بعد کھانے گئے، عصر سے عشاء تک پھر وہی مصلّٰی اور تسبیح، عشاء کے بعد طویل نفلوں کے بعد گھر گئے، ابھی اچھی طرح آرام بھی نہ کر پایا تھا کہ تہجد

کے لئے جگادیا گیا، دوسرا دن بھی اسی طرح گذرا، اس کا نتیجہ جو آنا تھا؛ وہ ظاہر ہے۔ تیسرے ہی دن عیسائی نے عابد سے معذرت کرلی کہ اس سے تو میرا پہلا مذہب ہی بہتر ہے، اس طرح ایک نادان کی وجہ سے وہ ایمان کی دولت سے محروم ہوگیا۔

ضرورت ہے شریعت کے اس مزاج کو اچھی طرح سمجھنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی۔ آج کل ہمارے معاشرے میں اگرایک بڑی جماعت ان غافلین کی ہے جو فرائض تک کے اہتمام کے روادار نہیں، دنیا بھر کی غفلتوں اور معاصی کا شکار ہیں؛ تو ان نادانوں کی بھی کمی نہیں؛ جو مزاجِ شرع کو سمجھے بغیر شریعت کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں۔

﴿۴﴾ اعمال کی پابندی:- فرائض کے علاوہ اللہ رب العزت کا قرب حاصل کرنے کے لئے بندہ جن نوافل کو اپناتا ہے اگر ان نوافل کا فائدہ صحیح معنیٰ میں حاصل کرنا چاہتا ہے تو ان کو پابندی کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک جگہ حضور اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ فرائض سے زیادہ کسی اور راستہ سے میری نزدیکی اور قرب حاصل نہیں کرسکتا، اور فرائض کی ادائیگی کے بعد قرب کے اعلیٰ مراتب حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا راستہ نوافل ہیں، جن کو ہماری عام زبان میں معمولات کہا جاتا ہے۔ جب ان نوافل کا اہتمام کرتا ہے تو حالت یہ ہوجاتی ہے کہ بندہ خدا سے قریب سے قریب تر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا اس کا کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے، وہی اس کی آنکھ اور ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا اور پکڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی چیز سنتا نہیں، دیکھتا نہیں اور پکڑتا نہیں۔ یہ کیفیت معمولات کی پابندی کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

اب چاہے یہ معمولات انسان نے اپنے طور پر خود پسند کیے ہوں یا کسی شیخ و مرشد

نے اس کے لئے تجویز کئے ہوں، اگر آدمی ان پر پابندی کرے گا؛ تب ہی جا کر تعلق مع اللہ اورقرب میں ترقی ہوگی، دنیا سے بے رغبتی آئے گی، آخرت کا شوق پیدا ہوگا، دنیا کی امیدیں آرزوئیں (Future Planning) مختصر سے مختصر تر ہوں گی، موت کا ڈر دل سے نکلے گا، اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شوق پیدا ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر راضی رہنے کی توفیق نصیب ہوگی، اخلاص اور (purity) میں اضافہ ہوگا، ریا اور دکھاوے کے جذبہ سے دوری ہوگی، خدا تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ مضبوط ہوگا۔ پھر نماز میں بھی دل لگتا ہے، تلاوت میں مزہ آنے لگتا ہے، ذکر میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے، قلب پر رقت طاری ہوتی ہے، تب "قُرَّةُ عَيۡنِىۡ فِى الصَّلٰوةِ" (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) کی صحیح تفسیر سمجھ میں آتی ہے۔ کیونکہ خود اس انسان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہی نماز ہوجاتی ہے اور غنائے قلب حاصل ہوگا، یعنی روزی روٹی کے غیر ضروری ٹینشن سے چھٹکارا ملے گا، ان کے علاوہ وہ تمام ثمرات وبرکات حاصل ہوں گے؛ جو صرف پابندیٔ معمولات کی بدولت ہی ملا کرتے ہے، جبکہ پابندی نہ کرنے والے کے لئے کسی بھی وقت طرح طرح کی آزمائشوں سے دوچار ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین۔

عموماً ہوتا یہ ہے کہ آدمی دیکھا دیکھی یا جوشِ عقیدت میں یا کسی کی تشکیل پر کسی مرشد کے دستِ حق پرست پر بیعت تو ہوجاتا ہے لیکن اس بیعت کا نتیجہ (Result) ایک رسم اور رواداری سے زیادہ کچھ نہیں آتا، کیونکہ اس مرشد کامل کی طرف سے جن ہدایات ومعمولات کا اسے مکلّف بنایا جاتا ہے؛ وہ انہیں کما حقہٗ عمل میں نہیں لاتا، غیر ضروری چیزوں کی طرف توجہ زیادہ ہوتی ہے، یعنی شیخ کے پاس کثرت سے آمد ورفت، ان کی نزدیکی حاصل کرنے کا

شوق، ان کے کام انجام دینے میں پیش پیش رہنا وغیرہ۔ لیکن اس سے اگر یہ پوچھا جائے کہ آپ کو جو ہدایات دی گئی تھیں اور جو معمولات بتائے گئے تھے؛ ان کا کیا حال ہے؟ تو جواب صفر ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ تو اس کو یہ بھی یاد نہیں ہوتا کہ کونسے معمولات بتائے گئے تھے، کیونکہ کبھی ان معمولات کو ادا کرنے کی نوبت ہی جو نہیں آئی۔ اگر کوئی معمولات و ہدایات پر عمل کرنے والا مل جاتا ہے تو وہ پابندی کی دولت سے محروم ہوتا ہے۔

یہاں ''پابندی'' کی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ویسے یہ کوئی ایسا لفظ نہیں جس کی توضیح کی ضرورت ہو، لیکن معلوم نہیں کیوں جب یہ لفظ معمولات کے ساتھ لگتا ہے تو لوگ اس آسان سے لفظ کا مطلب بھی بھول جاتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک دو بار کر لینے کو ''پابندی'' نہیں کہتے اور دس میں سے دو تین کی پابندی کو معمولات کی پابندی تو نہیں کہا جائے گا، جو پابندی صبح کے چائے ناشتہ کی ہے، دو وقت کھانے کی ہے، اتوار کی تفریح کی ہے، شبینہ (رات کی) مجلسوں کی ہے؛ وہ پابندی معمولات میں آئے تب کہا جائے گا کہ معمولات کی پابندی ہو رہی ہے اور یہی پابندی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ''ترقی کا زینہ'' ہے۔ انسان کو شروع ہی میں تھوڑی توجہ اور ہمت سے کام لینا پڑتا ہے، بعد میں تو یہ چیزیں حقیقی غذا بن جاتی ہیں، جن کو ادا کیے بغیر آدمی ایک نوع کی بے چینی محسوس کرتا ہے۔

حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مولانا احتشام الحسن صاحب کے حوالے سے یہ واقعہ سناتے تھے کہ مولانا احمد شاہ صاحب نے ایک بار مجھ سے فرمایا: بھائی مولوی احتشام! مجھے کلکتہ جانا ہے، ایک صاحب نے بلایا ہے، وہ ایک مکان تعمیر کرنا چاہتے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ اس کی بنیاد میں رکھوں، میری خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ چلو،

تمہارے ہاتھ سے بنیاد رکھوادوں گا۔مَیں نے کہا: اچھی بات ہے۔سفر شروع کرنے سے پہلے فرمایا: بھائی مولوی احتشام! تم امیر سفر ہو گے۔کلکتہ پہنچ کر شاہ صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی، دست پر دست آنے لگے۔ وہ ہمیشہ باوضو رہنے کے عادی تھے، رات کو اٹھتے، قضائے حاجت کے بعد وضو کرتے، کئی مرتبہ ایسا ہوا۔مولانا احتشام صاحب نے فرمایا: حضرت! آپ نے مجھے امیر بنایا ہے، آپ کا بنایا ہوا امیر آپ کی خدمت میں درخواست کرتا ہے کہ آج آپ تہجد کے لئے نہیں اٹھیں گے۔ یہ سن کر بالکل خاموش ہو گئے، نہ ہاں کہی نہ نہیں، جیسے گہری سوچ میں پڑ گئے ہوں۔ پھر جب صبح صادق ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ رہ گیا تو اس وقت مولانا احتشام صاحب کا انگوٹھا پکڑ کر ہلایا، وہ بیدار ہوئے تو دیکھا کہ شاہ صاحب بے تحاشا رو رہے ہیں۔ پوچھا: حضرت کیا بات ہے؟ فرمایا کہ ستاون (۵۷) برس ہوئے مَیں نے حضرت گنگوہیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اس وقت سے اب تک کبھی تہجد قضا نہیں ہوئی، تم نے منع کر دیا، تم امیر ہو، مَیں حضرت گنگوہی کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے اجازت دے دو۔ پس مولانا احتشام صاحب نے فرمایا: حضرت! آپ کو اجازت ہے، جس طرح آپ چاہیں کریں۔ (ملفوظات فقیہ الامت قسط۳، ص۶۷) یہ ہے پابندی اور یہ ہے اس کی برکت۔

﴿۵﴾ **سنتوں کا اہتمام:**- انسان روزمرہ کی زندگی کسی نہ کسی طرح تو گزارتا ہی ہے، کھانا ہے تو کسی نہ کسی طریقہ سے تو کھائے گا ہی، پینا ہے تو کسی نہ کسی طرح تو پیئے گا ہی، شادی بیاہ ہے، موت میت ہے، معاشرہ اور سماج میں رہنا ہے، نماز وغیرہ عبادات انجام دینی ہیں، لین دین کرنا ہے، ماں باپ، بیوی بچوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوست احباب کے ساتھ سلوک کرنا ہی ہے، خوشی اور غمی کے مواقع بھی پیش آنے ہیں، غرض کہ ولادت سے لے کر

وفات تک کے ہر چھوٹے بڑے مرحلہ کو کسی نہ کسی سانچہ میں تو ڈھالنا ہی ہے۔ایک ایمان والے کے ایمان کا اور حضور اکرم ﷺ سے محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے لئے سنت والے سانچہ کو پسند کرے،اور اپنی پوری زندگی اس سانچہ میں ڈھال دے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے،آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنا کام کرے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور میری سنتوں کا لحاظ کرے؛اس کی مثال اُمِ موسیٰ کی سی ہے کہ اپنے ہی بچے کو دودھ پلائے اور اجرت بھی لے۔(تفسیر ابن کثیر اردو،پ۲۰۔۴/۲۰)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والدِ ماجد حضرت اقدس مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:سنت کے مطابق استنجاء کرنا خلافِ سنت دو رکعت پڑھنے سے افضل ہے۔

ایمان والے بندہ کو اس کے فضائل وفوائد سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ محبت والا آدمی فائدے نہیں ڈھونڈا کرتا، اس کو تو ویسے ہی نقالی میں مزہ آتا ہے،دنیا و مافیہا سے بے پرواہ ہو جاتا ہے،کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔

اس پرفتن دور میں جس تیز رفتاری سے مسلمان سنتوں سے تغافل برت کر غیروں کے طریقوں کی طرف جارہے ہیں، خاص کر نوجوان طبقہ؛ یہ بڑے ہی دکھ اور افسوس کی بات ہے۔اتنی اتنی ذلتیں اٹھانے کے بعد اور وقتاً فوقتاً کے جانی و مالی نقصانات برداشت کرنے کے بعد بھی بیداری نہ آنا؛ یہ اچھی علامت نہیں ہے۔آپ ﷺ کی سنتوں کو اپنا کر ہی ہم فتنوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں اگر آپ ﷺ کی نہیں مانی،اور مخالفت والے طرز پر ہی جمے رہے،تو دنیا میں آزمائشوں میں مبتلا ہونا یقینی ہے،اور آخرت میں دردناک عذاب انتظار کررہا ہے۔قرآن

کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهٖ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ اللّٰهم احفظنا منه۔

ہم لوگوں کے لئے بڑے شرم کی بات یہ ہے کہ وہ یہود ونصاریٰ جن کی نقالی کے جنون میں سنتوں سے (قال سے نہ سہی، حال ہی سے) اظہارِ نفرت کی، آج وہی لوگ روزانہ کی تحقیقات (Researches) سے ہمیں حضور پاک ومطہر ﷺ کے بابرکت طریقوں کی طرف متوجہ کررہے ہیں، جن کی تفصیلات اور نمونے آئے دن اخبارات، مجلّات اور کتابوں میں مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور دینی مجالس میں ہم سنتے رہتے ہیں۔ اگر اس طرح بھی سنتوں پرعمل کی نیت سے متوجہ ہوجائیں تو شاید غنیمت کہا جاسکے۔

﴿٦﴾ **حکم الٰہی کی تابعداری:-** جب کسی ایمان والے کوکسی معاملہ میں حکم الٰہی بتایا جائے یا اسے کسی بھلی بات کے کرنے کو یا بری بات سے بچنے کو کہا جائے تو اس کا کیا فرض ہے؟ اس عنوان کے تحت آیات وروایات لاکر اسی بات کوواضح کیا گیا ہے۔ مؤمن کے اندر ماننے والی صفت پیدا ہوجائے تو بندہ انمول ہوجاتا ہے۔ علم اور معلومات کی بہتات کے اس دور میں ایسے بندے بہت کم نظر آتے ہیں جنہیں حکم شرع بتایا جائے اور وہ اسے بے چون وچرا قبول کرلیں۔ احکام شرع کی علتیں پوچھتے پھرنے کا ایک عام مزاج بن گیا ہے۔ حضرت اقدس دام مجدہم نے اس کی قباحت وکراہت پر مدلل بحث فرمائی ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک بہترین تفسیری نکتہ بھی اس عنوان کے ذیل میں قارئین کے لئے دلچسپی کی چیز ہے۔

اس عنوان کے تحت جو روایت ہے اس میں حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک کے ایک

خاص قصہ کا ذکر ہے کہ صحابہ کرام ایک آیت کریمہ کے نزول پر متفکر ہوئے اور اپنی الجھن بارگاہ نبوی میں پیش کی تو حضور اکرم ﷺ نے اپنے جاں نثاروں کی کیسے تربیت فرمائی اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا صلہ ملا۔

ضمنی فوائد میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سعادت مندی واطاعت شعاری اور حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی تسلیم ورضا کے عبرت آموز واقعات ہیں۔

﴿۷﴾ **بدعات سے ممانعت:-** بدعت کیا ہے، اور اس کی شناعت کتنی ہے؟ محدثانہ وفقیہانہ شان سے اس عنوان پر بے غبار بحث کی گئی ہے۔ بدعات ورسومات کے فرق کو جس باریک بینی سے واضح فرمایا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آیات وروایات کی تشریح کی گئی ہے۔ ایصال ثواب میں ہونے والی غلطیوں پر تنبیہ کی گئی ہے۔ تیجہ، چالیسہ اور برسی وغیرہ کی شرعی حیثیت بتائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر علمی فوائد موجود ہیں۔

﴿۸﴾ **کسی نیک یا برے عمل کی بنیاد ڈالنا:-** کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کوئی کام کرتا ہے اور اس کام کی بنیاد پڑ جاتی ہے، اور اس کو خیال بھی نہیں ہوتا۔ اب اگر اس نے کوئی اچھا کام تھا تو پھر تو کیا کہنے۔ اور اگر کوئی برا کام تھا تو پھر خیر نہیں۔ اس عنوان کے تحت امام نووی ؒ نے آیات واحادیث کو پیش فرما کر اپنے دعویٰ کو ثابت فرمایا ہے، بعض روایات میں قولاً یہ بات کہی گئی ہے، اور بعض میں اس کا عملی ثبوت مہیا کیا گیا ہے۔

ضمنی فوائد میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی قابل دید ہیں۔ ہابیل اور قابیل کا قصہ اس مناسبت سے آ گیا ہے کہ دنیا میں قتل ناحق کی بنیاد ڈالنے والا قابیل ہے۔

﴿۹﴾ بھلائی کی طرف رہنمائی:- یہ شریعت کا بہت اہم شعبہ ہے، اس کی اہمیت اور اصول وشرائط اجاگر کرنے کے لئے حضرت مصنف نے متعلقہ آیات وروایات جمع فرمائی ہیں داعی کے لئے حکمت اور موعظۂ حسنہ کی ضرورت پر حضرت دامت برکاتہم نے خاص زور دیا ہے کہ اس کے فقدان سے دعوت ونصیحت کا الٹا اثر ہونے کے امکانات ہیں۔

فتح خیبر کے موقعہ پر حضور اکرم ﷺ کے اعلان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک منقبت لوگوں کے سامنے آئی۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دعوت کی فضیلت ارشاد فرمائی۔

﴿۱۰﴾ نیکی اور تقویٰ میں مدد وتعاون:- نیکی وبھلائی دنیا کے اندر پھیلے اور اس کو ترقی ہو، بدی وبُرائی ختم ہو اور اس کی جڑ کٹے، اس لئے شریعت نے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے تعاون کا حکم دیا ہے۔ شریعت کی یہ بہت ہی اہم تعلیم ہے

عصبیت کیا ہے؟ یہ آپ کو اس مضمون کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو آیات وروایات پیش فرمائی ہیں حضرت دامت برکاتہم نے ان پر مفصل کلام کیا ہے۔ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے مثال طرز عمل کا ایک واقعہ پڑھئے اور عبرت حاصل کیجئے۔ ضمن میں اور بھی بہت سارے مفید ترین مضامین آئے ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں جیسے امامت کا مفہوم، سورۂ عصر کی مختصر لیکن اہم تفسیر وغیرہ۔

اللہ کے راستے میں جانے والے کسی آدمی کو اس کے سفر کا سامان فراہم کرنے کی فضیلت کیا ہے وہ حضرت ابو عبد الرحمٰن زید بن حارث جہنی رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوگی۔

دوطرفہ سلپنگ پارٹنرشپ (Sleeping Partner ship) کا بہترین طریقہ معلوم کرنا ہو تو اس عنوان کے تحت آنے والی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت

ضرور مطالعہ کریں۔اوراس سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ روزی کس کی برکت سے ملتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ والی روایت سے اپنے نابالغ بچہ کوحج کرانے کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ والی روایت سے سبق ملتاہے کہ خزانچی (Treasurer) میں کون کون سے اوصاف مطلوب ہیں۔

﴿۱۱﴾ خیرخواہی اور بھلائی:- معاشرت میں اس وصف کی بہت ہی زیادہ اہمیت ہے،اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقہ سے اس کی اہمیت بیان فرمائی ہے،کہیں مسلمانوں کے پورے معاشرے کوایک جسم سے تعبیر کیا،اوراس تعبیر سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ کسی دوسرے کی تکلیف کواپنی ہی تکلیف محسوس کرتے ہوئے اس کے ساتھ بھلائی کا سلوک کیا جائے۔انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی قوم بدسلوکی کرتی تھی اوران کی تعلیمات کوٹھکراتے ہوئے ان کو برا بھلا کہتی تھیں لیکن وہ حضرات اس کے جواب میں یہی کہتے تھے ﴿أَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴾

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی روایت پیش فرمائی جس سے نصیحت کا عموم پتہ چلتاہے۔

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوگا کہ بیعت کے وقت کئے جانے والے عہدو پیمان پرکس طرح عمل کیا جانا چاہیے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث سے پتہ چلے گا کہ ہرمؤمن کواپنے مؤمن بھائی کے ساتھ کیسا رشتہ وتعلق ہونا چاہیے۔

﴿۱۲،۱۳﴾ بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا/ قول وعمل میں تضاد پر سخت عتاب:۔

اچھے کاموں کا دوسروں کو حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا ،اور دوسرا موضوع درحقیقت پہلے ہی کا تتمہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان جس اچھے کام کی دوسروں کو ترغیب دے، خود بھی اس پر عمل درآمد ہو، اور جس برائی سے دوسروں کو روکے خود بھی اس سے باز رہے

خیال رہے! یہ نہیں کہا جارہا ہے کہ انسان دوسروں کو کسی نیکی کی دعوت تب ہی دے جب خود بھی اس پر عمل کررہا ہو، اور کسی برائی سے اوروں کو تب ہی روکے جب خود بھی اس سے بچتا ہو۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کی ضرورت اور اہمیت یا اس کی شناعت وقباحت کو خوب سمجھتا ہے، جانتا ہے، لیکن کوئی وجہ ہوتی ہے کہ خود اس کے تقاضہ کے خلاف کرتا ہے۔ سگریٹ اور تمباکو فروش کمپنیاں جہاں بڑے زوروشور سے اپنے مال کی ایڈورٹائیزنگ (Advertising) کرتی ہیں؛ وہیں ایک تنبیہ کرنا بھی کبھی نہیں چوکتیں کہ سگریٹ اور تمباکو نوشی مضرِ صحت ہے۔

یہیں سے وہ غلط فہمی دور ہوجاتی ہے جس کا سامنا عموماً ہمارے معاشرہ میں دینی کام کرنے والوں کو ہوتا ہے کہ خود تو کرتے نہیں اور دوسروں کو کہنے چلے ہیں۔

ہمارے حضرت دامت برکاتہم اکثر فرماتے ہیں کہ شریعت کا مزاج یہ ہے کہ ہر آدمی کو اس کی اپنی ذمہ داری بتاتی ہے، دوسروں کی کیا ذمہ داریاں ہیں وہ اس کو نہیں بتاتی۔ مثال کے طور پر داعی کو یہ تعلیم دی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس اہتمام سے کرو کہ خود بھی اس پر عمل درآمد ہو۔ اور مدعو کو یہ سکھایا کہ کوئی تمہیں اچھی بات بتائے تو اس کو قبول کرلو، یہ نہ دیکھو کہ وہ خود اس پر عمل کررہا ہے یا نہیں؟ لیکن ہم لوگوں کا مزاج مزاجِ شرع کے بالکل برعکس ہے،

ہم خود اپنی ذمہ داری انجام دینے کے بجائے دوسروں کو ان کی ذمہ داریاں بتاتے ہیں۔ میاں اور بیوی میں جھگڑا ہوگا تو شوہر یہ کہے گا کہ بیوی میرے حقوق ادا نہیں کرتی اور بیوی کہے گی کہ شوہر میرے حقوق ادا نہیں کرتا، حالانکہ یہ ان کی ذمہ داری نہیں ہے، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ شریعت نے ان کے ذمہ ایک دوسرے کے جو حقوق رکھے ہیں ان کو ادا کرنے میں لگ جائیں، جب یہ ہوگا تو جھگڑا ہی کہاں رہے گا؟ ہمیں اپنی ذمہ داریاں تو انجام دینی نہیں ہیں، دوسروں کو ان کی ذمہ داریاں بتاتے پھرنا ہے۔ ''یہ درحقیقت نہ کرنے کا بہانہ ہے''۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ نصیحت کی کوئی بات اگر دیوار پر لکھی ہوگی تو کیا آپ دیوار کو یہ کہیں گے کہ خود تو عمل کرتی نہیں، مجھے کیوں کہتی ہے؟ اگر آپ یہ طے کر کے ہی بیٹھے ہیں کہ عمل نہیں کرنا ہے، تو نہ کریں۔ لیکن کہنے والے کو کیوں آڑ بناتے ہیں؟ انسان کا ایسا مزاج دراصل اس کی محرومی کی نشانی ہے۔ اور سالکین کے لئے تو سمِ قاتل ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوگا: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید، فضائل، اہمیت، درجات، نیز اس کام کے شرائط و آداب، حدود و احکام، کرنے کے فوائد اور نہ کرنے کے نقصانات اور آخری حصہ میں قول و عمل میں تضاد پر کیا عتاب ہے، اس کی کیا شناعت و قباحت ہے، کیسی سخت وعیدیں ہیں اور ان سب کے علاوہ بہت سے ضمنی فوائد پڑھنے کو ملیں گے۔ مثلاً بعض صحابہ اور تابعین کے حالات و واقعات۔

محترم ناظرین! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت تو ہر زمانہ میں ہی رہی ہے لیکن فی زمانہ اس کی اہمیت جتنی بڑھ گئی ہے وہ ہر غیرت مند مسلمان سمجھ سکتا ہے۔ آج پرنٹ میڈیا اور الیکٹرک میڈیا کے توسط سے اسلامی احکام و تعلیمات پر کھلے عام بے جا

اعتراضات کئے جارہے ہیں، مضامین لکھے جارہے ہیں، کارٹون بنائے جارہے ہیں، فلمیں بنائی جارہی ہیں، غرضیکہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی جارہی ہے اسلام کی خوبصورت اور حسین ترین تصویر کو بگاڑ کر اور توڑ مروڑ کر پیش کیا جارہا ہے، ایسے مسموم ماحول میں ہم نے اپنی کیا ذمہ داری نبھائی؟ ہم نے اسلام کا اصلی رخ کس کو دکھایا؟

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا تھا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جب اسلام پر قائم رہنا ایسا مشکل ہوجائے گا جیسے ہاتھ میں انگارا پکڑنا۔ بالکل حق اور سچ فرمایا۔ آج کل مسلمان ڈاڑھی منڈانے میں زیادہ عافیت محسوس کرتا ہے، ایمان والی بہن بے پردگی میں زیادہ امن سمجھتی ہے، لباس، کھانے پینے، شادی بیاہ میں اور زندگی کے کسی بھی چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم موڑ پر اسلامی طریقہ کو چھوڑنے میں سلامتی اور عزت محسوس کی جاتی ہے کہ نہ اسلامی طور طریقہ اپنائیں اور نہ کوئی اعتراض، لعن طعن و ملامت کرے، اور نہ ہی کوئی مذاق اڑائے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام بے یار و مددگاری کے عالم میں شروع ہوا، آخر میں پھر ایسا ہی ہوجائے گا، سو شاباش ہے (ایسے) بے کسوں کیلئے (جو ایسے ماحول میں بھی اسلام کو نہ چھوڑیں)۔

راقم اپنے مضمون کو یہیں ختم کرتے ہوئے مکرم قارئین سے دعا کی گذارش کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کاوش کو شرف قبولیت عطا فرمائے، استقامت کے ساتھ مزید کی توفیق عطا فرمائے اور اس سلسلہ کے بعافیت جلد از جلد تکمیل تک پہنچنے کی شکلیں غیب سے پیدا فرمائے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم کے سایۂ عاطفت کو دراز تر فرما کر فیوض کو عام و تام فرمائے، اور ہم دور افتادوں کو محرومی سے بچائے۔ ﴿آمین﴾

﴿ابوزاہر﴾

اَلْحَثُّ عَلٰی الازْدِیَادِمِنَ الْخَیْرِ فِیْ أَوَاخِرِ الْعُمُرِ

﴿اخیر عمر میں نیکیوں کی کثرت﴾

﴿اقتباس﴾

زندگی کے آخری ایام میں جب یہ اندازہ ہو کہ دنیا سے جانے کا وقت قریب ہورہا ہے،
ان دنوں میں آدمی کو سارے کاروبار ومشاغل اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی یاد اور
نیکی کے کاموں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔
اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:-
﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾
کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جس میں کوئی آدمی اگر نصیحت حاصل کرنا چاہتا؛
تو نصیحت حاصل کرسکتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا اور
وارننگ دینے والا بھی آیا تھا کہ اس زندگی کو ذرا غنیمت سمجھو اور غفلت میں نہ گذارو۔
حضرت عبداللہ بن عباس اور دوسرے محققین کا قول یہ ہے کہ اتنی عمر سے ساٹھ سال مراد ہے
اور بعض حضرت کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال مراد ہے
بعض حضرات نے چالیس سال کہا ہے
اور یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ مدینہ والوں میں سے جب کسی کی عمر چالیس سال ہوجاتی تھی
تو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ کرلیتے تھے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً أمابعد.

فاعوذباللہ من الشیطان الرجیم،بسم اللہ الرحمٰن الرحیم.

اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَایَتَذَکَّرُفِیْہِ مَنْ تَذَکَّرَوَجَآءَ کُمُ النَّذِیْر

﴿باب کا عنوان﴾

زندگی کے اخیر سالوں میں اور آخری ایام میں زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ ویسے تو آدمی کو چاہیے کہ پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں ہی استعمال کرے۔ چونکہ پوری ہی زندگی کے متعلق سوال ہوگا جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ قیامت کے روز آدمی کے قدم اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے جب تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق سوال نہیں ہوگا (سنن ترمذی حدیث نمبر۲۳۴۱) اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ جب تک چار چیزوں کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔ ان میں سے پہلی چیز ہے ﴿عَنْ عُمُرِہٖ فِیْمَا اَفْنَاہُ﴾ زندگی کو کہاں گنوایا اور خرچ کیا۔

﴿بہت عظیم نعمت﴾

زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بہت عظیم نعمت ہے، ساری نعمتیں اسی نعمت کے اوپر موقوف ہے، اگر زندگی نہ ہوتی تو باقی ساری نعمتیں کہاں حاصل ہوتیں؟ اسی لئے زندگی کی اس

نعمت کی قدر دانی کے متعلق قرآن وحدیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔اور حضور اکرم ﷺ نے جہاں ایک موقع پر یہ فرمایا تھا کہ پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو،اس میں آخری چیز بتلائی تھی ﴿وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ﴾ اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے غنیمت سمجھو

(ترمذی شریف،حدیث نمبر ۲۲۵۵)

﴿جب دنیا سے جانے کا وقت قریب ہو تو......﴾

یہاں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ زندگی کے آخری ایام میں جب یہ اندازہ ہو کہ دنیا سے جانے کا وقت قریب ہو رہا ہے،ان دنوں میں آدمی کو سارے کاروبار ومشاغل اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی یاد اور نیکی کے کاموں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور نبی کریم ﷺ نے احادیثِ مبارکہ میں اسی کی ترغیب دی ہے اور اس کی طرف آمادہ کیا ہے۔یہ باب اسی لئے قائم کیا ہے:﴿اَلْحَثُّ عَلَى الْأَزْدِيَادِ مِنَ الْخَيْرِ فِيْ أَوَاخِرِ الْعُمُرِ﴾ زندگی کے آخری دنوں میں خیر کے کاموں میں زیادہ مشغول ہونے کی ترغیب دی جارہی ہے،اور اس کا شوق دلایا جارہا ہے۔

﴿اتنی عمر نہیں دی تھی﴾

قرآنِ پاک کی یہ آیت پیش کی ہے:﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾ جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جس میں کوئی آدمی اگر نصیحت حاصل کرنا چاہتا؛تو نصیحت حاصل کرسکتا تھا۔سُدھرنا چاہتا تو سُدھر سکتا تھا،اپنے حالات کو درست کرنا چاہتا؛تو کرسکتا تھا۔اتنی عمر دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا بھی آیا تھا،وارننگ دینے والا اور بتانے والا بھی آیا تھا کہ اس کو ذرا غنیمت سمجھو اور غفلت میں نہ گذارو۔

﴿اتنی عمر سے کتنی عمر مراد ہے؟﴾

اس آیت کے سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات محققین کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ اتنی عمر سے کتنی عمر مراد ہے؟ باری تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی؟ اس سلسلے میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور دوسرے محققین کا قول یہ ہے کہ ساٹھ سال مراد ہے یعنی ہم نے تم کو ساٹھ سال کی عمر نہیں دی تھی؟ ساٹھ سال کی عمر گویا اتنی ہے کہ اس میں آدمی بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے۔

چنانچہ صاحبِ کتاب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن عباس کی رائے نقل کرنے کے بعد یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ہم نے اس باب میں نمبر اول پر ذکر کی ہے۔

﴿جس کو ساٹھ سال کی عمر ملی﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت آنے والی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
﴿أَعْذَرَ اللّٰهُ اِلیٰ امْرِیءٍ أَخَّرَ أَجَلَهُ حَتّٰى بَلَغَ سِتِّيْنَ سَنَةً﴾ اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کا عذر ختم کر دیا جس کی موت کو مؤخر کیا یہاں تک کہ ساٹھ سال کی عمر پالی۔ یعنی جس کو ساٹھ سال تک دنیا میں رہنے کا موقعہ ملا، قیامت کے روز اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی عذر کرنے کا موقعہ نہیں رہے گا۔ جیسے دنیا میں بھی ہوتا ہے، کسی ماتحت کو کوئی کام سونپا جاتا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ ذرا موقعہ دیجیے تو مَیں یہ کام کرلوں، مجھے مہلت دی جائے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے آدمی کو حکم دیا ہے کہ اطاعت وفرمانبرداری کرے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے۔ تو جنہوں نے

اپنی زندگی گنوادی ہے، وہ قیامت کے روز اللہ کے حضور معذرت کرتے ہوئے یہ عذر پیش کریں گے کہ باری تعالیٰ! ہمیں موقعہ دیا جاتا تو ہم کچھ کرکے لاتے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کو ساٹھ سال زندہ رہنے کا موقعہ ملا، اس کو کل قیامت کے روز یہ کہنے کا منہ نہیں رہے گا کہ مجھے کچھ موقعہ دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ساٹھ سال تو دیئے تھے، اتنا زندہ رہا لیکن اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کیا، اپنی اصلاح نہیں کی، اپنی حالت درست نہیں کی، نصیحت حاصل نہیں کی، دینداری اختیار نہیں کی، اب کتنی زندگی دی جاتی جس میں تو سُدھرتا؟ یہ تو تیرا بہانہ ہے۔ جیسے کسی کو پڑھنے لکھنے کا موقعہ دیا جائے، پھر امتحان لیا جائے اور وہ کہے کہ مجھے ذرا موقعہ دیا جائے، تو اس کو کیا کہیں گے؟ اتنا زمانہ تو دیا تھا، اس کے بعد تجھے کیا چاہیے؟ ایسے ہی یہاں پر بھی ہے۔

اور بعض حضرت کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال مراد ہے۔ یعنی اٹھارہ سال کا کسی کو موقعہ مل جاوے، تو گویا اس کو اتنا موقعہ ملا ہے کہ وہ اپنے آپ کو درست کرسکتا ہے۔

اہلِ مدینہ کا معمول

بعض حضرات نے چالیس سال کہا ہے۔ چنانچہ حسن بصری، کلبی، مسروق وغیرہ حضرات فرماتے ہیں: جس کو چالیس سال زندہ رہنے کا موقعہ ملا، گویا اس کو دنیا میں اتنی عمر ملی ہے کہ وہ اپنے احوال درست کرسکتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی دوسرا قول اسی طرح کا منقول ہے۔

اور یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ مدینہ والوں میں سے جب کسی کی عمر چالیس سال ہوجاتی تھی تو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ کرلیتے تھے۔ یعنی چالیس سال عمر

پہنچنے کے بعد سارا کاروبار چھوڑ چھاڑ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگ جاتے تھے۔

بعض حضرات یوں کہتے تھے کہ یہی (۴۰؍سال) بلوغ کا زمانہ ہے۔ یعنی روحانی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لحاظ سے یہ بلوغ کا وقت ہے۔

اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ اہلِ مدینہ کی جب چالیس سال کی عمر ہوجاتی تھی تو بستر لپیٹ کر رکھ دیتے تھے کہ اب سونے کے دن گئے، اب تو محنت کا وقت آ گیا ہے۔ اسی بات کی طرف متوجہ کرنے کیلئے یہ باب قائم کیا جارہا ہے کہ آدمی کی عمر کا ایک معتد بہ حصہ گذر جائے، اس کے بعد تو اس کو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ کر ہی لینا چاہیے۔

ملک الموت سے مکالمہ

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ہے "التذکرۃ فی أحوال الموتیٰ والآخرۃ" اس میں انہوں نے علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "روضۃ المشتاق" کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے یہ واقعہ اپنے خطبات کے اندر ذکر کیا ہے کہ حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ کسی نے ملک الموت سے یوں کہا کہ دنیا کی حکومتوں کا دستور ہے کہ کسی کے نام جب وارنٹ جاری کیا جاتا ہے، تو پہلے اس کو نوٹس دی جاتی ہے، اس کو آگاہ کیا جاتا ہے، جب دو تین نوٹس کے بعد بھی وہ توجہ نہیں کرتا تو پھر اس کے نام سرچ وارنٹ جاری کرتے ہیں کہ اس کو فوری طور پر گرفتار کر کے لایا جائے۔ لیکن آپ کا دستور تو عجیب ہے کہ آپ تو بس آدھمکتے ہیں اور روح قبض کر کے چلے جاتے ہیں۔ ملک الموت نے کہا کہ مَیں اتنے نوٹس

بھیجتا ہوں کہ دنیا کی کوئی حکومت اتنے نوٹس نہیں بھیجتی ہوگی۔ پوچھا: آپ کے نوٹس کیا ہیں؟ ملک الموت نے فرمایا: بالوں کا سفید ہوجانا؛ یہ میرا نوٹس ہے۔ بیماریاں اور امراض؛ یہ میرے نوٹس ہیں۔ شنوائی کی صلاحیت کا کمزور ہوجانا؛ یہ میرا نوٹس ہے کہ اب جانے کا وقت آرہا ہے بصارت کا کمزور ہوجانا؛ یہ میرا نوٹس ہے۔ گھٹنوں میں درد شروع ہوگیا؛ یہ میرا نوٹس ہے۔ اولاد کی اولاد ہوگئی؛ یہ بھی میرا نوٹس ہے۔ مَیں تو اتنے نوٹس بھیجتا ہوں کہ دنیا کی کوئی حکومت اتنے نوٹس نہیں بھیجتی ہوگی، پھر بھی لوگ میرے نوٹس کا نوٹس نہیں لیتے؛ تو مَیں کیا کروں؟

حضرت مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں: والد صاحب سے یہ قصہ سنا تھا، اس کا مأخذ تو معلوم نہیں ہے۔ لیکن بندہ کو یہ روایت ''التذکرۃ'' میں مل گئی جو علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی اس موضوع میں بڑی معتبر کتاب ہے، اس میں یہ واقعہ دیکھا تو مَیں نے محسوس کیا کہ شاید مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی واقعہ کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہو۔

ملک الموت کے ایلچی

اس میں یہ ہے کہ ایک نبی نے ملک الموت سے کہا: آپ اپنی آمد سے پہلے ایلچی نہیں بھیجتے، تاکہ لوگ تیاری کرلیں؟ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! بہت سارے ایلچی بھیجتا ہوں بیماریاں، بوڑھاپا، غم، فکریں، بینائی کے اندر کمی آجانا، سننے کی صلاحیت میں کمی کا آجانا، یہ سب میرے ایلچی ہیں، میرے مخبر ہیں جو خبر دے رہے ہیں کہ میں آرہا ہوں۔ جب کوئی آدمی ان ساری چیزوں سے بھی اپنے آپ کو نہیں سدھارتا، نصیحت حاصل نہیں کرتا اور توبہ نہیں کرتا؛ تو جب مَیں روح قبض کرنے کے لئے آتا ہوں، اس وقت اس کو یوں کہا کرتا ہوں کہ مَیں نے یکے بعد دیگرے تیرے پاس ایلچی نہیں بھیجے؟ ڈرانے والے نوٹس نہیں بھیجے؟

اب مَیں وہ ایلچی ہوں کہ میرے بعد کوئی ایلچی آنے والا نہیں ہے۔ مَیں ایسا ڈرانے والا ہوں کہ میرے بعد کوئی اور ڈرانے والا نہیں ہے۔ مَیں آخری نوٹس ہوں اور وارنٹ بن کر آیا ہوں

﴿ملک الموت کی روزانہ کی پکار﴾

اور جب بھی کوئی دن طلوع ہوتا ہے، تو ملک الموت آواز دیتا ہے: ﴿یَاأَبْنَآءَ الْاَرْبَعِیْن هٰذَاوَقْتُ أَخْذِالزَّاد﴾ اے چالیس سال کی عمر والو! یہ توشہ تیار کر لینے کا زمانہ ہے ﴿أَذْهَانُكُمْ حَاضِرَةٌ وَّأَعْضَآءُ كُمْ قَوِيَّةٌ شِدَاد﴾ تمہارے ذہن حاضر ہیں، تمہارے اعضاء بڑے مضبوط اور قوی ہیں۔ گویا آخرت کے لئے توشہ حاصل کر سکتے ہو، فائدہ اُٹھالو۔

پھر یہ بھی آواز دیتے ہیں: ﴿یَاأَبْنَآءَ الْخَمْسِیْن ! قَدْ دَنَا وَقْتُ الْأَخْذِ وَالْحَصَادِ﴾ اے پچاس سال کی عمر والو! کھیتی کی کٹائی کا وقت آ چکا ہے، تیاری کرلو۔

اور یہ بھی آواز دیتے ہیں: ﴿یَاأَبْنَآءَ السِّتِّیْن!نَسِیْتُمُ اللِّقَآءَ وَغَفَلْتُمْ عَنْ رَدِّالْجَوَابِ﴾ اے ساٹھ سال کی عمر والو! اللہ تعالیٰ کے عذاب کو بھول گئے، کل کو اللہ کے سامنے جواب دینا ہے، اس کی طرف سے غافل ہو گئے۔ تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اگر تم نے اس کے بعد بھی غفلت برتی تو اب تمہارا کوئی وکیل اور مددگار نہیں ہے۔

اور پھر یہ آیت پڑھتے ہیں: ﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَايَتَذَكَّرُفِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَوَجَآءَ كُمُ النَّذِيْر﴾ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جس میں کوئی آدمی اگر نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر سکتا تھا اور ڈرانے والا بھی بھیجا۔

﴿...... یہ وقت ہم پر بھی آنے والا ہے﴾

ڈرانے کے واسطے تو بہت ساری چیزیں ہیں۔ ہم روزانہ اپنے آس پاس اپنے

دوستوں میں سے، اپنے عزیزوں میں سے، اپنے پڑوسیوں میں سے بہت سے لوگوں کو دُنیا سے جاتا ہوا دیکھتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو غسل دیتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو کفن پہناتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کا جنازہ اُٹھاتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو قبر پر لے جاتے ہیں، جنازے کی نماز پڑھتے ہیں، قبر میں اُتارتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے واپس آتے ہیں۔ یہ سب کرتے ہیں لیکن کبھی ہمیں بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ وقت ہم پر بھی آنے والا ہے۔

روایتوں میں ہے کہ ملک الموت حضرت داؤد علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ کہا: مَیں وہ ہوں جو کسی بادشاہ سے نہیں ڈرا کرتا۔ مَیں وہ ہوں کہ کوئی قلعہ اس کو آنے سے روک نہیں سکتا۔ مَیں وہ ہوں کہ جو کوئی رشوت قبول نہیں کرتا کہ لے دے کر سیٹلمنٹ (Settlement) کر لیا جائے۔ دنیا میں تو بڑے سے بڑے معاملے میں سیٹلمنٹ (Settlement) بھی ہو جاتا ہے۔ اور آج کل تو بہت آسان ہو گیا ہے۔ لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔

تو حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: پھر تو آپ ملک الموت ہیں۔ انہوں نے کہا: جی ہاں! مَیں ملک الموت ہوں۔ کہا: مَیں نے ابھی کوئی تیاری نہیں کی۔ کہا: تمہارا فلاں رشتہ دار کہاں ہے؟ تمہارا فلاں پڑوسی کہاں ہے؟ تمہارا فلاں دوست کہاں ہے؟ کہا: وہ سب مر گئے۔ کہا: بس! ان سب کی موت کے بعد بھی عبرت حاصل نہیں کی اور اپنے لئے تیاری نہیں کی؟

حقیقت تو یہ ہے کہ جو دنیا سے جا رہے ہیں وہ ہمیں متنبہ کر رہے ہیں، ہمارے لئے عبرت کا سامان مہیا کر رہے ہیں کہ ہم تو جا رہے ہیں، آپ کے پاس وقت ہے، آخرت کے

لئے تیاری کر لیجیے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کا اہتمام کریں اور خاص کر عمر کی وہ منزل جس کے بعد عام طور پر یہ مراحل آتے ہیں، اس میں تو آدمی کو تیاری کرنے میں لگ ہی جانا چاہیے۔

﴿حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دربار میں﴾

چنانچہ اس سلسلے میں روایتیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی روایت تو گذر چکی ہے، دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے۔

عن ابن عباس قال: كَانَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ يُدْخِلُنِيْ مَعَ أَشْيَاخِ بَدْرٍ، فَكَأَنَّ بَعْضُهُمْ وَجَدَفِيْ نَفْسِهٖ فَقَالَ: لِمَ يَدْخُلُ هٰذَامَعَنَاوَلَنَاأَبْنَآءٌ مِثْلُهٗ؟ فَقَالَ عُمَر رضی اللہ عنہ: اِنَّهٗ مِنْ حَيْثُ عَلِمْتُم! فَدَعَانِيْ ذَاتَ يَوْمٍ فَأَدْخَلَنِيْ مَعَهُمْ، فَمَارَأَيْتُ أَنَّهٗ دَعَانِيْ يَوْمَئِذٍاِلَّالِيُرِيَهُمْ، قَالَ: مَاتَقُوْلُوْنَ فِيْ قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى ﴿اِذَاجَآءَ نَصْرُاللهِ وَالْفَتْحُ؟﴾ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: أُمِرْنَانَحْمَدُاللهَ وَنَسْتَغْفِرُهٗ اِذَانَصَرَنَاوَفَتَحَ عَلَيْنَا، وَسَكَتَ بَعْضُهُمْ فَلَمْ يَقُلْ شَيْئاً. فَقَالَ لِيْ: أَكَذٰلِكَ تَقُوْلُ يَاابْنَ عَبَّاسٍ؟ فَقُلْتُ: لاَ. قَالَ: فَمَاتَقُوْلُ؟ قُلْتُ: هُوَأَجَلُ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم، أَعْلَمَهٗ لَهٗ قَالَ: ﴿اِذَاجَآءَ نَصْرُاللهِ وَالْفَتْحُ﴾ وَذَالِكَ عَلَامَةُأَجَلِكَ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِرَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾ فَقَالَ عُمَرُ: مَاأَعْلَمُ مِنْهَا اِلَّامَاتَقُوْلُ. (رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے بدر میں شریک ہونے والے حضرات صحابہ کے ساتھ اپنے یہاں حاضری کی دعوت اور موقعہ دیا کرتے تھے۔ بادشاہوں، بڑے لوگوں اور حکام کے یہاں ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق حاضری اور باریابی کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ جیسے فلاں وقت اہلِ علم کی ملاقات کا ہے، فلاں وقت بوڑھوں کی

ملاقات کا ہے، فلاں بچوں کی ملاقات کا ہے۔ بڑوں کے یہاں اس طرح اوقات مقرر ہوتے ہیں، ہر ایک طبقے کے لئے مناسبِ حال وقت رکھا جاتا ہے، اور اس وقت میں دوسروں کو موقعہ نہیں دیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب یہ بڑے بڑے صحابہ کی حاضری کا وقت ہوتا تھا، اُس وقت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بھی - جوان کے بیٹوں کی عمر کے تھے - حاضری کا موقعہ دیا کرتے تھے۔ یہ چیز ان حضرات میں سے بعض کو ناگوار ہوئی کہ ہمارے بیٹے ان کی عمر کے ہیں، یہ ہمارے ساتھ کیوں آیا کرتے ہیں، ان کو دوسرے وقت موقعہ دیا جائے۔ گویا آپ فرقِ مراتب نہیں کرتے۔

﴿فقال عمر رضی اللہ عنہ: اِنَّهٗ مِنْ حَيْثُ عَلِمْتُم﴾ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں وقتی طور پر تو یوں کہا: یہ جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؛ وہ تمہیں معلوم ہے۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، اگرچہ عمر میں آپ جتنے نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے بلایا اور ان حضرات اکابر صحابہ جو اہلِ بدر تھے، ان کے ساتھ مجھے بھی اپنے پاس قریب کیا۔ اس دن جو باتیں ہوئیں اس سے میں سمجھ گیا کہ ان حضرات نے اس روز جو اعتراض کیا تھا، اس کا جواب دینے کے لئے مجھے بلایا ہے۔

﴿نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع﴾

اس روز واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب حضرات کے جمع ہونے کے بعد سوال کیا کہ قرآنِ پاک کی اس سورت ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ کے متعلق کیا رائے ہے؟ جس کا ترجمہ ہے: ”اے نبی! جب اللہ تعالیٰ کی مدد آجائے، اور فتح بھی مل جائے، اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ جماعت در جماعت گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں؛

تو آپ اپنے رب کی ثناء وحمد اور تسبیح بیان کیجیے اور اپنے گناہوں سے معافی مانگئے، استغفار کیجیے؛ یقیناً اللہ تعالیٰ قبول کرنے والا ہے''۔

ان میں سے بعض نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کی مدد ہم تک آوے، اور اللہ تعالیٰ کسی ملک کو ہم سے فتح کرا دیوے، تو اُس وقت ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں اور استغفار کریں۔

بعض حضرات خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سب کا جواب سننے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یوں کہا: اے ابن عباس! آپ بھی یہی کہتے ہیں؟ مَیں نے کہا: نہیں! میرا جواب یہ نہیں ہے۔ کہا: ﴿فَمَا تَقُوْلُ؟﴾ تمہارا جواب کیا ہے؟ ﴿قُلْتُ: هُوَ أَجَلُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ﴾ مَیں نے عرض کیا: اس میں نبی کریم ﷺ کی وفات کی اطلاع دی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا: اے نبی! جب اللہ تعالیٰ کی مدد آ جائے اور دشمن زیر ہو جائیں اور مکہ فتح ہو جائے ﴿ذَالِکَ عَلَامَةُ أَجَلِکَ﴾ یہ آپ کے وفات کے قریب آنے کی علامت ہے، اس لئے آپ اپنے رب کی حمد وثنا بیان کریں اور استغفار کریں، اللہ تعالیٰ قبول کرنے والے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿مَا أَعْلَمُ مِنْهَا اِلَّا مَا تَقُوْلُ﴾ اس سورت کا مطلب مَیں بھی یہی سمجھتا ہوں؛ جو آپ نے کہا۔

بس! یہاں تو اس لئے لائے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نبی کریم ﷺ کے وفات کا وقت قریب آنے کی ایک علامت بیان فرمائی ہے۔ اس کے بعد باری تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم دیا گیا کہ خاص طور پر اللہ کی حمد وثناء اور تسبیح میں لگ جایئے۔ گویا جب آدمی کی موت کا وقت قریب ہو تو اس کو دوسرے سارے کاموں سے ہٹ کٹ کر ان کاموں

میں لگنا چاہیے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد اسی بات کو بتلانا ہے کہ آدمی کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں نیکی کے کام زیادہ کرنے چاہئیں۔

آخری ایام میں آپ ﷺ کا عملِ مبارک

عن عائشۃَ رضی اللہ عنہا قالَتْ: مَاصَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ صَلاۃً بَعْدَأَنْ نَزَلَتْ عَلَیْہِ ﴿اِذَاجَآءَ نَصْرُاللّٰہِ وَالْفَتْحُ﴾ اِلَّایَقُوْلُ فِیْھَا ﴿سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَاوَبِحَمْدِکَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ﴾ (متفق علیہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے۔ اس سے اگلی روایت میں یہ بتلایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ حکم دیا تھا اور اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد۔ کہ جس میں آپ کو جس کام کا حکم دیا تھا اور جس چیز کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے اہتمام سے اس حکم پر عمل شروع کر دیا۔ وہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا تھا، اس سے باب کا عنوان ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اور اس روایت کو پیش کر کے خود حضورِ اکرم ﷺ کا جو عملِ شریف تھا، اس کے ذریعہ سے ان عنوان کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ گویا اس سورت کے نازل ہونے کے بعد حضور اکرم ﷺ نے بھی باقاعدہ اس کا اہتمام شروع کیا کہ جو بھی نماز آپ پڑھتے تھے اس کے رکوع اور سجدے میں آپ یہ تسبیحات یعنی ﴿سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَاوَبِحَمْدِکَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ﴾ پڑھا کرتے تھے۔ گویا جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا تھا آپ نے وہ شروع کر دیا۔ اب ایمان کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ کی اتباع میں اہلِ ایمان بھی زندگی کے آخری مراحل میں ان چیزوں کا اہتمام کریں۔

آخری دنوں میں کثرتِ وحی کی ایک وجہ

عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ تَابَعَ الْوَحْیَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَبْلَ وَفَاتِہٖ، حَتّٰی تُوُفِّیَ أَکْثَرَمَاکَانَ الْوَحْیُ. (متفق علیہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے فرماتے ہیں: اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی وفات سے پہلے آپ پر مسلسل وحی بھیجی، یہاں تک کہ جس وقت آپ ﷺ کی وفات ہوئی اُس وقت شروع کے مقابلے میں بہت کثرت سے وحی نازل ہوئی تھی۔

مطلب یہ ہے کہ پہلی وحی نازل ہوئی تھی: ﴿اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ شروع کی پانچ یا چھ آیتیں نازل ہوئیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا، پھر وحی جاری ہوئی، اس کے بعد بھی یہ ہوتا تھا کہ روزانہ وحی نہیں آتی تھی، لیکن آخری عمر شریف میں وحی برابر کثرت سے نازل ہوتی رہی۔

اس کے مختلف اسباب تھے، ایک سبب یہ بھی تھا کہ شروع میں صرف آخرت، جنت ودوزخ، توحید ورسالت اور عقائد کی درستگی کے متعلق اور اگلی قوموں کے ساتھ باری تعالیٰ کا جو معاملہ رہا؛ انہیں چیزوں کو بیان کیا جاتا تھا۔ گویا ایمان کی پختگی کو ذکر کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب لوگ ایمان لے آئے اور کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو اب احکام کے متعلق وحی آنا شروع ہوئی، اور لوگوں کی طرف سے کئے جانے والے سوالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل کی جاتی تھی۔ گویا بعد میں وحی کی کثرت ہوجانے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ لیکن یہاں تو اس روایت کو اس لئے پیش کیا کہ وحی کا آنا یہ بھی امت کے لئے ذریعۂ خیر ہے، اور نبی کریم ﷺ کی عمر شریف کے آخری سالوں اور دنوں کے مقابلہ میں وحی کثرت سے آئی۔ گویا یہ خبر لانے والا سلسلہ پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا، اور آخری عمر شریف میں بھلائی کی چیزوں میں اضافہ ہوا۔ اس سے عنوان ثابت ہوتا ہے۔

﴿جیسی زندگی؛ ویسی موت﴾

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلٰى مَامَاتَ عَلَيْهِ. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی جس چیز پر وفات پاتا ہے اسی پر اُٹھایا جائے گا۔ ایمان کی حالت میں وفات پائی تو ایمان کی حالت میں اُٹھایا جائے گا۔ عملِ صالح کے ساتھ اور اچھے ارادوں کے ساتھ وفات پائی، تو اچھے ارادوں کے ساتھ اُٹھایا جائے گا: ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ﴾ اسی لئے حکم دیا گیا کہ تمہاری موت ایسی حالت میں آوے کہ تم مسلمان ہو۔

موت کب آئے گی اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے، اس لئے آدمی کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اچھے اعمال ہی کے اندر مشغول کرے، تاکہ جب بھی موت آوے، تو اچھی حالت میں آوے، اور خاص کر موت کا وقت جب قریب آیا ہو؛ تو اس کا اور زیادہ اہتمام ہونا چاہیے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

كَثْرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ

نیکی کے راستے بہت ہیں

مجلس ﴿۱﴾

اقتباس

صوفیا کے یہاں ایک مقولہ بڑا مشہور ہے:-

﴿طُرُقُ الْوُصُوْلِ اِلیٰ اللہِ تعالیٰ بِعَدَدِ أَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ﴾

اللہ کی ذات تک پہنچنے کے راستے مخلوق کی سانسوں کی تعداد کی مقدار ہیں،

گویا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ نہیں ہے؛ بلکہ بے شمار کام ایسے ہیں کہ جن کے ذریعہ آدمی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی حاصل کرسکتا ہے۔ اور آدمی کو اپنی حیثیت اور اپنی طاقت کے مطابق جتنا ہوسکے؛ ان سب کاموں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اور یہ بات بھی خاص پیش نظر رہے کہ جو جس کارِ خیر میں لگا ہوا ہے، اس پر تنقید سے بھی اپنے آپ کو بچائے۔

اگر کوئی نیکی کا کام نہیں کرسکتے تو کم سے کم اتنا تو کرو کہ تمہاری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف، شر اور برائی نہ پہنچے، اپنی برائی سے لوگوں کو محفوظ اور مامون کرلو:-

ع طاقت نیکی نہ داری؛ بد مکن

یہ تمہاری طرف سے اپنی ذات کے اوپر صدقہ اور احسان ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ أَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُأَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُأَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمَاتَفْعَلُوْامِنْ خَیْرٍفَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ. وقال تعالیٰ: وَمَاتَفْعَلُوْامِنْ خَیْرٍیَّعْلَمْہُ اللّٰہُ.

وقال تعالیٰ: فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍخَیْراًیَّرَہٗ. وقال تعالیٰ: مَنْ عَمِلَ صَالِحًافَلِنَفْسِہٖ

﴿نیکی کے کام بہت ہیں﴾

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں باب قائم کیا ہے ﴿کَثْرَۃُطُرُقِ الْخَیْرِ﴾ نیکی کے راستوں کی کثرت اور زیادتی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو نیک کام انجام دیتا ہے، ان میں بھی بڑا تنوع ہے اور وہ مختلف الجہات ہیں، یعنی کسی ایک چیز کے اندر منحصر نہیں ہیں بلکہ بے شمار ایسے کام ہیں جو نیکی کے کہلاتے ہیں اور ان کے ذریعہ آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔ اور جس نیکی کے ذریعہ سے وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرلے اور اس کی خوشنودی حاصل کرلے اس میں اپنی طرف سے کمی و کوتاہی نہیں کرنی چاہیے؛ بلکہ جس کام کی بھی اس کو قدرت ہو، اس کا اہتمام کرنا چاہیے، چاہے نیکی کا وہ کام چھوٹا ہو، یا بڑا ہو۔

﴿اس کا بدلہ دیا جائے گا﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بھی نیکی کا کام تم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا

ہے۔یعنی آدمی کو یہ سمجھ کر نیکی کا کام کرنا چاہیے کہ مَیں جو کام کر رہا ہوں؛ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں ہے، چاہے وہ کام چھوٹا ہو یا بڑا؛ اللہ تعالیٰ میرے اس کام کا بدلہ دنیا اور آخرت میں مجھے عطا فرمائے گا۔اس استحضار اور ثواب کی نیت کے ساتھ کام کرنا چاہیے: ﴿وَمَاتَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللهُ﴾ جو بھی نیکی کا کام تم کروگے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔

ایک اور جگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ جو آدمی ایک ذرّہ کے برابر بھی نیکی کا کام کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔یعنی چھوٹا سا نیکی کا کام ہو تو بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں باقاعدہ اس کا ریکارڈ ہے، وہ لکھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

﴿ذَرَّةٌ﴾ عربی زبان میں زرد اور سرخ رنگ کی اس چیونٹی کو کہا جاتا ہے جو بہت چھوٹی سی ہوتی ہے۔اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ ذرّات جو ہوا کے اندر اُڑتے ہیں اور کھڑکی یا روشن دان میں سے دھوپ کی جو شعاع اندر آتی ہے اس میں نظر آتے ہیں؛ اسے بھی ذرات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ ﴿مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھی ہو۔ حالانکہ ذرہ کا وزن کتنا ہوتا ہے؟ بعض حضرات نے روٹی کا پہلے وزن کیا، پھر اس کے اوپر اس طرح کی چیونٹیاں کثیر تعداد میں آئیں، پھر دوبارہ اس کا وزن کیا؛ تو کوئی بھی فرق نہیں پڑا، جو وزن پہلے تھا؛ وہی رہا۔مطلب یہ ہے کہ جس کو ہم کوئی حیثیت نہیں دیتے ایسی معمولی مقدار میں بھی نیکی کا کام اگر کوئی آدمی کرے گا؛ تو اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں باقاعدہ محفوظ رکھا جائے گا اور اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو اجر دیا جائے گا۔

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ﴾ جو آدمی بھی نیکی کا کام کرتا ہے، وہ اپنے لئے کرتا ہے یعنی اس کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچتا ہے۔دوسروں کو بھی پہنچتا ہے لیکن اولین وہلہ میں اس کا

فائدہ اسی کے لئے ہے۔تو جو نیک کام کرے گا وہ اپنے لئے کرے گا اور برائی کرے گا تو وہ بھی خود اسے ہی بھگتنا ہے۔

﴿سب سے زیادہ فضیلت والا عمل﴾

اس سلسلہ میں پہلی روایت پیش کررہے ہیں:

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ جُنْدُبِ بْنِ جُنَادَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَیُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الایْمَانُ بِاللّٰهِ وَالْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِهٖ. قُلْتُ: أَیُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: أَنْفَسُهَا عِنْدَ أَهْلِهَا وَأَكْثَرُهَا ثَمَنًا. قُلْتُ: فَإِنْ لَمْ أَفْعَلْ؟ قَالَ: تُعِیْنُ صَانِعًا أَوْ تَصْنَعُ لِأَخْرَقَ. قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَأَیْتَ إِنْ ضَعُفْتُ عَنْ بَعْضِ الْعَمَلِ؟ قَالَ: تَكُفُّ شَرَّکَ عَنِ النَّاسِ فَإِنَّهَا صَدَقَةٌ مِنْکَ عَلٰی نَفْسِکَ.

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جن کا نام جندب بن جنادہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! اعمال کے اندر کون سا عمل سب سے افضل اور سب سے بڑھا ہوا ہے؟

﴿قَالَ: الایْمَانُ بِاللّٰهِ وَالْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِهٖ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: اللہ کے اوپر ایمان لانا اور اس کے راستہ میں جہاد کرنا۔

اس لئے کہ جس کام کے اندر جتنی زیادہ مشقت اور تکلیف اٹھائی جاتی ہے، اس کے اوپر اتنا ہی اجر وثواب مرتب ہوتا ہے۔اللہ پر ایمان لانا یہ بہت مشقت اور مجاہدہ کا کام ہے۔ہم لوگ اہلِ ایمان ہی کے گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں، اس لئے ہمارے لئے اس میں بظاہر کوئی دشواری نظر نہیں آتی، لیکن جو لوگ ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں جو ایمان کے خلاف مشرکانہ ماحول ہے، اسی میں پلے اور بڑھے؛ اس کے بعد اگران کے سامنے ایمان

کی حقیقت پیش کی جائے اوراس کو سمجھنے کی دعوت دی جائے اور وہ اس کو صحیح بھی سمجھیں؛ لیکن پھر بھی اپنی طبیعت کے خلاف اور جس معاشرے کے اندر وہ زندگی بسر کررہے ہیں اس ماحول کے خلاف جا کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرنا اور ایمان لے آنا، ایمان کے جو افعال ہیں ان کو انجام دینا؛ ان کے لئے کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اسی لئے ایمان کا بدلہ جنت قرار دیا گیا کہ ایمان لانے والا بہت مجاہدہ اور مشقت کا کام کررہا ہے۔ اور ایمان کے بعد دوسرا درجہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے کا ہے، یعنی دشمن کے مقابلہ میں اپنی جان اور مال کو قربان کرنا۔

﴿کون سے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے؟﴾

﴿قُلْتُ: أَيُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ؟﴾ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مَیں نے سوال کیا کہ کون سے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے؟ یعنی کیسے غلام کو آزاد کیا جائے تو اس میں اجر وثواب زیادہ ملتا ہے؟

﴿قَالَ: أَنْفَسُهَا عِنْدَ أَهْلِهَا وَأَكْثَرُهَا ثَمَناً﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو غلام اس کے مالک کی نگاہ میں سب سے زیادہ عمدہ اور نفیس ہو، اور قیمت کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہو؛ اس کا آزاد کرنا سب سے افضل اور زیادہ ثواب کا کام ہے۔ اس لئے کہ جو چیز جتنی نفیس، عمدہ، قیمتی اور محبوب ہوتی ہے اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب بھی زیادہ ملتا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾.

﴿قُلْتُ: فَإِنْ لَمْ أَفْعَلْ؟﴾ اس پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اگر مَیں یہ نہ کرسکوں؟ یعنی ایمان تو ہے لیکن جہاد کی استطاعت نہیں ہے۔ یا جہاد کی استطاعت تو ہے، لیکن مالی حیثیت کمزور ہونے کی وجہ سے نفیس اور قیمتی غلام آزاد کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے؛ تو پھر میرے لئے کون سا طریقہ اختیار کرنا مناسب ہے؟

﴿مزدور کا ہاتھ بٹاؤ﴾

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿تُعِیْنُ صَانِعًا أَوْتَصْنَعُ لِأَخْرَقَ﴾ اوپر بتلائے گئے نیکی کے کام اگر تم نہیں کر سکتے؛ تو پھر تم کسی کام کرنے والے کی مدد کرو۔ یعنی ایک آدمی محنت مزدوری کر کے اپنے لئے، اپنے ماتحتوں کے لئے، بیوی بچوں کے لئے اور جن کا نفقہ اس کے اوپر واجب ہے ان کے لئے کماتا ہے، محنت کرتا ہے، لیکن وہ اتنی محنت نہیں کر پاتا کہ جس کے ذریعہ سے اس کی ضرورت یا اس کے ماتحتوں کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں، کچھ ضرورتیں باقی رہ جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے وہ پریشانی اور تکلیف میں مبتلا رہتا ہے؛ تو آپ اس کی مدد کیجیے اور اس کے کمانے میں اتنا ہاتھ بٹائیے کہ جس کی وجہ سے وہ اتنا حاصل کر لے جو اس کے اور اس کے ماتحتوں کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو جائے۔

﴿بے ہنر کے لئے کماؤ﴾

یا دوسری شکل یہ ہے کہ ایک آدمی کوئی کام نہیں جانتا، پہلا تو وہ تھا جو کچھ کام جانتا تھا لیکن اس کے باوجود اس کام کے ذریعہ سے اتنی کمائی حاصل نہیں کر سکتا تھا جو اس کے اور اس کے ماتحتوں کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو۔ اور دوسری صورت وہ ہے کہ سرے سے وہ کوئی کام جانتا ہی نہیں، کمانے سے عاجز ہے، یا تو اپاہج ہے یا اور کوئی ایسی کمزوری اس کو لاحق ہے جس کی وجہ سے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا؛ تو آپ اس کے لئے کام کیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کما کر محنت مزدوری کر کے اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیجیے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو یہ تاکید فرمائی۔

﴿اپنی برائی لوگوں سے روک لو﴾

﴿قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَرَأَیْتَ اِنْ ضَعُفْتُ عَنْ بَعْضِ الْعَمَلِ؟﴾ پھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ

نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر مَیں ان امور کو انجام دینے میں بھی کمزور پڑوں اور نہ کر سکوں تو؟ مطلب یہ ہے کہ یہ نیکی بھی مجھ سے نہیں ہوسکتی؛ تو اب میرے لئے کیا راستہ ہے؟

﴿قَالَ: تَكُفُّ شَرَّكَ عَنِ النَّاسِ فَإِنَّهَا صَدَقَةٌ مِنْكَ عَلَىٰ نَفْسِكَ﴾ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنا شر اور اپنی برائی لوگوں سے روک لو۔ یہ تمہاری طرف سے اپنی ذات کے اوپر صدقہ اور احسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کوئی نیکی کا کام نہیں کر سکتے تو کم سے کم اتنا تو کرو کہ تمہاری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف، شر اور برائی نہ پہنچے۔ اپنی برائی سے لوگوں کو محفوظ اور مامون کرلو:- ع طاقت نیکی نہ داری؛ بدمکن

یعنی اگر ہم سے نیکی نہیں ہوسکتی تو اتنا تو ہم کر سکتے ہیں کہ اپنی برائی و شرارتوں سے اور اپنی ایذا رسانیوں سے دوسروں کو محفوظ کرلیں؛ یہ بھی ایک بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔

اس موقعہ پر اس روایت کو پیش کر کے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اعمالِ خیر میں جو عمل افضل تھے ان کی طرف بھی رہنمائی فرمائی، اور جو لوگ ان افضل اعمال کی انجام دہی سے عاجز اور قاصر ہیں ان کے لئے نبی کریم ﷺ نے جو طریقہ بتلایا؛ وہ بھی پیش کر دیا۔ اور آخر میں ایک آخری درجہ کے طور پر فرمایا کہ اگر کوئی نیکی کا کام نہیں ہوسکتا، بڑا بھی نہیں، چھوٹا بھی نہیں، کسی نیکی کے کام کرنے کی استطاعت نہیں، یا تو اپنی کاہلی اور کمزوری کی وجہ سے نہیں کر پا رہا ہے؛ تو پھر اس کے لئے کیا شکل ہے؟ وہ بھی بتلا دی کہ اپنے شر اور اپنی برائی سے لوگوں کو محفوظ کرلے۔

﴿اپنے حالات پر نظر ثانی کیجیے﴾

اس موقعہ پر ہمیں بھی اپنے حالات کے متعلق اور اپنے روزمرہ کے جو معمولات

ہیں، لوگوں کے ساتھ روزمرہ کی جونشست و برخواست ہے اور لوگوں کے ساتھ جو معاملات ہیں؛ ان پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم دوسروں کو کتنا فائدہ پہنچا رہے ہیں؟ کسی کام کرنے والے کی ہم کتنی مدد کرتے ہیں؟ یا جو کام کرنے سے قاصر اور عاجز ہے اس کے لئے ہم کتنا کما کر دیتے ہیں؟ اور اگر یہ بھی نہیں ہوسکتا تو کم از کم ہم اپنے شر اور اپنی برائی سے لوگوں کو کتنا محفوظ رکھتے ہیں؟ ہمیں صبح سے شام تک کے اپنے سارے اعمال کا جائزہ لے کر یہ سوچنا چاہیے کہ ہم سے لوگوں کو کتنی برائی پہنچ رہی ہے۔ کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اپنی برائی سے ہم لوگوں کو محفوظ کر دیں، ہماری ذات سے کسی کو کسی نوع کی کوئی برائی اور تکلیف پہنچنے نہ پائے یہ بھی ایک طرح کا صدقہ اور نیکی کا کام ہوگا۔ لیکن ان سب میں نیت اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنے کی اور اجر وثواب کی ہونی چاہیے۔ یعنی اپنے شر سے دوسروں کو اسی نیت سے بچائے کہ اس پر بھی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب ملے گا۔ اسی لئے فرمایا ﴿تَكُفُّ شَرَّكَ عَنِ النَّاسِ﴾ اپنے شر کو لوگوں سے روکے۔ گویا اس میں اس کے ارادہ کا دخل ہے، اور نیت پائی جارہی ہے۔ اگر اس نیت سے وہ اپنے شر سے لوگوں کو محفوظ رکھے گا تب بھی ان شاء اللہ اجر وثواب کا حقدار بنے گا۔ اور اس طریقہ سے بھی آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔

﴿ایک اصلاح طلب چیز﴾

صوفیا کے یہاں ایک مقولہ بڑا مشہور ہے ﴿طُرُقُ الْوُصُوْلِ اِلیٰ اللهِ تعالیٰ بِعَدَدِ أَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ﴾ اللہ کی ذات تک پہنچنے کے راستے مخلوق کی سانسوں کی تعداد کی مقدار ہیں، یعنی ایک آدمی کی سانس کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے، اور پھر ساری مخلوق کی سانسوں کی تعداد

کتنی ہوگی؟ گویا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنے اور اللہ تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ نہیں ہے؛ بلکہ بے شمار راستے اور بے شمار کام ایسے ہیں کہ جن کے ذریعہ آدمی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی حاصل کرسکتا ہے، اور آدمی کو اپنی حیثیت اور اپنی طاقت کے مطابق جتنا ہوسکے ان سب کاموں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اور یہ بات بھی خاص پیش نظر رہے کہ جو جس کارِ خیر میں لگا ہوا ہے، اس پر تنقید سے بھی اپنے آپ کو بچائے۔

آج کل ہم لوگوں کا ایک مزاج یہ بھی ہے کہ ہم اگر کسی کارِ خیر کو لے کر چل رہے ہیں تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ سب یہی کام کریں۔ اور ہم جو کام لے کر چل رہے ہیں؛ وہی نیکی کا کام ہے، باقی لوگ جو کررہے ہیں وہ نیکی کا کام نہیں ہے۔ یہ مزاج شریعت سے میل کھانے والا نہیں ہے۔ جتنے بھی کارہائے خیر ہیں، ان تمام میں جوڑ کی شکل یہ ہے کہ خود جو کام کررہا ہے، اس میں مشغول رہتے ہوئے، نیکی کے دوسرے کاموں میں مشغول حضرات کے ساتھ بھی ان کے مناسب معاملہ کرے، ان حضرات کی بھی ہمارے دل میں وقعت اور قدردانی ہونی چاہیے کہ یہ بھی خیر کا ایک پہلو لے کر چل رہے ہیں۔

آدمی کے ہر ہر جوڑ کے اوپر صدقہ ہے

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: یُصْبِحُ عَلیٰ کُلِّ سُلامیٰ مِنْ أَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ، فَکُلُّ تَسْبِیْحَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلُّ تَحْمِیْدَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلُّ تَهْلِیْلَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلُّ تَکْبِیْرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ صَدَقَةٌ، وَیُجْزِئُ مِنْ ذٰلِکَ رَکْعَتَانِ یَرْکَعُهُمَا مِنَ الضُّحیٰ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر آدمی کے ہر ہر جوڑ کے اوپر صدقہ واجب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے

انسان کو پیدا فرمایا اور جسم عطا فرمایا، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف جوڑ رکھے، آدمی اپنے ان ہی جوڑوں کے ذریعہ سے مختلف کام انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارے یہ جوڑ - جو کَل پُرزوں کا کام دیتے ہیں- اگر نہ ہوتے تو آدمی ایک پتھر کی طرح اپنی جگہ پر پڑا رہتا، ہاتھ، پاؤں اور دوسرے اعضاء سلامت ہیں تب ہی پاؤں کی وجہ سے چلتا ہے، ہاتھ کی وجہ سے دوسرے کام انجام دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر وقت جو حرکت میں لگا ہوا ہے، کسی نہ کسی کام میں مشغول ہے، یہ سب ان جوڑوں ہی کے طفیل اور صدقہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسم کی ساخت اس انداز سے تیار فرمائی ہے کہ اس میں مختلف جوڑ ہیں اور آدمی اپنے ان مختلف جوڑوں سے مختلف کام نکالتا رہتا ہے، لہٰذا ان جوڑوں کی سلامتی پر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرنا آدمی کے لئے واجب ہے۔

آگے روایت آرہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ پیدا فرمائے ہیں اور ہر جوڑ پر اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکرادا کرنا چاہیے، اور ان کی سلامتی کے شکریہ میں اپنی طرف سے اللہ کے راستہ میں صدقہ کرنا چاہیے۔

﴿ہر بھلائی صدقہ ہے﴾

اب اگر کوئی سوچے کہ ہمارے جسم کے اندر تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور روزانہ تین سو ساٹھ صدقے کرنا بڑا مشکل کام ہے، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿فَكُلُّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةٌ﴾ نیکی کے ہر کام کو شریعت صدقہ سے تعبیر کرتی ہے۔ زبان سے ﴿سبحان الله﴾ کہنا بھی صدقہ ہے ﴿الحمدلله﴾ کہنا بھی صدقہ ہے ﴿لا الٰه الا الله﴾ کہنا بھی صدقہ ہے ﴿الله أكبر﴾ کہنا بھی صدقہ ہے، کسی کو بھلی بات کا حکم کرنا اور بری بات سے کسی کو روکنا بھی صدقہ ہے۔ پھر

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ان سب کی طرف سے دو رکعات کافی ہو جائیں گی جو آدمی دن چڑھے چاشت کے وقت ادا کرتا ہے۔ چاشت کی نماز ''صلوٰۃ الضحیٰ'' کے طور پر اگر دو رکعات ادا کرلے، تو ان سارے جوڑوں کی سلامتی کے وجہ سے اس پر جو صدقات واجب ہوئے تھے؛ وہ سارا حق ادا ہو جائے گا۔ اس سے چاشت کی نماز کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے۔

﴿راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانا﴾

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ قال قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: عُرِضَتْ عَلَیَّ أَعْمَالُ أُمَّتِیْ حَسَنُهَا وَسَیِّئُهَا، فَوَجَدْتُ فِیْ مَحَاسِنِ أَعْمَالِهَا الْأَذٰی یُمَاطُ عَنِ الطَّرِیْقِ. وَوَجَدْتُ فِیْ مَسَاوِیْ أَعْمَالِهَا النُّخَاعَةُ تَكُوْنُ فِی الْمَسْجِدِ لَا تُدْفَنُ.

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ہی روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے میری امت کے اچھے اور برے اعمال پیش کئے گئے، مَیں نے ان کے اچھے اعمال کے اندر اس تکلیف دینے والی چیز کو بھی دیکھا جو راستہ سے ہٹائی گئی ہو۔ یعنی راستہ میں کوئی تکلیف دینے والی چیز پتھر، کانٹا یا اور کچھ پڑا ہوا تھا جسے آدمی نے وہاں سے ہٹا کر کنارے پر کر دیا، تا کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے؛ یہ بھی نیکی ہے۔

اور مَیں نے اپنی امت کے برے اعمال کے اندر اس بلغم کو بھی دیکھا جو مسجد کے اندر پھینکا جاتا ہے اور دفن نہیں کیا جاتا۔ پہلے زمانہ میں مسجد کے اندر پختہ فرش یا قالین یا چٹائیاں بچھی ہوئی نہیں ہوتی تھیں، کنکر یا ریت بچھا ہوا رہتا تھا، اس لئے اگر کسی آدمی کو تھوکنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہیں تھوکنے کی اجازت تھی، البتہ یہ حکم تھا کہ تھوکنے کے بعد جو ریت یا مٹی ہے اس کو اٹھا کر اس کے اندر اپنے تھوک کو چھپا دے، تا کہ وہ کسی کے لئے ایذا اور تکلیف

کا باعث نہ بنے۔ تو اگر کسی آدمی نے اپنا بلغم یا تھوک ڈالا لیکن اس کو نہیں چھپایا، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک گناہ کا کام ہوا، اور میرے سامنے میری امت کے جو اعمالِ شریعنی گناہ کے کام پیش کیے گئے، ان میں مَیں نے یہ بھی دیکھا۔

یہاں بتلانا یہی چاہتے ہیں کہ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کا ہٹانا؛ ایک چھوٹا اور معمولی سا کام ہے، چلتے چلتے آپ اپنے ہاتھ سے بلکہ پیر سے ٹھوکر مار کر بھی اس کو کنارے پر کر سکتے ہیں، لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اعمالِ خیر میں شمار ہوتا ہے اور نبی کریم ﷺ کو اپنی امت کے جو اعمالِ خیر دکھلائے گئے؛ ان میں آپ نے اس عمل کو بھی دیکھا۔

﴿تمہارے لئے بھی تو ایک راستہ رکھا ہے﴾

وَعَنْهُ أَنَّ أُنَاساً قَالُوا: يَارَسُوْلَ اللهِ! ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْأُجُوْرِ، يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّيْ وَيَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ، وَيَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ أَمْوَالِهِمْ. قَالَ: أَوَلَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللهُ لَكُمْ مَا تَصَّدَّقُوْنَ بِهٖ. اِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً. وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً. وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً. وَكَلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً. وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ. وَفِيْ بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ! أَيَأْتِيْ أَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَيَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا أَجْرٌ؟ قَالَ: أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِيْ حَرَامٍ، أَكَانَ عَلَيْهِ وِزْرٌ؟ فَكَذٰلِكَ اِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ أَجْرٌ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ بعض غرباء نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مال و دولت والے سارا اجر اُڑا لے گئے یعنی ساری نیکیاں تو وہ لوگ ہی کما لیتے ہیں۔ جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں؛ وہ بھی پڑھتے ہیں، جس طرح ہم روزہ رکھتے ہیں؛ وہ بھی روزہ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اعمالِ خیر میں وہ ہمارے ساتھ شریک رہتے ہیں، اور ان کو ایک مزید امتیاز ہمارے مقابلہ میں یہ حاصل ہے کہ

ان کے پاس ان کی ضرورت سے زائد مال ہے، اس کے ذریعہ سے وہ صدقہ کرتے ہیں اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ ایک مزید چیز ان کو حاصل ہے، گویا وہ اپنی دولت کے ذریعہ ہم سے آگے بڑھ گئے اور درجات پر قابض ہو گئے۔

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بھی تو ایک ایسا راستہ رکھا ہے کہ اس کے ذریعہ تم صدقہ کا ثواب حاصل کر سکتے ہو۔ کیسے؟ وہ اس طرح پر کہ ہر ﴿سبحان اللہ﴾ کہنے پر اللہ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور ہر ﴿اللّٰہ أکبر﴾ کہنے پر صدقہ کا ثواب ہے، ہر ﴿ألحمد للہ﴾ کہنے پر صدقہ کا ثواب ہے، ہر ﴿لا الٰہ الا اللہ﴾ کہنے پر صدقہ کا ثواب ہے، کسی کو بھلی بات کا حکم کرنا بھی صدقہ ہے، اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، اور اپنی بیوی کے ساتھ اپنی خواہش پوری کرنے میں بھی صدقہ کا ثواب ہے۔

﴿......تو اس کو گناہ ہوتا یا نہیں؟﴾

اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا اور انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کر کے اپنی شہوت پوری کر رہا ہے؛ تو کیا اس میں بھی اس کو اجر اور ثواب ملے گا؟ یعنی یہ کون سا نیکی کا کام ہوا؛ جس پر اجر دیا جا رہا ہے؟

اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ! کوئی آدمی اپنی شہوت حرام جگہ میں پوری کرتا یعنی ایسی عورت کے ساتھ صحبت کرتا جو اس کے لئے حلال نہیں تھی، یعنی زنا کر کے اپنی شہوت پوری کرتا؛ تو کیا اس کو گناہ ہوتا یا نہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں! ضرور گناہ ہوتا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اپنی شہوت کو اس نے حلال طریقہ سے پورا کیا تو اس پر بھی اس کو ثواب ملے گا۔

یعنی اس نیت سے کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرے کہ اس طرح مَیں اپنے آپ کو زنا کے گناہ سے بچارہا ہوں، اپنی نگاہوں کی حفاظت کی غرض سے، عفت اور پاکدامنی کے ارادہ سے، بیوی کا حق ادا کرنے کے ارادہ سے، اللہ کے حکم کی بجا آوری کے ارادہ سے اگر بیوی کے ساتھ صحبت کررہا ہے؛ تو ان ساری نیتوں سے صحبت کرنے پر اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ثواب ملے گا۔

نیکی عبادت ہی میں منحصر نہیں

وعنه قال قال رسول اللهﷺ: لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا وَلَوْأَنْ تَلْقٰى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نیکی کے کسی بھی کام کو معمولی نہ سمجھو، یہاں تک کہ اپنے بھائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے چہرے سے ملنا بھی نیکی کا کام ہے۔ یعنی تھوڑا مسکرا کر اس کے ساتھ ملاقات کرنے کی وجہ سے اس کا جی خوش ہو جائے گا، اس کو ایک فرحت اور خوشی حاصل ہوگی۔ تو اس پر بھی تم کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب ملے گا۔ یہ بھی نیکی کا کام ہے۔

ان سب روایتوں کو پیش فرما کر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ نیکیوں کے کام صرف عبادتوں کے اندر ہی منحصر نہیں ہیں؛ بلکہ اس کے بے شمار طریقے اور مختلف انداز ہیں، معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کو نیکی کا کون سا انداز پسند آجائے اور اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا فیصلہ ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ کسی بھی نیکی کے کام کو انجام دے کر۔ اگر وہ اللہ کے واسطے انجام دے رہا ہے تو۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنی نجات کا فیصلہ کروایا جاسکتا ہے۔

﴿یہ بھی ایک صدقہ ہے﴾

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كُلُّ سُلَامَىٰ مِنَ النَّاسِ عَلَیْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ یَوْمٍ تَطْلُعُ فِیْهِ الشَّمْسُ. تَعْدِلُ بَیْنَ الْاِثْنَیْنِ صَدَقَةٌ، وَتُعِیْنُ الرَّجُلَ فِیْ دَابَّتِهٖ فَتَحْمِلُهٗ عَلَیْهَا أَوْتَرْفَعُ لَهٗ عَلَیْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ. وَالْكَلِمَةُ الطَّیِّبَةُ صَدَقَةٌ. وَبِكُلِّ خُطْوَةٍ تَمْشِیْهَا اِلَى الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ. وَتُمِیْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِیْقِ صَدَقَةٌ.

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: روزانہ آدمی کے ہر جوڑ پر جو صبح میں صحیح سلامت ہوتا ہے؛ ایک صدقہ واجب ہے۔اور دو آدمیوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرنا بھی صدقہ ہے۔مثلاً دو آدمیوں میں جھگڑا ہے،انہوں نے آپ کو اپنا فیصل اور حَکَم بنایا اور آپ ان دونوں کے درمیان میں انصاف سے فیصلہ کردیں اور اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم کے مطابق ان کے جھگڑے کو دور کردیں،ان کے اندر صلح صفائی کرادیں؛ یہ بھی ایک طرح کا صدقہ ہے۔

﴿ہم اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں﴾

یا مثلاً ایک آدمی کے پاس گھوڑا ہے،لیکن وہ اس پر سوار نہیں ہوسکتا ہے۔بوڑھے آدمی میں بعض مرتبہ اپنے بوڑھاپے کی کمزوری کی وجہ سے اتنی طاقت نہیں رہتی،وہ اتنا زور نہیں لگاسکتا کہ ذرا سا کود کر گھوڑے پر سوار ہوجائے،لہٰذا سواری پر سوار ہونے میں آپ اگر اس کی مدد کررہے ہیں؛ تو یہ بھی صدقہ ہے۔یا اس کا سامان اٹھا کر اس کو دے رہے ہیں،تو یہ بھی ایک صدقہ ہے۔

یہ سب نیکی کے کام بتلائے جارہے ہیں۔کیونکہ عنوان میں یہی بتلایا تھا کہ نیکی کے طریقے اور انداز مختلف ہیں۔بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو ہماری نگاہوں کے سامنے

ہوتے ہیں اور جس کے ذریعہ سے ہم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی حاصل کر سکتے ہیں، نیکیاں کما سکتے ہیں؛ لیکن ہم اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ لہٰذا آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ جس طریقہ سے بھی نیکی حاصل کرلے، اجر وثواب کمالے اور اللہ تعالیٰ کو خوش کرلے؛ یہ اس کے لئے سعادت کی بات ہے۔ کسی کو اچھی اور بھلی بات کہہ دینا بھی صدقہ ہے۔ آپ نماز کے لئے چل کر مسجد آرہے ہیں تو ہر قدم پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملے گا۔ راستہ میں کوئی تکلیف دینے والی چیز- پتھر یا کانٹا- آپ ہٹا رہے ہیں؛ اس پر بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

﴿اس نے اپنے آپ کو جہنم سے محفوظ کرلیا﴾

حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے:- أَنَّهُ خُلِقَ كُلُّ إِنْسَانٍ مِّنْ بَنِيْ آدَمَ عَلٰى سِتِّيْنَ وَثَلَاثِ مِائَةِ مِفْصَلٍ. فَمَنْ كَبَّرَاللهَ وَحَمِدَاللهَ، وَهَلَّلَ اللهَ وَسَبَّحَ اللهَ وَاسْتَغْفَرَاللهَ وَعَزَلَ حَجَراً عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ أَوْشَوْكَةً أَوْعَظْمًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ. أَوْأَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ أَوْنَهَى عَنْ مُنْكَرٍ؛ عَدَدَالسِّتِّيْنَ وَالثَّلَاثِ مِائَةِ، فَإِنَّهُ يُمْسِيْ يَوْمَئِذٍ وَقَدْ زَحْزَحَ نَفْسَهُ عَنِ النَّارِ.

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انسان کو اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ رکھے ہیں، پس جس نے ''أللہ أکبر'' کہا، اور ''ألحمد للہ'' کہا اور ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا اور ''سبحان اللہ'' کہا اور ''أستغفر اللہ'' کہا، یا راستہ میں پتھر یا کانٹا پڑا ہوا تھا یا راستہ میں ہڈی پڑی تھی جو کسی کو لگ سکتی تھی اور زخمی کر سکتی تھی؛ وہ ہٹا دی۔ یا کسی کو بھلی بات کا حکم کیا یا بری بات سے روکا؛ تو تین سو ساٹھ جوڑ کے بدلے میں شکرانے کے جو تین سو

ساٹھ صدقے اس پر واجب ہوتے ہیں، وہ اس طرح ادا ہو جاتے ہیں۔ اگر اس نے دن بھر میں نیکی کے مختلف کاموں کے ذریعہ سے تین سو ساٹھ جوڑ کا شکرانہ ادا کر دیا تو اس نے اپنے آپ کو جہنم سے دور اور محفوظ کر لیا۔

﴿مہمانی تیار ہوگی﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ غَدَا اِلیٰ الْمَسْجِدِ أَوْ رَاحَ ؛ أَعَدَّ اللهُ لَهُ فِي الْجَنَّةِ نُزُلاً كُلَّمَا غَدَا أَوْ رَاحَ. (متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی صبح کے وقت نماز پڑھنے کے واسطے مسجد کی طرف چلتا ہے، یا شام کو اپنے گھر سے مسجد کیلئے روانہ ہوتا ہے؛ اسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے جنت میں ایک دسترخوان تیار ہو جاتا ہے اور مہمانی کا انتظام ہو جاتا ہے، اگر اس وقت موت واقع ہو جائے تو اس کیلئے وہاں مہمانی تیار ہوگی۔ یا جب بھی وہ جائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انتظام ہو جائے گا۔

﴿اتنی معمولی چیز کیا دوں؟﴾

وعنه قال قال رسول الله ﷺ: يَا نِسَآءَ الْمُسْلِمَاتِ! لَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا؛ وَلَوْ فِرْسِنَ شَاةٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے مسلمان عورتو! تم میں سے کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے حقیر نہ سمجھے؛ چاہے بکری کی ایک کھری ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں ایک پڑوسی کو دوسرے پڑوسی کے ساتھ بھلائی اور احسان کا سلوک کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ خاص کر عورتوں کو کہا گیا کہ ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ

بھلائی اور حسن سلوک کا معاملہ کرے۔ مثلاً اگر کسی عورت کے پاس اپنی پڑوسن کو ہدیہ میں دینے کے لئے بکری کی ایک کھری کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے؛ تو اس کو بھی پڑوسن کی خدمت میں بطورِ ہدیہ پیش کرنے میں عار نہ سمجھے، اور یوں نہ سوچے کہ مَیں اتنی معمولی چیز کیا دوں؟

﴿خواتین توجہ دیں﴾

عام طور پر عورتوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی چیز دینے کی یا کھلانے کی نوبت آتی ہے، اور ان سے جب کہا جاتا ہے تو وہ انکار کرتی ہیں کہ یہ نہیں دے سکتے، بلکہ ان کا مزاج یہ ہوا کرتا ہے کہ اس کے لئے تو الگ سے کچھ بنایا جائے اور کوئی بڑی چیز ہونی چاہیے، وہ یوں سمجھتی ہیں کہ اگر کوئی معمولی چیز دی جائے گی؛ تو معلوم نہیں اس پر کیا تبصرہ کیا جائے گا۔

نبی کریم ﷺ نے خاص کر عورتوں کو اس بات کی تاکید فرمائی کہ تمہارے پاس اپنی پڑوسن کو پیش کرنے کے لئے بکری کی ایک کھری ہی ہے؛ تو اس کو بھی تم معمولی نہ سمجھو، بلکہ ہدیہ میں پیش کر دو۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ عمل بڑا ہے یا چھوٹا ہے؛ بلکہ وہاں تو اخلاص دیکھا جاتا ہے۔ لہٰذا اخلاص کے ساتھ آدمی اس کام کو انجام دے۔ اگر آپ اللہ کے رسولِ پاک ﷺ کے حکم اور فرمان کی بجا آوری کی نیت سے ایک معمولی سی چیز بھی پڑوسی کی خدمت میں اسی اخلاص کے ساتھ پیش کریں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں وہ قبول ہو جائے گی۔ اور اگر ریا کاری، دکھلاوے، نام ونمود اور اپنی بڑائی جتلانے کے لئے کوئی قیمتی سے قیمتی چیز بھی پیش کردیں گے تو اس کے اوپر کوئی ثواب نہیں ملے گا؛ بلکہ وہ سب بے کار جائے گا۔

بہرحال! جو دینے والی پڑوسن ہے اس کو یہاں یہ تاکید کی جا رہی ہے کہ تمہارے پاس دینے کے لئے اگر بکری کی ایک کھری ہے تو اس کو بھی حقیر نہ سمجھو؛ بلکہ پیش کر دو۔ یہ

انتظار نہ کرو کہ کوئی قیمتی چیز یا بڑی چیز ہوگی تب ہی دیں گے۔ ایسامت سوچو۔

﴿ایک اور پہلو﴾

اور بعض حضراتِ شرّاح نے اس کا ایک اور مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ اگر کسی عورت کو اس کی پڑوسن کے یہاں سے ہدیہ میں کوئی چیز آئی، چاہے بکری کی ایک کھری ہی ہو، تو اس کو چاہیے کہ اس ہدیہ کو حقیر نہ سمجھے بلکہ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھے۔

یہ بھی عورتوں کا ایک مزاج ہے اگر کسی کے پاس سے کوئی چیز ہدیہ میں آتی ہے، تو اس کے اندر خوردہ گیری کرتی ہیں اور عیب نکالتی ہیں کہ یہ ایسی ہے، پھر تبصرہ کرتی ہیں کہ اس کو لاج اور شرم نہیں آئی کہ دو ہی سموسے بھیجے، ایک روٹی ہی بھیجی، اتنا ہی کیا؟ یہ ان کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ تاکید فرمارہے ہیں کہ تمہاری پڑوسن نے ہدیہ کے طور پر تمہارے پاس اگر بکری کی کھری ہی بھیجی ہے؛ تو تم اس کو حقیر نہ سمجھو، اور یہ نہ دیکھو کہ اس نے کیا بھیجا ہے۔ اصل تو تمہیں یہ دیکھنا ہے کہ اس بکری کی کھری بھیجنے کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے، وہ تمہارے ساتھ محبت اور حسن سلوک کرنا چاہتی ہے؛ تب ہی تو اس نے یہ چیز بھیجی۔ لہٰذا یہ نہ دیکھا جائے کہ یہ چیز کتنی مقدار میں ہے؛ بلکہ جس جذبہ، نیت اور ارادے سے اس نے یہ چیز بھیجی ہے، اس کے اس ارادے کی قدر کرنی چاہیے کہ اس کے دل میں تمہارے واسطے جگہ اور مقام ہے؛ تب ہی تو اس نے تم کو یاد کیا؛ ورنہ آج کل کون کس کو یاد کرتا ہے۔

یہاں نبی کریم ﷺ کی طرف سے تاکید کی جارہی ہے کہ اگر پڑوسی کے یہاں سے معمولی سی چیز آوے تو اس پر بھی آپ کو ناک بھوؤں نہیں چڑھانا چاہیے، بلکہ اس کا احسان مند ہونا چاہیے اور شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اور آپ بھی اس کے بدلہ میں ہدیہ کے طور پر جو کچھ پیش کرسکتے ہوں؛ ضرور کریں، اس میں آپ کی طرف سے تأمل اور پس وپیش نہیں ہونا چاہیے۔

﴿ایمان کی ستّر سے اوپر شاخیں ہیں﴾

وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَلاِيْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ أَوْبِضْعٌ وَسِتُّوْنَ شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لاَ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ، وَأَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ، وَالْحَيَآءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایمان کے ستّر سے کچھ اوپر شعبے ہیں یا ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔

بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ ستّر کے کچھ اوپر فرمایا، یا ساٹھ سے کچھ اوپر فرمایا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ پہلے آپ ﷺ کو ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں بتلائی گئی تھیں؛ اس وقت آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے علم میں مزید اضافہ فرمایا گیا اور بتایا گیا کہ فلاں فلاں چیزیں بھی ایمان کی شاخوں میں داخل ہیں؛ تو پھر آپ نے اضافہ فرمایا کہ ستّر کے بھی اوپر شاخیں ہیں۔

لفظ ''بِضْعٌ'' عربی میں تین سے لے کر نو تک بولا جاتا ہے، گویا تہتّر (۷۳) سے لے کر اناسی (۷۹) تک ایمان کی شاخیں ہیں۔ اس میں سب سے افضل ﴿لاالٰہ الا اللہ﴾ ہے اور سب سے کمتر ﴿اِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ﴾ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کا ہٹانا ہے۔ گویا یہ افضل اور ادنیٰ ہے، ان دونوں کے بیچ میں اور بہت سارے نیکی کے کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھے ہوئے ہیں، آدمی کو ان سب کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اس موقعہ پر حدیث کی تشریح کرنے والوں نے قرآن پاک کی آیتوں اور احادیث کو سامنے رکھ کر ایمان کی یہ ساٹھ یا ستّر سے اوپر جو شاخیں ہیں، اور قرآن وحدیث میں جہاں کہیں بھی اس کو ایمان کا تقاضہ بتلایا گیا؛ اس کی تفصیل لکھی ہے۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو

فضائلِ ذکر میں دیکھ سکتے ہیں، حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے علامہ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ایمان کی وہ ساری شاخیں وہاں تفصیل سے ذکر کر دیں ہیں۔

كَثْرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ

نیکی کے راستے بہت ہیں

مجلس ﴿۲﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:

عن أبی هريرةَ رضی اللہ عنہ أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: بَيْنَمَارَجُلٌ يَمْشِىْ بِطَرِيْقٍ اشْتَدَّعَلَيْهِ الْعَطَشُ، فَوَجَدَبِئْراً، فَنزَلَ فِيْهَافَشَرِبَ. ثُمَّ خَرَجَ فَإِذَا كَلْبٌ يَلْهَثُ يَأْكُلُ الثَّرٰى مِنَ الْعَطَشِ، فَقَالَ الرَّجُلُ: لَقَدْ بَلَغَ هٰذَاالْكَلْبُ مِنَ الْعَطَشِ مِثْلَ الَّذِىْ كَانَ قَدْبَلَغَ مِنِّىْ، فَنزَلَ الْبِئْرَ، فَمَلَأَ خُفَّهٗ مَآءً، ثُمَّ أَمْسَكَهٗ بِفِيْهِ، حَتّٰى رَقِىَ فَسَقَى الْكَلْبَ، فَشَكَرَاللهُ لَهٗ، فَغفَرَلَهٗ. قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ! اِنَّ لَنَافِى الْبَهَائِمِ أَجراً؟ فَقَالَ: فِىْ كُلِّ كَبدٍرَطْبَةٍأَجْرٌ.

وفی روايةٍ للبخاری : فَشَكَرَاللهُ لَهٗ، فَغَفَرَلَهٗ، فَأَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ.

وفی روايةٍ لهما : بَيْنَمَا كَلْبٌ يُطَيِّفُ بِرَكِيَّةٍ، قَدْكَادَيَقْتُلُهُ الْعَطَشُ، اِذْرَأَتْهُ بَغِىٌّ مِنْ بَغَايَا بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ، فَنَزَعَتْ مُوْقَهَا، فَاسْتَقَتْ لَهٗ بِهٖ، فَسَقَتْهُ، فَغُفِرَلَهَا بِهٖ.

رضاوخوشنودی والاعمل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: ایک آدمی سفر پر جارہاتھا، اس کو پیاس کی شدت محسوس ہوئی، راستے میں اس نے ایک کنواں دیکھا، جس پر کوئی ڈول یارسہ موجودنہیں تھا، وہ کنویں کے اندر پانی پینے کے لئے اترا، جب پانی پی کر باہر آیاتو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے اپنی زبان باہرنکال کرکنویں کے باہر جوگیلی مٹی پڑی

ہوتی ہے اس کو چاٹ رہا ہے، اس آدمی نے کتے کی یہ کیفیت دیکھی تو اپنے دل میں سوچا کہ پیاس کی وجہ سے کتے کی بھی وہی حالت ہو رہی ہے جو کچھ دیر پہلے میری تھی، یعنی پیاس کی وجہ سے جیسا مَیں بے چین تھا اور تکلیف محسوس کر رہا تھا؛ یہ کتا بھی بالکل اسی کیفیت میں ہے۔ اس نے کتے کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے یہ طے کیا کہ مَیں اس کو پانی پلاؤں گا۔ چنانچہ وہ دوبارہ کنویں میں اترا، پانی باہر لانے کے واسطے اس کے پاس کوئی برتن تو تھا نہیں، اس لئے اس نے اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھرا، اور باہر نکلنے کے واسطے دونوں ہاتھوں کو استعمال کرنا تھا اس لئے وہ پانی بھرے ہوئے موزے کو دانتوں سے پکڑ کر باہر آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کو قبول فرمالیا اور اس کی مغفرت فرمادی۔

﴿کتے کے ساتھ احسان کر کے جنت کمالی﴾

اس موقعہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: ﴿یَارَسُوْلَ اللهِ!إِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ أَجْراً؟﴾ جانوروں کے ساتھ اگر ہم حسنِ سلوک اور اچھا معاملہ کریں؛ تو اس پر بھی ہمیں ثواب ملے گا؟ اس لئے کہ کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مغفرت کا فیصلہ ہوا، اس مناسبت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ سوال کیا۔ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ﴿فِيْ كُلِّ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ﴾ ہر تر جگر والے کے ساتھ – چاہے وہ انسان ہو یا جانور – اگر حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے؛ تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب ملتا ہے۔ تر جگر والے سے مراد جاندار ہے، اس لئے کہ جب کوئی جاندار مر جاتا ہے، تو اس کے جگر کی تری ختم ہو جاتی ہے اور پھر جگر خشک ہو جاتا ہے۔ جب تک جگر میں تری موجود

ہے؛ وہاں تک جسم میں جان ہے۔

اس واقعہ کو بیان کر کے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! اس آدمی نے کتے کے ساتھ احسان کر کے جنت کمالی، معلوم ہوا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی بہت آسان طریقے سے حاصل کر سکتا ہے۔

جیسا کہ شروع میں بھی بتلا دیا تھا کہ کسی بھی نیکی کے کام کو کم نہ سمجھے، اور نیکی کا جو بھی موقعہ ملے اور ہم سے نیکی کا جو کام بھی وجود میں آ سکتا ہو؛ اس کو کرنے میں ہمیں کوئی جھجھک نہیں ہونی چاہیے، اور ہمیں کاہلی اور سستی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوشش کو قبول فرما کر اس کی مغفرت فرمادی اور جنت میں داخل فرمادیا (بخاری شریف، حدیث نمبر ۲۲۸۶) ایک اور روایت بخاری و مسلم میں موجود ہے جس میں یہ واقعہ کسی مرد کا نہیں بلکہ ایک عورت کا ذکر کیا ہے کہ ایک کتا ایک کنویں کے آس پاس پیاس کی وجہ سے بے چین ہو کر چکّر کاٹ رہا تھا، قریب تھا کہ پیاس کی وجہ سے مر جاتا۔ ایک زانیہ عورت -- جس کا پیشہ زنا کروا کر کمائی حاصل کرنا تھا، جس کو رنڈی کہتے ہیں -- نے دیکھا، چنانچہ اس عورت نے چمڑے کا موزہ نکالا (چمڑے کے موزے کے اوپر ایک اور آدھا موزہ پہنا جاتا ہے، اس کو "مُوْق" کہتے ہیں) اور اس میں پانی نکال کر اس کتے کو پلایا؛ اس عمل پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔

(بخاری شریف، حدیث نمبر ۳۰۷۴/مسلم شریف، حدیث نمبر ۴۱۶۳)

دیکھئے! اس عورت کا پیشہ ہی زناکاری کا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس عملِ خیر پر اس کے لئے مغفرت کا فیصلہ فرمادیا۔

﴿نیکی کرنے میں کبھی سوچنا نہیں چاہیے﴾

اس سے پتہ چلا کہ آدمی کو کسی بھی عملِ خیر کرنے میں کبھی تأمل نہیں کرنا چاہیے، معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کون سی نیکی پر بخشش کا فیصلہ فرمادیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ آدمی کون سے نیکی کے کام کو کس جذبے سے انجام دیتا ہے؛ یہ کس کو خبر ہے، اس لئے کہ آدمی کی حالت ہر وقت یکساں نہیں رہتی، ہوسکتا ہے کہ نیکی کے چھوٹے سے کام کو جس وقت ہم انجام دے رہے ہوں، اس وقت ہم میں اخلاص کی وہ کیفیت پیدا ہوجائے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل کرلے، اور کسی بڑے کام کو انجام دینے کے وقت وہ کیفیت پیدا نہ ہوئی ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مدار تو اخلاص پر ہے، آدمی کس نیت اور جذبے سے وہ کام کررہا ہے؛ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر فیصلہ ہوتا ہے۔ کام کیسا ہے، چھوٹا ہے یا بڑا؛ اس کو نہیں دیکھا جاتا۔

﴿بڑا عمل بھی چھوٹے کے برابر نہیں ہوسکتا﴾

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے، تب بھی وہ میرے صحابی کے ایک مُد کے برابر نہیں پہنچ سکتا (مسلم شریف، ۲/۳۱۰) (ایک مُد کا وزن ۶۸ /تولہ ۳/ماشہ، یعنی ۹۶ ۷/گرام ۶۸ /ملی گرام کا ہوتا ہے) اس کی وجہ بھی یہی بتلائی گئی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر جو اخلاص موجود تھا؛ وہ دوسروں کے اندر نہیں پایا جاسکتا، اسی قلبی کیفیت کی وجہ سے ان کے چھوٹے سے عمل کو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ قبولیت حاصل ہوئی کہ دوسروں کے بڑے عمل کو بھی وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔

﴿بخشش کا فیصلہ ہو گیا﴾

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لَقَدْ رَأَیْتُ رَجُلاً یَتَقَلَّبُ فِی الْجَنَّةِ فِیْ شَجَرَةٍ قَطَعَهَا مِنْ ظَهْرِ الطَّرِیْقِ کَانَتْ تُؤْذِی الْمُسْلِمِیْنَ.

وفی روایةٍ: مَرَّ رَجُلٌ بِغُصْنِ شَجَرَةٍ عَلٰی ظَهْرِ طَرِیْقٍ. فَقَالَ: وَاللّٰهِ لَأُنَحِّیَنَّ هٰذَا عَنِ الْمُسْلِمِیْنَ لاَ یُؤْذِیْهِمْ، فَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ.

وفی روایةٍ لهما: بَیْنَمَا رَجُلٌ یَمْشِیْ بِطَرِیْقٍ وَجَدَ غُصْنَ شَوْکٍ عَلَی الطَّرِیْقِ، فَأَخَّرَهُ فَشَکَرَ اللّٰهُ لَهُ، فَغَفَرَ لَهُ.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مَیں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ جنت میں اس ایک درخت کی وجہ سے چل پھر رہا ہے؛ جو راستہ کے اوپر تھا اور لوگوں کو اس کی وجہ سے آنے جانے میں رکاوٹ ہوتی تھی، اس نے اس کو کاٹ کر لوگوں کی اس تکلیف اور رکاوٹ کو دور کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنت کا فیصلہ کر دیا۔

دوسری روایت میں یہ ہے کہ پورا ایک درخت بھی نہیں بلکہ درخت کی صرف ایک ٹہنی تھی جو راستہ پر لٹک رہی تھی، اور اس کی وجہ سے آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی تھی، اس نے یہ سوچا کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہے، مَیں اس کو دور کر کے لوگوں کی تکلیف ختم کر دوں۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی بخشش کا فیصلہ ہو گیا۔

یہاں پر بھی دیکھئے! یہ ایک چھوٹا سا عمل تھا لیکن اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لئے مغفرت کا فیصلہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی بھی نیکی اور بھلائی کا کام ہو؛ اس کو کر لینا چاہیے۔ معلوم نہیں! کون سے کام کے ذریعہ ہم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضامندی حاصل کر لیں۔ اس لئے ہر نیکی کے کام میں مؤمن کو حریص ہونا چاہیے، اس میں کبھی پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔

﴿ہر عمل میں خوبی پیدا کرنے والی کچھ چیزیں ہوتی ہیں﴾

عن أبی هريرةؓ قال: قال رسولُ اللهِ ﷺ: مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ فَاسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ، غُفِرَلَهُ مَابَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ وَزِيَادَةُ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ. وَمَنْ مَسَّ الْحَصَا؛ فَقَدْ لَغَا.

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا۔ وضو کو اس کے تمام ارکان کے ساتھ اور اس کی تمام سنتوں اور آداب کی پوری پوری رعایت کرتے ہوئے انجام دینا چاہیے۔ بہت سی مرتبہ ہم جلد بازی میں آداب اور سنتوں کی رعایت نہیں کرتے، جس کی وجہ سے بہت بڑی فضیلتوں سے محروم رہ جاتے ہیں، حالانکہ ہر عمل میں خوبی پیدا کرنے والی کچھ چیزیں ہوتی ہیں؛ جن کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے اسی لئے حضور فرماتے ہیں ﴿مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ﴾ جس نے وضو کیا اور اچھے طریقہ سے وضو کیا۔

ہم لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ دنیوی اعتبار سے ہر چیز میں اچھائی کو پسند کرتے ہیں جیسے لباس ہو؛ تو اچھا ہو، لباس دُھلنے کے بعد بھی پہننے سے پہلے برابر پریس کرواتے ہیں۔ کھانا ہو؛ تو اچھا ہو۔ مکان ہو؛ تو اچھا ہو۔ دنیوی استعمال کی ہر چیز میں اچھائی کے خواہش مند رہتے ہیں، تو ہم جب اخروی اعمال انجام دیں، چاہے وضو ہو، غسل ہو، نماز ہو، قرآنِ پاک کی تلاوت ہو یا تسبیح ہو؛ ان تمام اعمال کے اندر بھی ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿جتنی زیادہ محبت وعظمت ہوگی﴾

بعض لوگ یوں سمجھ کر اہتمام نہیں کرتے کہ یہ تو مستحب ہے، آداب کے قبیل سے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ضروری اور واجب تو نہیں ہے۔ نہیں کریں گے تب بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے؛ نہیں کریں گے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن غور

کریں کہ آپ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں، اگر اچار نہیں رکھیں گے، چٹنی، کچومر، سلاد اور پاپڑ نہیں رکھیں گے؛ تو اس کی وجہ سے دسترخوان پر کوئی کمی آنے والی نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے دسترخوان کی زینت ہے، اور اس میں خوبی پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا جب ہم دنیوی امور میں ان چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے لئے ایک عمل انجام دے رہے ہیں؛ اس میں بھی اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ بہتر سے بہتر طریقہ سے اس کو انجام دیا جائے۔ جتنی بھی خوبی پیدا کی جاسکتی ہو؛ اس میں ہماری طرف سے کوئی کمی نہیں آنی چاہیے۔ یہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت اور عظمت کی علامت ہے۔ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی جتنی زیادہ محبت وعظمت ہوگی؛ اسی مناسبت سے وہ ان چیزوں کا اہتمام کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کی دلیل

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے فضائلِ صدقات میں حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ لکھا ہے کہ جب مرض الوفات میں مبتلا تھے اور خود وضو نہیں کر سکتے تھے، کوئی خادم وضو کرا رہا تھا، وضو کے دوران وہ خادم انگلیوں میں خلال کرنا بھول گیا تو حضرت شبلی اشارے سے کہہ رہے تھے کہ خلال کرو۔ اس حالت میں بھی ایک مستحب کا اتنا زیادہ اہتمام فرمایا۔ یہ چیز اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔ چھوٹے چھوٹے آداب کی رعایت؛ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت کی دلیل ہے۔

عظمت والا جذبہ اگر دل میں ہے......

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم (رحمۂ اللہ) فرمایا کرتے ہیں کہ کھانے کے دوران اگر لقمہ گر جائے تو اس گرے ہوئے لقمہ کو اٹھا لینا؛ یہی آداب میں سے ہے۔ جیسے

بادشاہِ وقت نے کوئی چیز آپ کو دی اور جس وقت اس کی دی ہوئی اس چیز کو آپ کھا رہے ہیں وہ خود بھی دیکھ رہا ہے تو آپ ادب کا کتنا زیادہ اہتمام کریں گے۔ اول تو اس میں سے کوئی چیز نیچے گرنے ہی نہیں دیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ گر گئی، تو فوراً اٹھا کر صاف کر کے اس کو کھالیں گے، اس لئے کہ جس نے دیا ہے، وہ دیکھ رہا ہے۔ آپ سوچیں گے کہ اگر مَیں ذرا برابر بھی اس کی طرف سے بے توجہی برتوں گا؛ تو اس کی شان کے خلاف ہو جائے گا۔ اب غور کیجیے کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہیں اور جس وقت ہم اس کو استعمال کرتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہوتے ہیں، لہٰذا ہمیں ان کے آداب کا کتنا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

بہر حال! مَیں تو یہ بتلانا چاہتا تھا کہ عظمت والا جذبہ اگر دل میں ہے تو آداب کی ادائیگی بڑی آسان ہو جائے گی۔

جمعہ کے آداب میں سے ہے

تو بات اس پر چل رہی تھی کہ جس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا اس کے بعد جمعہ کی نماز کے لئے مسجد آیا۔

جمعہ کے لئے آنے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی پہلے سے آجائے، خصوصاً زوال سے پہلے آجانے کا اہتمام ہونا چاہیے، اور امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو تو اس کی طرف کان لگائے، دھیان سے خطبہ سنے اور خطبے کے دوران خاموشی اختیار کرے، کسی کے ساتھ کوئی بات چیت اور گفتگو نہ کرے، اور کسی بھی طرح کے لغو کام میں نہ پڑے؛ اگر یہ سب کرے گا تو اس کے اس عمل کی وجہ سے اس دن سے لے کر آئندہ جمعہ تک اور مزید تین دن؛ گویا دس دن کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ ایک دن کا عمل تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں

ایک کا بدلہ دس گنا دیا جاتا ہے۔

﴿وَمَنْ مَسَّ الْحَصَا؛ فَقَدْ لَغَا﴾ چونکہ اس زمانہ میں مسجد کے فرش پختہ نہیں ہوتے تھے، اور اس پر چٹائیاں بھی نہیں ہوا کرتی تھیں، کنکریاں اور ریت بچھی ہوتی تھیں، اس لئے فرمایا کہ اگر خطبے کے دوران کوئی آدمی ان کنکریوں سے کھیلنے میں مشغول رہا تو اس نے لغو کام کیا اور جب لغو کام کیا؛ تو پھر اس کو وہ اجر وثواب نہیں ملے گا۔

یہاں تو یہ بتلانا تھا کہ جمعہ کے لئے حاضری ایک عمل ہے، اور جمعہ کے لئے حاضر ہونے کے بعد آداب کی پوری رعایت کرتے ہوئے اچھی طرح خطبہ سننا اور اس موقعہ پر خاموشی اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ مقام ہے کہ اس کے دس دن کے گناہ معاف کردیے گئے۔ اتنا زیادہ اجر وثواب دیا گیا۔

﴿وضو سے حاصل ہونے والے فائدے﴾

عن أبي هريرةؓ ان رسولَ اللهِ ﷺ قال: اِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ أَوِ الْمُؤْمِنُ، فَغَسَلَ وَجْهَهُ، خَرَجَ مِنْ وَجْهِهٖ كُلُّ خَطِيئَةٍ نَظَرَ اِلَيْهَا بِعَيْنَيْهِ مَعَ الْمَآءِ أَوْمَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ. فَإِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَ مِنْ يَدَيْهِ كُلُّ خَطِيئَةٍ كَانَ بَطَشَتْهَا يَدَاهُ مَعَ الْمَآءِ أَوْمَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ. حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنَ الذُّنُوبِ. فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَتْ كُلُّ خَطِيئَةٍ مَسَّتْهَا رِجْلَاهُ مَعَ الْمَآءِ أَوْمَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ. حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنَ الذُّنُوبِ. (رواہ مسلم)

وعنهُ عن رسولِ اللهِ ﷺ قال: الصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ، والْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ، وَرَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ، اِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ.

حضرت ابوہریرہؓ کی ایک اور روایت پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی مسلمان وضو کرتا ہے اور جس وقت چہرہ دھوتا ہے، تو وہ تمام گناہ جو اس کے

چہرے سے وجود میں آئے تھے؛ پانی کے آخری قطرے کے ساتھ ڈھل جاتے ہیں۔ مثلاً چہرے میں ایک عضوآنکھ ہے، تو آنکھ نے جن گناہوں کا ارتکاب کیا تھا؛ وہ سب معاف ہوجاتے ہیں۔ اور جب ہاتھوں کو دھوتا ہے تو ہاتھوں سے چھوکر جو گناہ کئے تھے؛ وہ سب پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ ڈھل جاتے ہیں۔ اور جب پاؤں دھوتا ہے؛ تو پاؤں کے ذریعہ چل کر جو گناہ کئے تھے؛ وہ سب پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ ڈھل جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب وضو کر کے فارغ ہوتا ہے تو گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہوجاتا ہے کہ کوئی گناہ اس کے اوپر باقی ہی نہیں ہوتا۔

﴿ نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں ﴾

دوسری روایت میں ہے کہ پانچوں نمازیں، ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک، اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک، یہ تمام عبادتیں؛ درمیانی وقفہ میں جو گناہ ہوئے ہوں گے، ان کا کفارہ ہوجائیں گی۔ مثلاً فجر کے بعد جب ظہر کی نماز پڑھے گا، تو فجر سے لے کر ظہر تک جو گناہ ہوئے ہیں وہ معاف ہوجائیں گے۔ اس کے بعد پھر عصر کی نماز پڑھے گا تو ظہر سے عصر تک کے گناہ معاف ہوجائیں گے؛ اسی طرح ایک جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے لے کر دوسرے رمضان تک جو عبادتیں کی گئی ہیں ﴿اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّـئَاتِ﴾ نیکیاں آدمی کے گناہوں کو مٹادیتی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی جو معصیتیں ہوگئی تھیں؛ وہ سب ان عبادتوں کی وجہ سے معاف ہوجاتی ہیں۔

﴿ ......شرط یہ ہے کہ کبائر سے بچے ﴾

لیکن آگے ایک قید لگائی ہے ﴿اِذَا اجْتُنِبَتِ الْکَبَائِرُ﴾ جب آدمی کبائر سے بچے۔

علماء نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ ان عبادتوں کی وجہ سے صغائر اور چھوٹے گناہ معاف ہوتے ہیں، اور چھوٹے بھی وہ جن کے اوپر اصرار نہ کرتا ہو۔ اس لئے کہ چھوٹے گناہ پر بھی آدمی جب اصرار کرے یعنی بار بار کرتا رہے، تو پھر وہ بھی چھوٹا نہیں رہتا، بلکہ بڑا بن جاتا ہے لہٰذا چھوٹے گناہ کئے ہیں اور ان پر اصرار نہیں کیا، تو وہ سارے گناہ ان عبادتوں کی وجہ سے معاف ہوجاتے ہیں۔ اب رہے بڑے گناہ! تو ان کی معافی توبہ کے اوپر موقوف ہے، جب توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ غفورٌ رّحیم ہیں؛ وہ ان کو معاف کر دیں گے۔

یہ اس لئے بھی کہا گیا کہ مؤمن کی شان سے بعید ہے کہ کبائر کا ارتکاب کرے۔ رہے چھوٹے گناہ؛ تو وہ تو آدمی سے نادانستہ طور پر بھی وجود میں آجاتے ہیں، ان سے بچنا مشکل ہوجاتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان چھوٹے گناہوں کی معافی اور ان سے پاکی و صفائی کے لئے بہت آسان سا عمل بتلا دیا کہ ان ساری عبادتوں کی برکت سے وہ معاف ہوتے چلے جائیں گے۔

کبائر کے معاملہ میں ایمان والے کی طرف سے پہلا اہتمام تو اس بات کا ہوتا ہے کہ وہ کرتا ہی نہیں۔ اور اگر ہوگیا تو جب تک توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی نہ کر لے؛ وہاں تک اس کو چین نہیں پڑتا ہے۔ شانِ ایمان کا تقاضہ یہی ہے۔ اس لئے اس سے قطعِ نظر صغائر کے متعلق فرمایا کہ وہ ان اعمالِ صالحہ کی وجہ سے معاف ہوسکتے ہیں۔

﴿ ...... یہ ہے سرحدوں کی حفاظت ﴾

عن أبی هریرةؓ قالَ قالَ رسولُ اللهِ ﷺ: أَلَا أَدُلُّکُمْ عَلیٰ مَا یَمْحُو اللهُ بِهِ الْخَطَایَا وَیَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ؟ قَالُوْا: بَلیٰ یَا رَسُوْلَ اللهِ. قَالَ: إِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَی الْمَکَارِهِ. وَکَثْرَةُ الْخُطَا إِلَی الْمَسَاجِدِ. وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ؛ فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ. (رواہ مسلم)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَیں نہ بتلاؤں تم کو وہ باتیں اور وہ چیزیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرتا ہے اور درجات کو بلند کرتا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیوں نہیں؛ ضرور بتلایئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ناپسندیدہ حالات میں بھی وضو کو پورے طور پر ادا کرنا۔

"مَـکَـارِہ" مکروہ کی جمع ہے۔ یعنی طبیعت نہیں چاہتی جیسے سخت سردی ہے اور پانی ٹھنڈا ہے، اب طبیعت تو یہ کہتی ہے کہ ایک مرتبہ چہرے پر پانی پھیر دیا؛ تب بھی وضو تو ہو ہی جائے گا۔ کیا ضروری ہے کہ دو یا تین مرتبہ دھوئیں۔ لیکن تین مرتبہ دھونا یہ وضو کو کامل طور پر ادا کرنا ہے، لہٰذا سردی کی وجہ سے طبیعت میں نہ کرنے کا تقاضہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے واسطے وہ کہتا ہے کہ اللہ کے رسول نے بتلایا ہے اور طریقہ یہی ہے کہ تین مرتبہ دھونا چاہیے، اگر چہ ایک مرتبہ دھونے سے بھی فرض ادا ہو جاتا ہے اور وضو صحیح بھی ہو جاتا ہے، لیکن وضو اسی وقت کامل طریقہ سے کیا ہوا سمجھا جائے گا جب کہ ہر عضو کو تین تین مرتبہ دھویا جائے؛ اس لئے سردی میں طبیعت کے نہ چاہنے کے باوجود تین مرتبہ دھو رہا ہے۔

﴿وَكَثْرَةُ الْخُطَا إِلَى الْمَسَاجِدِ﴾ اور مسجد کی طرف کثرت سے قدم اٹھانا۔ مطلب یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرنا۔ اس لئے کہ مسجد اصالۃً خاص طور پر اسی لئے بنائی جاتی ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔ گویا جب آدمی پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا اہتمام کرے گا؛ تو بار بار مسجد کی طرف قدم اٹھانے کی نوبت آئے گی۔

﴿وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ﴾ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ انتظار

یا تو مسجد میں بیٹھ کر ہی ہو، یا اپنے گھر پر، اپنی دکان پر، اپنے کاروبار اور دفتر میں ہو۔ یعنی وہ آدمی جہاں کہیں ہو؛ لیکن اس کا جی مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔ مثلاً ظہر پڑھ کر گیا تھا اور اپنے کاروبار میں لگ گیا، لیکن اس میں مشغول ہونے کے باوجود اور ظاہری طور پر اس کا جسم کاروبار میں ہے؛ لیکن اس کا دل اس انتظار میں ہے کہ کب عصر کا وقت ہو، اذان ہو اور مَیں مسجد میں جاؤں۔ یہ ﴿اِنتِظَارُ الصَّلاۃِ بَعدَ الصَّلاۃِ﴾ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار ہے۔

لہٰذا ایک تو شکل یہ ہوئی کہ ظاہری اور جسمانی طور پر بھی مسجد ہی میں بیٹھا ہے، یہ اعلیٰ درجہ ہے۔ لیکن اگر مسجد میں نہیں بیٹھا ہے، اپنے گھر چلا گیا یا اپنے کام میں مشغول ہوا اور اپنی مشغولی میں رہتے ہوئے دل سے اس بات کا منتظر ہے کہ کب نماز کا وقت ہو، اور مَیں مسجد میں جاؤں۔ ایک مؤمن جو نمازوں کا اہتمام کرتا ہے اور سنتوں کا پابند ہے، اس کا مزاج اسی نوع کا ہوتا ہے کہ اس کو ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار رہتا ہے۔ یہ فضیلت اس کو حاصل ہو جائے گی۔

﴿فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ ہے سرحدوں کی حفاظت۔ ''رِباط'' اصل تو مملکتِ اسلامیہ کی سرحدوں کے اوپر پہرا دینے کو کہتے ہیں، تا کہ دشمن حملہ آور ہو کر مسلمانوں کی جان و مال کو نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن یہاں ''رباط'' سے مراد یہ ہے کہ آدمی جب ان اعمال کا اہتمام کرے گا تو اس کا جو اَزلی دشمن ہے یعنی شیطان، اور اس کا ساتھی یعنی ہمارے اندر بیٹھا ہوا ہمارا اپنا نفس اور جی؛ ان دونوں دشمنوں کے شر اور حملوں سے بچاؤ ہوگا، ان سے بچاؤ کے واسطے یہ اعمال چوکی اور پہرے کا کام دیں گے۔

جو آدمی ان تین چیزوں کا اہتمام کرے گا (۱) وضو کامل طریقہ سے ادا کرنے کا

(۲)اور جماعت کے ساتھ نماز کے لئے مسجد میں جانے کا (۳)اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کا؛ تو اس کو نبی کریم ﷺ کی طرف سے یہ بشارت ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ نفس اور شیطان کے حملوں سے اس کی حفاظت ہوگی۔ گویا یہ چیزیں ان دشمنوں کے مقابلہ میں چوکی اور پہرے کا کام دیتی ہیں۔

﴿فجر اور عصر کے اہتمام کی فضیلت﴾

عَنْ أَبِیْ مُوْسٰی الأشعري رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ صَلّٰی الْبَرْدَیْنِ؛ دَخَلَ الْجَنَّةَ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی دو ٹھنڈے وقتوں کی نماز پڑھے یعنی فجر اور عصر کی؛ تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

ویسے تو سب ہی نمازوں کا اہتمام کرنا چاہیے، لیکن ان دو نمازوں میں خصوصیت یہ ہے کہ فجر کی نماز ایسے وقت میں آتی ہے کہ آدمی سویا ہوا ہوتا ہے، نفس اور جی یہ چاہتا ہے کہ بستر میں پڑا رہے، اپنی میٹھی نیند کو قربان کر کے اٹھنا، وضو کرنا اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لئے مسجد جانا بڑا بھاری معلوم ہوتا ہے۔ تو یہ خاص محنت و مجاہدے کا کام ہے۔

اور عصر کی نماز کا وقت خاص کاروبار کا ہوتا ہے کہ جتنے بھی کاروبار والے آدمی ہوتے ہیں وہ اپنا سارا حساب و کتاب جوڑنے کی فکر میں لگے ہوتے ہیں، دن بھر کے اٹکے ہوئے کاموں کو نمٹانے کی فکر ہوتی ہے کہ ان کو پورا کر کے آفس، دفتر اور دکان بند کریں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خاص وہ وقت ہوتا ہے کہ آدمی کا جی اپنے کاروبار کی طرف مشغول ہوتا ہے، ایسے موقعہ پر جب کہ یہ رکاوٹ موجود ہے اور اس کو نماز سے ہٹانے والے موانع ہیں؛ ان تمام کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرتا ہے۔ تو فجر کی نماز میں

طبعی طور پر اور عصر کی نماز میں قلبی طور پر یعنی دنیوی حیثیت سے پیش آنے والی ان رکاوٹوں کے باوجود جب اہتمام کرے گا؛ تو باقی نمازوں کا اہتمام کرنا اس کے لئے آسان ہو جائے گا اسی لئے خصوصیت کے ساتھ یہاں ان دو نمازوں کی تاکید کی گئی ہے۔

عمل کئے بغیر ثواب حاصل کرنے کا آسان طریقہ

وعنه قال قال رسول الله ﷺ: اِذَامَرِضَ الْعَبْدُاَوْسَافَرَ كُتِبَ لَهُ مِثْلُ مَاكَانَ يَعْمَلُ مُقِيْماًصَحِيْحاً. (رواه البخاری)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی جب بیمار ہوتا ہے یا سفر کرتا ہے تو جو نوافل اور نیک اعمال تندرستی کے زمانہ میں یا حالت اِقامت میں انجام دیا کرتا تھا، بیماری یا سفر کی وجہ سے ان کو انجام نہیں دے سکتا۔ فرائض تو ہر حال میں انجام دینے ہی ہیں، لیکن نوافل، تلاوت، تہجد اور دوسرے نیک کام جن کا بطورِ نفل تندرستی کے زمانہ میں اہتمام کیا کرتا تھا؛ اب بیماری یا سفر کی وجہ سے نہیں کر پاتا؛ تو نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ان اعمال کا اجر وثواب پورا پورا عطا فرمائیں گے، اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

اس لئے عمل کئے بغیر ثواب حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی تندرستی کے زمانہ میں نیکی کے کاموں کا خوب اہتمام کرے؛ تو بیماری کے زمانہ میں بھی ان اعمال کا ثواب عمل کئے بغیر ہی ملتا رہے گا۔ اسی طرح اقامت کے زمانہ میں اہتمام کرے؛ تو سفر کی حالت میں بھی مستقل ثواب ملتا رہے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

كَثْرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ

نیکی کے راستے بہت ہیں

مجلس ﴿۳﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ : کُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَۃٌ.

وعنہ قال قال رسول اللہ ﷺ : مَامِنْ مُسْلِمٍ یَغْرِسُ غَرْسًااِلَّا کَانَ مَااُکِلَ مِنْہُ لَہٗ صَدَقَۃً.وَمَاسُرِقَ مِنْہُ لَہٗ صَدَقَۃً.وَلَایَرْزَؤُہٗ أَحَدٌاِلَّا کَانَ لَہٗ صَدَقَۃً.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ ہر نیکی کا کام صدقہ کا حکم رکھتا ہے یعنی اس پر آدمی کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

جب مسلمان کوئی درخت بوتا ہے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب مسلمان کوئی درخت بوتا ہے تو اس سے جو کچھ بھی کھایا جاتا ہے، چاہے انسان کھائے یا جانور کھائے؛ اس پر اس درخت بونے والے کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے، بلکہ اگر مالک نے اپنے باغ اور کھیت کے اندر درخت بویا اور دوسروں کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے پر پابندی لگا دی اور استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی؛ پھر بھی کسی نے اس میں سے کچھ چرالیا، تو اگرچہ وہ چرانے والا اپنے طور پر مجرم ہے؛ لیکن اس چرانے کے بعد بھی جب وہ کھائے گا، تو اس پر بھی اس درخت بونے والے کو صدقہ کا اجر و ثواب ملے گا۔ بلکہ کوئی بھی اس میں سے جس طرح بھی - بہ اجازت یا بغیر اجازت - کچھ بھی

کمی کرے گا؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بھی اس بونے والے کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

ایک اور روایت میں یہاں تک ہے کہ اس میں سے کوئی انسان، کوئی جانور یا کوئی پرندہ جو کچھ بھی کھائے گا تو جب تک کہ وہ درخت موجود ہے؛ وہاں تک اس بونے والے کو صدقہ کا ثواب ملتا رہے گا۔

یہاں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ نیکی کے کام مختلف، گونا گوں اور متنوع ہیں، آدمی جس طرح بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنا چاہے، اس کے لئے مختلف راستے کھلے ہوئے ہیں، وہ آسانی سے خوشنودی حاصل کرسکتا ہے

دور سے چل کر مسجد آنے کی فضیلت

وعنہ قال: أَرَادَبَنُوْسَلِمَةَأَنْ يَنْتَقِلُوْاقُرْبَ الْمَسْجِدِ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَقَالَ لَهُمْ: اِنَّهُ قَدْبَلَغَنِيْ أَنَّكُمْ تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَنْتَقِلُوْا قُرْبَ الْمَسْجِدِ؟ فَقَالُوْا: نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللهِ! قَدْأَرَادْنَاذٰلِكَ. فَقَالَ: بَنِيْ سَلِمَةَ! دِيَارَكُمْ، تُكْتَبْ آثَارُكُمْ. دِيَارَكُمْ، تُكْتَبْ آثَارُكُمْ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے۔ بنوسلمہ مدینہ منورہ میں ایک قبیلہ تھا اور جس محلّہ میں ان کے مکانات تھے وہ محلّہ مسجدِ نبوی سے دور تھا، ان کے لئے اپنے محلے اور اپنے مکانوں سے مسجدِ نبوی تک آنے میں دوری کی وجہ سے دشواری ہوتی تھی، جب مسجدِ نبوی کے قریب کوئی جگہ خالی ہوئی تو ان کا ارادہ ہوا کہ وہاں سے یہاں منتقل ہوجائیں، نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تم لوگ مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ رکھتے ہو، مسجد کے قریب جگہ خالی ہوئی ہے تو تم اپنے محلّہ کو اور اپنے مکانات چھوڑ کر یہاں آنا چاہتے ہو؟ ٹرانسفر (Transfer) ہونا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں!

اے اللہ کے رسول! ہم نے ایسا ارادہ کیا ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے بنو سلمہ! تم اپنے محلے اور اپنے گھروں کو لازم پکڑے رہو یعنی جہاں اس وقت رہ رہے ہو، وہاں سے مسجد کے قریب منتقل ہونے کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ وہیں رہو۔ اور وہاں سے مسجد تک آنے میں تم کو جو دشواری ہوتی ہے؛ اس پر بشارت سنو کہ تمہارے قدم جو وہاں سے یہاں تک آنے کے لئے تم اٹھاتے ہو، وہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں نیکی کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے پھر دوبارہ حضور ﷺ نے یہی تاکید فرمائی کہ اپنے ان مکانات کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہیں رہو۔ اور تمہارا یہ سوچنا کہ اتنی دور جانا پڑتا ہے تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے مطابق اجر وثواب بھی تو زیادہ ملتا ہے، تمہاری یہ محنت، مشقت اور مجاہدہ اجر وثواب سے خالی نہیں ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اگر ایک آدمی کا مکان مسجد سے دور ہے اور مسجد کے قریب کوئی جگہ مل رہی ہے؛ تو وہاں منتقل نہیں ہو سکتا۔ یہاں نبی کریم ﷺ کے منع فرمانے میں ایک مصلحت اور تھی جیسا کہ شرّاح نے لکھا ہے کہ وہ قبیلہ جس جگہ پر آباد تھا، نبی کریم ﷺ یہ چاہتے تھے کہ وہ جگہ بھی مسلمانوں سے آباد رہے، تاکہ اس طرف سے دشمنوں کے حملے کا خطرہ نہ رہے۔ اگر اس وقت پورا قبیلہ اس جگہ کو چھوڑ دیتا تو اس طرف سے حملہ کا اندیشہ تھا۔ یہ ایک مصلحت تھی۔

اور ساتھ ہی ان کی جو دشواری تھی کہ یہ لوگ اپنے لئے مشقت محسوس کرتے تھے کہ دور ہونے کی وجہ سے تکلیف زیادہ ہوتی ہے؛ تو نبی کریم ﷺ نے اس کا علاج بھی بتلا دیا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ خالی تکلیف ہی ہوتی ہے۔ تکلیف تو اگرچہ تمہیں ہو رہی ہے لیکن اس کا بدلہ

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے تمہاری اس تکلیف کے مطابق ثواب کی شکل میں مل بھی رہا ہے، لہٰذا تمہاری یہ محنت اور مشقت ضائع نہیں جارہی ہے۔

ایک روایت میں حضور اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ﴿اِنَّ بِکُلِّ خَطْوَۃٍ دَرَجَۃً﴾ ہر وہ قدم جو تم اٹھا کر مسجد کی طرف آتے ہو، اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں ایک درجہ کی ترقی ہوتی ہے۔ آدمی اپنی زندگی کی نمازیں اور ہر نماز کے لئے اٹھائے جانے والے قدموں کو شمار کرلے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کتنے بڑے درجات ملیں گے۔

﴿تمہارے لئے یہ دونوں چیزیں جمع کردیں﴾

عن أبی منذر أبی بن کعب رضی اللہ عنہ قَالَ: کَانَ رَجُلٌ لاَأَعْلَمُ رَجُلاً أَبْعَدَمِنَ الْمَسْجِدِ مِنْہُ، وَکَانَ لاَ تُخْطِئُہُ صَلاۃٌ، فَقِیْلَ لَہُ أَوْ فَقُلْتُ لَہُ: لَوِاشْتَرَیْتَ حِمَارًا تَرْکَبُہُ فِی الْظُّلْمَاءِ وَفِی الرَّمْضَاءِ؟ فَقَالَ: مَایَسُرُّنِیْ أَنَّ مَنْزِلِیْ اِلیٰ جَنْبِ الْمَسْجِدِ، اِنِّیْ أُرِیْدُأَنْ یُکْتَبَ لِیْ مَمْشَایَ اِلیٰ الْمَسْجِدِ، وَرُجُوْعِیْ اِذَارَجَعْتُ اِلیٰ أَھْلِیْ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: قَدْجَمَعَ اللہُ لَکَ ذٰلِکَ کُلَّہٗ. وفی روایۃ: اِنَّ لَکَ مَاأحْتَسَبْتَ.

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک آدمی تھا جو مسجد نبوی میں نماز کیلئے آیا کرتا تھا اور میرے علم میں اس سے زیادہ کوئی آدمی مسجد سے دور نہیں رہتا تھا یعنی اس کا مکان اور قیام گاہ مسجد سے کافی دور تھی، اس کے باوجود کوئی نماز اس کی چوکتی نہیں تھی یعنی مسجد سے دور ہونے کے باوجود بھی ہر نماز میں بڑی پابندی سے حاضری دیتا تھا۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگوں نے اس سے کہا یا میں نے ہی اس سے کہا کہ تم مسجد سے اتنا دور رہتے ہو اور ہر نماز میں بڑی پابندی سے آتے جاتے ہو؛ تو ظاہر ہے کہ تمہیں دشواری اور تکلیف ہوتی

ہوگی۔رات کی نمازوں میں یعنی عشاء اور فجر میں اندھیرے کے اندر آنا پڑتا ہے، یا دوپہر کے وقت گرمی میں -جب کہ زمین گرم ہوتی ہے اس وقت- تمہیں آنا پڑتا ہے،اس لئے اگر تم سواری کے طور پر کوئی گدھا خرید لو اور اسی پر سوار ہوکر مسجد آتے جاتے رہو، یا گرمی کے زمانہ میں جب زمین تپ جاتی ہے اور تمہارے پاؤں کو بھی تکلیف ہوتی ہوگی اس وقت زمین کی گرمی اور تپش سے بچنے کے لئے اگر سواری خرید لو؛ تو کیا ہی اچھا رہے۔اس آدمی نے جواب میں کہا کہ یہ بات میرے لئے کوئی خوش کن نہیں تھی کہ میرا مکان مسجد سے قریب ہوتا یعنی مجھے اس پر کوئی خوشی نہیں ہوتی کہ میرا مکان مسجد کے پڑوس میں ہوتا، بلکہ مکان دور ہے اس پر مَیں خوش ہوں۔اس لئے کہ مَیں یہ چاہتا ہوں کہ چل کر مسجد آتا رہوں اور چل کر مسجد سے واپس جاتا رہوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں میرا یہ آنا اور واپس جانا؛ دونوں چیزیں لکھی جائیں اور اس پر مجھے اجر وثواب ملے۔جب نبی کریم ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا﴿قَدْ جَمَعَ اللّٰهُ لَكَ ذٰلِكَ كُلَّهٗ﴾ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے یہ دونوں چیزیں جمع کر دیں یعنی مسجد آنے پر تو ثواب ملنا ظاہر ہے،لیکن فارغ ہونے کے بعد جب اپنے گھر واپس جائے گا تو اس پر بھی ثواب ملے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ثواب کے دینے میں کوئی کمی نہیں ہے،البتہ آدمی کو ثواب کے لئے حریص ہونا چاہیے اور اس کو چاہیے کہ ثواب حاصل کرنے کے جو مختلف انداز اور طریقے ہیں؛ ان کو اختیار کرتا رہے۔بلکہ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:﴿اِنَّ لَكَ مَا احْتَسَبْتَ﴾ تم نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے ثواب کی جو امید رکھی ہے،اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو وہ ثواب ملے گا۔

﴿ثواب کی نیت اور امید ہونا ضروری ہے﴾

ہمیں ایک خاص چیز ملحوظ رکھنی چاہیے۔ان تمام روایتوں میں- جو پہلے بھی گزریں اور آج بھی آئی -لفظِ ''احتساب'' آیا ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی طبعی امور ہیں اور ان پر ثواب کے وعدے کئے گئے ہیں، وہ ثواب اسی وقت ملے گا جب کہ ان کاموں کو انجام دیتے وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ثواب کی امید بھی ہو۔اگر ان کو بوجھ سمجھ کر یا ثواب کا دل میں ارادہ کئے بغیر انجام دیتا ہے یعنی ثواب حاصل کرنے کی طرف دل میں جو آمادگی ہوا کرتی ہے،اس کے بغیر ایسے ہی طبعی کام انجام دے دیتا ہے؛تو اس پر کوئی ثواب نہیں ملتا۔ یہ بات خاص طور پر یاد رہے۔

جیسے ایک آدمی اپنے بال بچوں کے لئے محنت ومزدوری کرتا ہے،ان کو کھلاتا پلاتا ہے،ان کے لئے کھانے پینے کا، رہائش کا اور کپڑے کا انتظام کرتا ہے۔تو ایک تو یہ ہے کہ آدمی اس کو یہ سمجھ کر انجام دیتا ہے کہ یہ میرے سر پر بوجھ ہے اور مجھے اسے ڈھونا اور برداشت کرنا ہی ہے،اگر اس طرح سے انجام دے؛تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔

اور ایک شخص بوجھ سمجھ کر نہیں بلکہ یوں سمجھ کر کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مجھے اس کا پابند کیا گیا ہے کہ ان کی ضرورتیں پوری کروں اور اس کا انتظام کروں۔اور ان کاموں کو کرتے ہوئے یوں سوچتا ہے کہ اللہ کے اس حکم کو بجالانے پر مجھے ثواب ملے گا،مَیں اللہ کا حکم پورا کر رہا ہوں؛تو اس صورت میں اس کا یہ کام یقیناً ثواب سے خالی نہیں ہوگا۔اسی طرح کھانا پینا،اٹھنا بیٹھنا وغیرہ تمام امور میں احتساب یعنی ثواب کی نیت اور امید ہونی چاہیے

﴿یہ آرام بھی فائدہ اور ثواب سے خالی نہیں﴾

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ﴿اِنِّی أَحْتَسِبُ نَوْمَتِی کَمَا أَحْتَسِبُ قَوْمَتِی﴾ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۳۹۹۶) میں جب سوتا ہوں تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ثواب کی اسی طرح امید رکھتا ہوں جس طرح نماز کے لئے اللہ کے سامنے کھڑے ہوتے وقت رکھتا ہوں۔

ہم اور آپ جب مسجد میں آ کر نماز کی نیت باندھتے ہیں، اس وقت تو ہر ایک کو یہ خیال ہوتا ہے کہ میں عبادت انجام دے رہا ہوں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اجر و ثواب ملے گا۔ ظاہر ہے کہ ثواب کا احتساب ہوتا بھی ہے، بلکہ یہ کام انجام ہی اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ آدمی اس کے ذریعہ ثواب حاصل کرے۔

لیکن ایک آدمی جب اپنے بستر پر سونے کے لئے جاتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ میں اس لئے سو رہا ہوں کہ اس پر مجھے ثواب ملے گا۔ اگر اس وقت بھی آدمی یہ سوچ لے کہ میں نہیں سوؤں گا اور اپنے جسم کو آرام نہیں پہنچاؤں گا؛ تو پھر میں پوری چستی اور نشاط کے ساتھ، چاق و چوبند ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کر سکوں گا، اس لئے میں جسم کو آرام دے لوں۔ اس لئے کہ یہ جسم اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے واسطے اور روحانیت کا راستہ قطع کرنے کے لئے ایک طرح کی سواری ہے۔ جیسے آدمی اپنی ظاہری سواری کو بقدرِ ضرورت آرام دیتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ آسانی سے منزل تک پہنچ جائے، اسی طرح میں بھی اپنے اس جسم کو — جو میرے لئے ایک مَرْکَبْ اور سواری کی حیثیت رکھتا ہے — آرام دے لوں؛ تو پھر میرے لئے آگے کی منزل تک پہنچنا آسان ہو جائے، اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے

جو ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں ان کو مَیں اچھی طرح سے ادا کرسکوں گا۔اس نیت سے اگر آرام کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ آرام بھی فائدہ اور ثواب سے خالی نہیں ہے۔

﴿نیکی کے چالیس کام﴾

عن أبی محمدعبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: أَرْبَعُوْنَ خَصْلَةً ؛ أَعْلَاهَا مَنِيْحَةُ الْعَنْزِ. مَا مِنْ عَامِلٍ يَعْمَلُ بِخَصْلَةٍ مِنْهَا رَجَآءَ ثَوَابِهَا، وَتَصْدِيْقَ مَوْعُوْدِهَا؛ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللهُ بِهَا الْجَنَّةَ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چالیس چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی کام اگر آدمی کرتا ہے ﴿رَجَآءَ ثَوَابِهَا﴾ اس کام پر ثواب کی امید رکھتے ہوئے ﴿وَتَصْدِيْقَ مَوْعُوْدِهَا﴾ اور اس پر ثواب کا جو وعدہ کیا گیا ہے اس پر یقین رکھتے ہوئے کہ مَیں یہ کام کروں گا تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے کئے ہوئے ثواب کے اس وعدے کو پورا فرمائیں گے اور مجھے ثواب دیں گے؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔

ان چالیس چیزوں میں حضور ﷺ نے فرمایا ﴿أَعْلَاهَا مَنِيْحَةُ الْعَنْزِ﴾ سب سے اعلیٰ یہ ہے کہ دودھ دینے والی بکری کسی کو دودھ پینے کے واسطے دے دی جائے۔

جہاں مویشی اور جانور پالنے کا رواج ہوتا ہے، وہاں ایک رواج یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی کے پاس دودھ دینے والے جانور زیادہ ہیں تو ان میں سے ایک آدھ جانور کسی ایسے شخص کو جس کے پاس دودھ کا کوئی انتظام نہیں ہے؛ دے دیا جاتا ہے، جانور کا مالک نہیں بنایا جاتا بلکہ جب تک یہ جانور دودھ دیتا رہے تمہارے پاس رکھو اور اس کا دودھ استعمال کرتے

رہو، جب دودھ دینا بند کردے؛ تو ہمارا جانور واپس کر دینا۔ یہ ایک رواج ہوتا ہے۔ عربی میں ایسے جانور کو جو خاص دودھ پینے کے لئے کسی کو دیا جائے "مَـنِیْـحَةٌ" کہا جاتا ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اتنی بڑی فضیلت بیان فرمائی کہ اونٹنی ہو یا بکری ہو یا گائے ہو، اگر کوئی آدمی کسی کو اس طرح دودھ پینے کے واسطے دے (گجراتی میں جس کو (દુધાળી) دینا کہتے ہیں) اس کو اعلیٰ خصلتوں میں سے شمار کیا گیا اور اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ بکری میں زیادہ دودھ نہیں ہوتا لیکن چالیس خصلتوں میں سب سے اعلیٰ اس کو بتایا گیا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا وعدہ ہے۔

﴿ آدھی کھجور ہی سہی ﴾

عن عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ قال سمعتُ النبیَّ ﷺ یقولُ: اِتَّقُوْا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ.

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، چاہے آدھی کھجور کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی اللہ کے راستہ میں دیا جانے والا صدقہ، اللہ کے راستہ میں خرچ کی جانے والی چیز، چاہے وہ معمولی ہو، دینی چاہیے مثلاً کوئی شخص آدھی کھجور ہی اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے؛ تو اس کے نتیجہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے جہنم سے حفاظت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

دوسری کتابوں میں یہی روایت موجود ہے جس میں اس طرح ہے:-

مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ اِلَّا سَيُكَلِّمُهُ رَبُّهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَرْجُمَانٌ، فَيَنْظُرُ أَيْمَنَ مِنْهُ فَلَا يَرٰى اِلَّا مَا قَدَّمَ، وَيَنْظُرُ أَشْأَمَ مِنْهُ فَلَا يَرٰى اِلَّا مَا قَدَّمَ، وَيَنْظُرُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلَا يَرٰى اِلَّا النَّارَ تِلْقَاءَ وَجْهِهِ، فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ. (بخاری شریف حدیث نمبر ۶۹۵۸)

تم میں سے ہر شخص سے اللہ تبارک وتعالیٰ براہِ راست بات کریں گے یعنی درمیان میں کوئی ترجمان اور (દુભાષિયા) نہیں ہوگا، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے بات ہو رہی ہوگی، اس وقت وہ آدمی اپنی دائیں طرف نظر کرے گا تو صرف وہی اعمالِ صالحہ اس کو نظر آئیں گے جو اس نے آگے بھیجے تھے۔ اور بائیں طرف نظر کرے گا تو جو برے کام اس نے کئے تھے وہ نظر آئیں گے، اور جب سامنے دیکھے گا؛ تو وہاں جہنم نظر آ رہی ہوگی۔ پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں: دیکھو! آگے جا کر جب جہنم سے واسطہ پڑنے والا ہے؛ تو اس سے اپنے آپ کو بچاؤ، چاہے آدھی کھجور کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

اور اگر اتنی بھی طاقت نہیں ہے؛ تو کسی کو بھلی بات کہہ دو، اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملے گا۔ اور صدقہ کی وجہ سے جو فضیلت حاصل ہوتی ہے؛ وہ اس پر بھی حاصل ہوگی۔

﴿ کھانا کھا کر بھی جنت حاصل کی جا سکتی ہے ﴾

عن أنس رضي الله عنه قال رسول الله ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ لَيَرْضٰى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَأْكُلَ الْأَكْلَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا، أَوْيَشْرَبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ بندے سے اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ جب کوئی لقمہ کھاوے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے۔ یعنی ہر لقمہ پر **ألحمد للہ** کہے۔

﴿أُكْلَةٌ﴾ ایک لقمہ کو بولتے ہیں اور ﴿أَكْلَةٌ﴾ پورے کھانے کو کہتے ہیں۔ بعضوں نے اس کو ﴿أُكْلَةٌ﴾ پڑھا ہے یعنی ہر لقمہ پر الحمد للہ کہے۔ اور بعضوں نے کہا کہ پورا کھانا

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ﴿الحمدللہ﴾ کہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔

ایک تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی نعمت استعمال کی کہ کھانا کھایا؛ لیکن اس کھانے پر بھی جب اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے تو اس پر بھی وہ خوش ہوں گے، اور جب اللہ تعالیٰ خوش ہوں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی کو جنت حاصل ہوگی۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کھانا کھا کر بھی جنت حاصل کرسکتا ہے۔ یہاں تو بتلانا یہی ہے کہ نیکی کے راستے بہت زیادہ ہیں۔

ایک آدمی یوں سوچے کہ مَیں گھر میں بیٹھا بیٹھا کھا رہا ہوں؛ اس سے مَیں کیسے جنت تک پہنچوں؟ تو حدیثِ پاک میں بتلایا گیا کہ کھانا کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اللہ کی تعریف بیان کرو، اس پر اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے اور جنت میں بھیج دیں گے۔ معلوم ہوا کہ کھانا کھا کر بھی آدمی جنت میں جاسکتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ مشقت اور تکلیف اٹھا کر ہی جاوے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اس پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ بندہ کوئی چیز پیے اور اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے، اس کی خوبیاں بیان کرے اور شکر ادا کرے۔

دیکھو! یہاں بظاہر ایک ایسا کام کیا جس کے ذریعہ سے ہم نے اپنے آپ کو اور اپنے جسم کو راحت پہنچائی، ہم نے فائدہ اٹھایا؛ لیکن اس کے باوجود اگر ہم اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رضامندی اور خوشنودی حاصل ہوگی، اور اس کے نتیجہ میں آدمی جنت میں جائے گا۔

صدقہ کرنے کے لئے مال نہیں ہے تو......

عن أبی موسٰی رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَةٌ. قَالَ: أَرَأَیْتَ اِنْ لَمْ یَجِدْ؟ قَالَ: یَعْمَلُ بِیَدَیْهِ، فَیَنْفَع نَفْسَهُ وَیَتَصَدَّق. قَالَ: أَرَأَیْتَ اِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ؟ قَالَ: یُعِیْنُ ذَاالْحَاجَةِ الْمَلْهُوْفِ. قَالَ: أَرَأَیْتَ اِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ؟ قَالَ: یَأْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ أَوِالْخَیْرِ. قَالَ: أَرَأَیْتَ اِنْ لَمْ یَفْعَلْ؟ قَالَ: یُمْسِکُ عَنِ الشَّرِّ؛ فَاِنَّهَا صَدَقَةٌ. (متفق علیہ)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔ حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر کسی آدمی کے پاس صدقہ کرنے کے لئے مال نہیں ہے؛ تو کیا کرے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اگر مال موجود نہیں ہے، تو محنت مزدوری کرے اور اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہو؛ اس کے ذریعہ خود بھی فائدہ اٹھائے اور تھوڑا بہت اللہ کے راستہ میں صدقہ بھی کرے۔ گویا صدقہ کی فضیلت یوں بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اگر اس کی طاقت نہ ہو تو......

اس پر عرض کیا گیا کہ اگر کسی میں اس کی طاقت نہ ہو کہ محنت کر کے کماوے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسی پریشان حال، حاجت مند کی مدد کردو؛ اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملے گا۔

پھر عرض کیا گیا کہ اگر اس کی بھی کسی کو طاقت نہ ہو؟ ہاتھ پاؤں کام ہی نہیں کر رہے ہیں کہ کسی کی مدد کرے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسی کو بھلی بات کا حکم کرے، اس میں تو ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں ہے، صرف زبان ہی ہلانی ہے، اور زبان ہلانے میں کوئی

مشقت بھی نہیں ہے۔ اپنی جگہ پر، اپنے بستر پر اور اپنی چارپائی پر ویسے ہی لیٹے لیٹے بھی آدمی زبان ہلاسکتا ہے۔ لہٰذا بھلی بات کا حکم کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں صدقہ کا درجہ رکھتا ہے اور اس پر بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

﴿ہم سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے﴾

پھر پوچھا گیا کہ اگر کوئی آدمی یہ بھی نہ کرسکے تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا ﴿یُمْسِکُ عَنِ الشَّرِّ؛ فَاِنَّھَا صَدَقَۃٌ﴾ آدمی کو چاہیے کہ برائی سے رک جائے۔ یعنی خود بھی کوئی گناہ کا کام نہ کرے اور کسی کو کوئی تکلیف بھی نہ پہنچائے۔ ہمارے ہاتھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے؛ یہ بھی صدقہ کا درجہ رکھتا ہے۔ گویا آخری درجہ یہ ہے کہ اگر ہمارے ذریعہ سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نہ ذات سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے، نہ مال سے، نہ زبان سے؛ تو کم سے کم اتنا تو ہم سے ہوسکتا ہے کہ اپنے شر سے اور اپنی طرف سے پہنچنے والی ایذاؤں سے لوگوں کو محفوظ رکھیں۔ گویا ہم اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنائیں کہ ہماری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے، یہ کم سے کم درجہ ہے، اس پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملے گا

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

اَلاِقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ

(عبادات میں درمیانی راہ)

مجلس ۱

اقتباس

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسلام نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔اس باب کا مقصد بھی یہی ہے کہ جوآدمی اپنی سواری کواس لئے تیز دوڑاتا ہے کہ جلدی سے اپنا سفر پورا کرلوں اور منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیز دوڑانے کی وجہ سے سواری بھی تھک تھکا کر اپنی قوت ختم کر کے مر جاتی ہے، پھر نہ تو سواری باقی رہتی ہے اور نہ اس کا سفر پورا ہوتا ہے۔
اس کے بجائے اگر وہ موقعہ بموقعہ آرام کرتے ہوئے درمیان میں ٹھہرتے ہوئے اور کچھ وقفہ دیتے ہوئے چلتا؛
تو منزلِ مقصود تک پہنچ بھی جاتا اور سواری کا جانور بھی اپنے پاس محفوظ رہتا۔
اسی طرح ہمارا یہ جسم بھی آخرت کی راہ اور روحانیت کا سفر طے کرنے کے لئے سواری کا کام دیتا ہے، اگر ہم اس سے اسی اصول کے مطابق صحیح ڈھنگ سے کام لیتے رہیں گے؛ تو منزلِ مقصود تک بھی پہنچ جائیں گے اور ہماری یہ سواری بھی محفوظ رہے گی۔اور اگر ہم نے غلط طریقہ اختیار کیا؛ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف بیماریوں میں پھنس جائیں گے۔
یہ سواری بھی ہاتھ سے جائے گی اور منزلِ مقصود تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔

۲۴/جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۷/ستمبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد

فأعوذبالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم

طٰهٰ مَاأَنْزَلْنَاعَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰى.

وقال تعالىٰ: يُرِيْدُاللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَوَلَايُرِيْدُبِكُمُ الْعُسْرَ

﴿آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوجیے﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے ﴿الاقْتِصَادُفِی الطَّاعَةِ﴾ عبادت میں میانہ روی اختیار کرنا؛ کہ نہ افراط ہواور نہ تفریط ہو، نہ غلو سے کام لے اور نہ کوتاہی سے کام لے چنانچہ اسی سلسلے میں دوآیتیں پیش کی ہیں ﴿طٰهٰ مَاأَنْزَلْنَاعَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰى﴾ اے نبی! ہم نے آپ پرقرآنِ پاک اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑیں اور تکلیف اُٹھائیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواحکام قرآنِ پاک کی شکل میں دئے گئے ہیں اس کی وجہ سے آپ مشقت میں نہ پڑیں، اورقرآنِ کریم کا پیغام بندوں تک پہنچانے کے معاملہ میں آپ اتنی زیادہ پریشانی نہ اُٹھائیں کہ وہ قبول کیوں نہیں کرتے؟ نبی کریم ﷺ کو باری تعالیٰ کی طرف سے تسلی دی گئی کہ آپ کا کام تو اللہ تعالیٰ کے احکام کا لوگوں تک پہنچادینا ہے، اب اگر وہ اس کو نہیں مانتے تو اس وجہ سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوجیے۔

﴿اللہ تعالیٰ آسانی چاہتے ہیں﴾

دوسری آیت میں فرمایا﴿یُرِیْدُاللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَایُرِیْدُبِکُمُ الْعُسْرَ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتے ہیں، دشواری اور تکلیف کا نہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف موقعوں پر مختلف ہدایتیں دے کر اور مختلف چیزوں سے بندوں کو آگاہ کر کے احکامِ شریعت کا مکلّف بنایا؛ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو مشقت اور تکلیف میں ڈالنا چاہتے ہیں بلکہ تمہارے لئے آسانی چاہتے ہیں۔ چنانچہ عام طور پر عام حالات میں جو احکام دیئے گئے ہیں؛ اگر آدمی کے اُن حالات میں کچھ تبدیلی آتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی احکام کے سلسلے میں کچھ سہولت کر دی جاتی ہے۔

﴿......آپ تیمّم کر لیجیے﴾

مثلاً عام حالات میں آدمی کو اس بات کا مکلّف کیا گیا ہے کہ اگر نماز ادا کرنی ہے تو اس کے لئے وضو کر لیجیے۔لیکن اگر پانی میسر نہ آنے کی وجہ سے کوئی آدمی وضو نہیں کر سکتا، یا پانی تو ہے؛ لیکن بیماری کی وجہ سے پانی کے استعمال پر قدرت نہیں رکھتا کہ بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، کسی عضو کے یا جان کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے؛ تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف اور آسانی کر دی گئی کہ بجائے پانی استعمال کر کے وضو کرنے کے آپ تیمّم کر لیجیے۔ یہ اسی قبیل سے ہے۔ایسا نہیں کہا گیا کہ جو بھی حالت ہو، آپ کو تو وضو ہی کرنا ہے؛ چاہے مر جائیں اور جان رہے یا نہ رہے۔ دیکھئے! کتنی آسانی کر دی گئی۔

﴿......تو روزہ نہ رکھے﴾

اسی طریقہ سے مثلاً عام حالات میں رمضان المبارک کے مہینہ میں اگر آدمی اپنے

گھر پر ہے اور تندرست ہے تو شریعت نے روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، لیکن ایک آدمی سفر میں ہے، اوراس کے لئے روزہ رکھنے میں دشواری ہے، یا بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنا اس کے لئے باعثِ مشقت وتکلیف ہے، تواِن دونوں صورتوں میں شریعت نے باوجوداس کے کہ رمضان کا مہینہ ہے اورقرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ جو آدمی رمضان کا مہینہ پالیوے؛ اس کو چاہیے کہ روزہ رکھے۔ لیکن یہ حکم عام حالات کا ہے۔ اگر کوئی آدمی مرض یا سفر کی وجہ سے اس حکم کی بجاآوری میں کلفت اور زحمت محسوس کرے؛ تو آسانی کردی گئی ﴿فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ اگر کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو؛ تو روزہ نہ رکھے، دوسرے دِنوں میں جب تندرست ہوجائے، یا سفر سے اپنے وطن میں واپس آجائے تو جوروزے چھوٹے ہیں ان کی قضا کرلے۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آسانی کردی گئی۔

﴿آسانی کردی گئی﴾

نماز میں بھی اسی طرح ہے کہ عام حالات میں حکم یہ ہے کہ آپ فرض نماز ادا کرتے ہیں تو آپ کے لئے کچھ چیزیں ضروری ہیں، مثلاً قیام ایک رکن ہے، اگر کھڑے نہیں رہیں گے؛ تو نماز صحیح نہیں ہوگی، لیکن بیماری کی وجہ سے آپ میں کھڑے رہنے کی طاقت نہیں ہے؛ تو شریعت نے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ یا بیماری کی وجہ سے آپ میں رکوع سجدہ کرنے کی طاقت نہ ہو؛ تو شریعت نے اشارہ سے رکوع وسجدہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ ایسا نہیں کہا کہ آپ کو ہر حال میں کھڑا ہی ہونا ہے، نماز کو اسی طرح ادا کرنی پڑے گی۔ ایسا کوئی جبر نہیں کیا گیا۔ یعنی عام حالات میں جو حکم دیا گیا تھا، جب انسانی حالت میں تغیر ہوا اور

تبدیلی آئی، جس کی وجہ سے وہ اس حکم پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہا؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھی آسانی کردی گئی۔

﴿……تو کوئی پابندی نہیں﴾

اسی طرح عام طور پر سفر میں کچھ نہ کچھ دشواری پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نماز میں بھی تخفیف کردی گئی کہ چار رکعات والی نماز دو رکعات ادا کرلیں، یا کیفیات میں آسانی کردی کہ عام حالات میں آپ کو جن چیزوں کا اہتمام کرنا ہے مثلاً قراءت میں سنت طریقہ کے مطابق سورتیں پڑھیں اور وہ یہ ہے کہ فجر اور ظہر کی نماز میں طوالِ مفصل یعنی سورۂ حجرات سے لے کر سورۂ بروج تک، عصر اور عشاء میں اوساطِ مفصل یعنی سورۂ بروج سے لے کر سورۂ لم یکن تک، اور مغرب کی نماز میں قصارِ مفصل یعنی سورۂ لم یکن سے لے کر آخر تک۔ یہ حکم عام حالتوں میں ہے؛ لیکن اگر کوئی سفر میں ہے تو یہ پابندی نہیں ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خود نبی کریم ﷺ نے ایک موقعہ پر فجر کی نماز میں معوذتین یعنی ﴿قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ پڑھیں (نصب الرایہ ۲/۴) تو حالتِ اقامت اور سکون واطمینان میں قراءت کے سلسلے میں خاص طریقہ بتلایا گیا ہے، سفر میں وہ بات نہیں ہے؛ اس لئے تخفیف کردی گئی۔

بہرحال! اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے شریعت کے بے شمار احکام میں بندوں کے لئے بہت ساری آسانیاں پیدا کردی گئیں ہیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ دین میں آسانی چاہتے ہیں ﴿يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ اللہ تعالیٰ مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتے، یہ مقصود نہیں ہے کہ بندہ بلاوجہ تکلیف میں مبتلا ہو؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کو یہ مقصود ہے کہ بندہ آسانی کے ساتھ ان احکام کو انجام دے سکے۔

اس کے ادا کرنے کے قابل بھی نہ رہا

بہر حال! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب عبادات کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنے کے سلسلے میں قائم کیا ہے، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ بہت سی مرتبہ آدمی اپنے ذہن سے بلا وجہ یوں سوچ کر اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتا ہے کہ مَیں جتنی زیادہ مشقت اٹھاؤں گا، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب اور نزدیکی حاصل ہوگی؛ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مشقت میں پڑنے کی وجہ سے پھر وہ کسی جسمانی بیماری میں یا کسی ایسی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ عام حالات میں جو عبادتیں ادا کر پاتا تھا ان کے ادا کرنے کے بھی قابل نہیں رہتا۔

مثلاً ایک آدمی نے پوری رات جاگنا شروع کر دیا، اب اس کی عادت تو پڑی نہیں ہے اور یوں سمجھ کر کہ مَیں پوری رات جاگوں گا تو میرے لئے زیادہ ثواب ہے۔ ٹھیک ہے! اگر آپ کے جسم میں طاقت ہے اور آپ اس کے عادی ہیں، آپ نے ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ سے اپنے آپ کو اس کا عادی بنا لیا ہے؛ تو کوئی اشکال کی چیز نہیں ہے۔ لیکن اپنے آپ کو اس کا عادی بنائے بغیر اگر پوری رات جاگیں گے تو نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ فجر کی نماز بھی غائب ہو جائے یا جماعت چھوٹ جائے۔

یہ مجھے زیادہ پسند ہے......

مؤطا میں ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان بن ابی حثمہ فجر کی نماز میں موجود نہیں تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فجر کے بعد نکلے، جب ان کے مکان کے پاس سے گذرے تو ان کی والدہ شفا سے پوچھا کہ آج فجر کی نماز میں سلیمان نظر نہیں آئے، کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہوئی کہ وہ رات بھر عبادت میں مشغول

رہے، بس! فجر کے قریب آنکھ لگ گئی اس لئے ان کی جماعت فوت ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیسی بہترین بات ارشاد فرمائی کہ مَیں رات بھر سویا رہوں اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھوں؛ یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس کے مقابلہ میں کہ رات بھر عبادت کروں اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھوں (مؤطا امام مالک، ص۴۶) دیکھئے! شریعت نے جو چیز بتائی ہے؛ اس میں آدمی کے لئے کتنی آسانی ہے۔

﴿ یہ راہ بھی کھلی رکھی ہے ﴾

حدیثِ پاک میں تو یہاں تک آتا ہے کہ اگر آدمی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو پوری رات کی عبادت کا ثواب مل جائے گا۔ کتنی آسانی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی تہجد کا اہتمام ہی نہ کرے، اہتمام کے باوجود اگر یہ موقعہ نہیں ملا تو کم سے کم ان چیزوں کا تو اہتمام کرلے۔ آدمی کے لئے یہ راہ بھی شریعت کی طرف سے کھلی رکھی گئی ہے۔ ہم لوگ ایسی چیزوں سے غلط نتیجے نکالتے ہیں۔

﴿ ......اور نہ وہ خود منزلِ مقصود تک پہنچ سکا ﴾

تو مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ شریعت نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ آدمی اگر رات بھر جاگا اور عادت نہیں ہے جس کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ فجر کی نماز فوت ہوجائے یا جماعت فوت ہوجائے۔ چلئے! فجر کی نماز بھی پڑھ لی، لیکن رات بھر جاگنے کی وجہ سے بعد میں طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ بیمار ہوگیا اور دو چار نمازیں جماعت سے چھوٹ گئیں۔ تو دیکھئے! وہ کیا حاصل کرنا چاہتا تھا اور نتیجہ اس کو کہاں تک لے گیا۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿فَاِنَّ السَّائِرَ الْمُنْبَتَّ لَا اَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَهْرًا اَبْقٰی﴾ (کنز العمال بروایت امام بزار، ۳/۳۶۔ کشف الخفا ۲۸۴۲) ﴿ جو آدمی اپنی سواری کو اس لئے تیز

دوڑاتا ہے کہ جلدی سے اپنا سفر پورا کرلوں اور منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیز دوڑانے کی وجہ سے سواری بھی تھک تھکا کر اپنی قوت ختم کر کے مرجاتی ہے، پھر نہ تو سواری باقی رہتی ہے اور نہ اس کا سفر پورا ہوتا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ موقعہ بموقعہ آرام کرتے ہوئے درمیان میں ٹھہرتے ہوئے اور کچھ وقفہ دیتے ہوئے چلتا؛ تو منزلِ مقصود تک پہنچ بھی جاتا اور سواری کا جانور بھی اپنے پاس محفوظ رہتا۔ اب نہ جانور محفوظ رہا اور نہ وہ خود منزلِ مقصود تک پہنچ سکا۔

اسی طرح ہمارا یہ جسم بھی آخرت کی راہ اور روحانیت کا سفر طے کرنے کے لئے سواری کا کام دیتا ہے، اگر ہم اس سے اسی اصول کے مطابق صحیح ڈھنگ سے کام لیتے رہیں گے؛ تو منزلِ مقصود تک بھی پہنچ جائیں گے اور ہماری یہ سواری بھی محفوظ رہے گی۔ اور اگر ہم نے غلط طریقہ اختیار کیا؛ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف بیماریوں میں پھنس جائیں گے، یہ سواری بھی ہاتھ سے جائے گی اور منزلِ مقصود تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔

﴿دین اسلام کی بڑی خوبی﴾

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسلام نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بلکہ اگلے ادیانِ سماویہ کے اندر جو احکام دئے گئے تھے ان میں بعض مذاہب وہ تھے جن میں بڑی سختیاں تھیں جیسے یہود کے یہاں بعض چیزوں میں بڑی سختیاں تھیں۔ اور بعض مذاہب وہ تھے جن کے یہاں بڑی آسانیاں تھیں جیسے نصاریٰ کے یہاں بعض چیزوں میں بہت ہی آسان پہلو اختیار کیا گیا تھا۔ مثلاً کسی نے کسی کو قتل کر دیا تو مذہب یہود میں تو یہ تھا کہ اب مقتول کے اولیاء قصاص ہی لیں گے، وہ معاف کرنا چاہیں تب بھی

معاف نہیں کر سکتے ،اور دیت بھی نہیں لے سکتے ۔نصاریٰ کے یہاں صرف دیت ہی لے سکتے تھے،قصاص کی اجازت نہیں تھی ۔اوراسلام میں اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی کہ دیت لینا چاہیں؛توصلح کر کے دیت لیں اوراگر قصاص لینا چاہیں؛ تو قصاص لیں،اوراگر معاف کرنا چاہیں؛تو معاف کر دیں۔گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام راہیں کھلی رکھی گئیں۔ تو سابقہ مذاہب میں جوسختیاں تھیں نبی کریم ﷺ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ہم پر سے وہ ختم کر دیں﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ وہ بوجھ اور قید و بند جو اگلے ادیان میں تھے؛اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی برکت سے یہ سب ختم فرمائے اور دین اسلام میں درمیانی راستہ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ۔لہٰذا آدمی کو اسی کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

﴿معمولات کیسے اور کتنے ہوں﴾

عن عائشة رضی اللہ عنہا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا امْرَأَةٌ،قَالَ:مَنْ هٰذِهٖ؟ قَالَتْ:هٰذِهٖ فُلَانَةُ.تَذْكُرُمِنْ صَلَاتِهَا.قَالَ:مَهْ؛عَلَيْكُمْ مَاتُطِيْقُوْنَ؛فَوَاللّٰهِ لَايَمَلُّ اللّٰهُ حَتّٰى تَمَلُّوْا.وَكَانَ أَحَبَّ الدِّيْنِ اِلَيْهِ مَادَاوَمَ صَاحِبُهٗ عَلَيْهِ. (متفق علیہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لائے تو ان کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی ،حضورِاکرم ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نام بتایا کہ فلانی عورت ہے۔اوراس کی نماز کا بڑا چرچا تھا لہٰذا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا بھی ذکر کیا کہ وہ رات بھر عبادت میں اور نماز میں مشغول رہتی ہے۔تو حضورِاکرم ﷺ نے فرمایا:﴿مَهْ؛عَلَيْكُمْ مَاتُطِيْقُوْنَ﴾ یعنی چھوڑو؛ یہ طریقہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ تم ایسا طریقہ اختیار کرو جس کی تمہارے اندر طاقت ہو۔انسان کو وہ

اندازاور روش اپنانی چاہیے کہ زندگی بھر جس پر مداومت اور پابندی کر سکے۔اسی لئے فرمایا ﴿فَوَاللّٰہِ لَا یَمَلُّ اللّٰہُ حَتّٰی تَمَلُّوْا﴾ اللہ تعالیٰ اجروثواب دینے میں کمی نہیں کرتے اوراُکتاتے نہیں ہیں؛ یہاں تک کہ تم عبادت کرنے سے اُکتاجاؤ۔

﴿انسانی فطرت﴾

دیکھو!انسانی فطرت اورطبیعت ایسی بنائی گئی ہے کہ اچھی اچھی چیز سے بھی اُکتاہٹ پیداہوجاتی ہے۔اچھاکھانا بھی اگرمسلسل کئی روزتک ملتارہے تو طبیعت اس کی طرف سے اُوبنے اوراُکتانےلگتی ہے۔لہٰذاعبادت کے معاملہ میں بھی اگرمیانہ روی اختیار کرے گا؛تب ہی پابندی کر سکے گا۔اگرچہ عبادت بہت اچھی چیز ہے لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ بھائی!اپنے مزاج اوراپنی طبیعت کوبھی ذرادیکھواوریوں سوچوکہ مَیں جس روش کواپنارہاہوں،کیاہمیشہ اس پر مداومت اور پابندی کرسکوں گا؟ کہیں ایساتونہیں ہوگا کہ ایک دومہینے کے بعداس طریقہ کوچھوڑبیٹھوں۔اس لئے درمیانی راہ اختیارکرنی چاہیے۔اسی کو فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے اکتاتے نہیں ہیں۔

﴿اللہ تعالیٰ کے اُکتانے کامطلب﴾

یہاں اُکتاہٹ کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔اصل تو اُکتاہٹ طبیعت کاایک تأثرہےاوراللہ تعالیٰ کی ذات ایسی کیفیات سے پاک اورمنزہ ہے۔تو دراصل یہاں اس کاثمرہ اورنتیجہ جوہوتاہےاس کوبتلانامقصودہے۔اُکتاہٹ کاثمرہ اورنتیجہ یہ ہوتاہے کہ آدمی کام چھوڑبیٹھتاہے۔مطلب یہ ہے کہ بندہ جب عبادت کرتاہےتواللہ تعالیٰ کی طرف سےاس کے نتیجے میں بندے کوثواب دیاجاتاہے،اِدھربندے نے عبادت کی،اُدھراللہ تعالیٰ

کی طرف سے ثواب ملا۔ پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ثواب دینے کا سلسلہ اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے؛ جب تک تم عبادت کا سلسلہ نہ چھوڑو۔ جب بندہ اُکتا کر عبادت کا سلسلہ ختم کردے گا؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب واجر دینے کا جو سلسلہ تھا؛ وہ بھی ختم ہوجائے گا، اس لئے کہ اجر وثواب تو اسی عبادت پر مرتب ہوتا تھا۔ لہٰذا اُکتاہٹ کا جو ثمرہ تھا -یعنی چھوڑ دینا- وہ بندے کی طرف سے پایا گیا۔ اسی کو حضور اکرم ﷺ نے تعبیر فرمایا: ﴿لَايَمَلُّ اللہُ حَتّٰی تَمَلُّوْا﴾ اللہ تعالیٰ اُکتاتے نہیں یہاں تک کہ تم خود اُکتا جاؤ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بندہ اُکتا جائے تو نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ بھی اکتا جائیں گے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بندہ اکتا کر جب عبادت چھوڑ دے گا تو اس عبادت کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اجر وثواب دیا جاتا تھا؛ وہ بھی منقطع ہوجائے گا۔ اسی کو ﴿تَمَلُّوْا﴾ سے تعبیر کیا گیا۔

﴿مداومت ہی اثر دکھلاتی ہے﴾

﴿وَكَانَ اَحَبُّ الدِّيْنِ اِلَيْهِ مَادَاوَمَ صَاحِبُهٗ عَلَيْهِ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دین کے اندر وہ طریقہ سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے جس پر آدمی مداومت اور ہمیشگی کرے یعنی چاہیں تو آپ مختصر سا عمل شروع کیجیے؛ لیکن اس پر ہمیشگی اور پابندی ہونی چاہیے، اللہ تعالیٰ کو یہ زیادہ پسند ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آگے جا کر اپنا اثر دکھلاتی ہے، گویا آپ نے جوش میں آکر دو تین رات تک رات رات بھر عبادت کی، اور پھر ایسا چھوڑا کہ فرض نماز بھی نہیں پڑھتے اس کے مقابلہ میں اگر روزانہ صرف دو رکعات پڑھتے لیکن اس پر مداومت کرتے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو بڑی اہمیت دی جاتی، اور اللہ تعالیٰ کو یہی زیادہ پسند بھی ہے۔

جیسے ایک قطرہ اگر پتھر کے اوپر ٹپکتا رہے؛ تو ایک وقت آئے گا کہ وہ اس پتھر کے

اندر بھی سوراخ کردے گا۔ اور اگر یکبارگی ایک گھنٹے تک کتنا ہی پانی ڈال دیا جائے تو چھوٹے سے پتھر پر بھی کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے۔

جیسا تعلق اور جیسی محبت

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں وہی عمل پسندیدہ ہے جس پر آدمی مداومت کرے۔ اور مداومت ہی تعلق مع اللہ کی علامت ہے۔ مثال کے طور پر آدمی کو کسی کے ساتھ محبت ہو تو اس تعلق اور محبت کی بنیاد پر ربط پیدا کرنے کے لئے اس نے یہ سبیل نکالی کہ روزانہ شام کو عصر کے بعد دس پندرہ منٹ کے لئے اس کے پاس بیٹھنے کے لئے جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جتنی محبت ہوگی؛ ویسا ہی معاملہ کرے گا۔ محبت زیادہ ہوگی تو کبھی وہ اپنے معمول میں ناغہ نہیں کرے گا۔ کہیں بھی گیا ہو؛ لیکن خیال رہے گا کہ ''مجھے تو وہاں جانا ہے'' کیونکہ اس کے دل میں ایک احساس ہے، اس کی قدر اور اہمیت کو وہ سمجھتا ہے، جس کے پاس بیٹھنے کے لئے جاتا ہے اس کے ساتھ دل میں اتنا زیادہ تعلق اور محبت ہے کہ وہ اس چیز کو گوارہ ہی نہیں کرسکتا کہ مجھے اس کے ساتھ بیٹھنے کی جو سعادت اور موقعہ ملا ہے؛ مَیں اس کو چھوڑ دوں وہ کہیں بھی گیا ہوگا؛ وہاں سے ضرور آئے گا۔ اور اگر تعلق اتنا زیادہ نہیں ہے تو سوچے گا کہ آج نہیں گئے تو کیا ہوا، پھر چلے جائیں گے، دوسرے روز نہیں گئے، تیسرے روز چلے جائیں گے۔ جیسا تعلق اور جیسی محبت ہوتی ہے؛ ویسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔

اسی طرح آدمی کا اپنے کسی عمل پر مداومت اور پابندی کا اہتمام کرنا؛ یہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور تعلق کی علامت اور نشانی ہے، اگر پابندی کرے گا؛ تب ہی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ ہمارے اکابر کے یہاں یہی کہا جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے

کہ معمولات کی پابندی ترقی کا زینہ ہے، آدمی نے اپنا جو معمول طے کیا ہے؛ اس پر ہمیشہ پابندی کرے۔

متروکات

اور معمول کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اس پر پابندی ہو۔ ایک مرتبہ مَیں نے حضرت کولکھا کہ معمولات پر پابندی نہیں ہورہی ہے۔ تو حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ پھر تو وہ معمولات نہیں رہے؛ متروکات ہوگئے۔ یعنی معمول کا مطلب ہی یہ ہے کہ جس پر عمل کیا جائے، جب عمل ہی نہیں رہا، تو وہ معمول کہاں ہوا؛ وہ تو متروک ہوا۔

خصوصی تعلق کی علامت

تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا جس کے ساتھ جتنا تعلق ہوتا ہے، اس کے بتلائے ہوئے کاموں کا وہ اتنا ہی اہتمام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی وہ عمل پسندیدہ ہے جس پر مداومت کی جائے۔ اور وہ اسی لئے پسندیدہ ہے کہ چاہے وہ چھوٹا سا عمل ہے، لیکن جب آدمی اس پر پابندی کرتا ہے؛ تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ربط ہے کہ وہ اس چھوٹے سے عمل کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اگر دو رکعات پڑھنے کا معمول بنایا ہے کہ رات کو فلاں وقت پڑھوں گا؛ تو پھر وہ ہر حال میں پڑھے گا، چاہے کتنا ہی تھکا ہوا ہو، اور چاہے کیسی ہی حالت میں ہو، کہیں سے بھی آیا ہو؛ لیکن وہ دو رکعات جو پڑھنی ہے وہ تو پڑھنی ہی ہے۔ اور یہی اس بات کی علامت ہے کہ اس کو خصوصی تعلق اور ربط ہے۔

﴿نبی کریم ﷺ کے معمولات﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قال: جآءَ ثَلاثَةُ رَهْطٍ اِلیٰ بُيُوتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ. فَلَمَّا أُخْبِرُوْا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا وقالوا: أَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ وَقَدْ غُفِرَ لَهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَاتَأَخَّرَ. قَالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَأُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَداً. وَقَالَ الآخرُ: وَأَنَا أَصُوْمُ الدَّهْرَ أَبَداً، وَلاَ أُفْطِرُ. وَقَالَ الآخرُ: وَأَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَآءَ فَلاَ أَتَزَوَّجُ أَبَداً. فَجَآءَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِلَيْهِمْ. فَقَالَ: أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللهِ اِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ وَلٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ. فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں سے ایک کے یہاں یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں گئے تاکہ حضورِ اکرم ﷺ کی عبادت کے متعلق سوال کریں کہ آپ ﷺ کے معمولات نماز روزہ وغیرہ میں کیا ہیں، آپ کی عبادت کی کیفیت کیا ہے۔ چنانچہ ان حضرات کو بتلایا گیا کہ حضورِ اکرم ﷺ رات کے ایک حصہ میں آرام فرماتے ہیں اور ایک حصہ میں عبادت کرتے ہیں۔ اور روزوں کے متعلق بتلایا کہ نبی کریم ﷺ مہینہ کے کچھ دن روزے رکھتے ہیں اور بقیہ دنوں میں افطار کرتے ہیں۔ جو بھی تفصیل تھی؛ وہ بتلائی گئی۔

﴿كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا﴾ راوی کہتے ہیں کہ جب ان کو وہ تفصیل بتائی گئی تو چونکہ وہ حضرات پہلے سے اپنے ذہنوں میں نبی کریم ﷺ کی عبادتوں کے متعلق ایک خیال لے کر آئے تھے، اور یہ سوچ رکھا تھا کہ عبادتوں کی بڑی تفصیل سننے کو ملے گی، لیکن جب یہ سب سنا تو انہوں نے اس کو کم سمجھا یعنی انہوں نے نبی کریم ﷺ کی عبادتوں کے متعلق جو خیال کیا تھا؛ وہ بات سننے کو نہیں ملی۔ تو اب انہوں نے تاویل کی کہ حضورِ اکرم ﷺ کو زیادہ عبادت کی

ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ تو بخشے بخشائے ہیں، البتہ ہم گنہ گار ہیں اور ہمارا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت ہے، معلوم نہیں کہ ہمارے بارے میں اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا فیصلہ ہو؛ لہٰذا اگر ہم نے اہتمام نہیں کیا تو ہم ہلاک ہوسکتے ہیں۔

بعض روایتوں میں تینوں حضراتِ صحابہ کے نام موجود ہیں۔ مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے بعض حضرات نے یہ نام لکھے ہیں:- حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم۔ (فتح الباری ۹/۱۲۶)

﴿اپنے طور پر تقویٰ کا معیار﴾

اس کے بعد ان تین میں سے ایک نے یہ کہا کہ مَیں تو ہمیشہ راتوں کو نماز ہی پڑھتا رہوں گا، یعنی مَیں کبھی بھی رات کو سوؤں گا نہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک پورا وقت نماز ہی میں گزاروں گا۔ دوسرے صحابی نے کہا کہ مَیں ہمیشہ روزہ رکھوں گا؛ کبھی افطار نہیں کروں گا، یعنی شام کو تو افطار کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی دن خالی جانے نہیں دوں گا، بلکہ روزانہ روزے رکھوں گا۔ تیسرے صحابی نے یوں کہا کہ مَیں ہمیشہ عورتوں سے الگ رہوں گا؛ کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ گویا انہوں نے نکاح کرنے کو اور عورتوں سے مخالطت اختیار کرنے کو تقویٰ کے خلاف سمجھا۔ ان تینوں حضرات نے اپنے اپنے طور پر ایک ایک چیز کا عہد کیا اور اپنے عزم کا اظہار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے ہی کیا اور پھر چل دیے۔

﴿تقویٰ کا اصل معیار﴾

جب حضور اکرم ﷺ مکان پر تشریف لائے تو ام المؤمنین نے حضور کو بتلایا کہ آج تو ایسا ہوا کہ فلاں فلاں صاحب آئے تھے، انہوں نے آپ کی عبادتوں کے متعلق سوالات کئے،

مَیں نے ان کو بتلائے تو اس پر انہوں نے اپنے ارادوں کا اظہار کیا۔ جب حضور اکرم ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ بنفسِ نفیس ان تینوں حضرات کے پاس تشریف لے گئے۔ پہلے تو ان سے دریافت فرمایا کہ مجھ تک جو خبر پہنچی ہے کہ کسی نے ایسی باتیں کہی ہیں؛ تو کیا وہ تم ہی لوگوں نے کہی ہیں؟ انہوں نے جواب میں اس کا اقرار کیا کہ جی ہاں۔ تو اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿أَمَا وَاللهِ اِنِّیْ لَأَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَأَتْقَاکُمْ لَهٗ وَلٰکِنِّیْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّیْ وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ﴾ سنو! اللہ کی قسم! مَیں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ڈر رکھنے والا اور اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف رکھنے والا ہوں لیکن مَیں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ یعنی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شاید تم نے تقویٰ اور خشیت کا اعلیٰ درجہ یہ سمجھا ہے کہ آدمی رات بھر عبادت کرتا رہے، اور ہمیشہ روزہ رکھتا رہے، اسی لئے شاید تم نے یہ فیصلے کئے ہوں گے؛ لیکن یاد رکھو! مَیں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ڈر رکھنے والا اور تقویٰ والا ہوں، اگر تقویٰ کا تقاضہ وہی ہوتا جس کا اظہار تم نے کیا؛ تو یقیناً یہ اعمال مَیں کرتا، یعنی مَیں رات بھر عبادت کرتا اور ہمیشہ روزے رکھتا اور مَیں کبھی کسی عورت سے نکاح نہیں کرتا۔

﴿اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں﴾

لیکن تقویٰ کا اعلیٰ درجہ وہی ہے جس کو مَیں بتلا رہا ہوں۔ مَیں نے تمہارے لئے جو طریقہ اختیار کیا اور مَیں تمہیں جس طریقہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہوں؛ اسی پر چلو۔ اور مَیں نے اپنا طریقہ بتلا دیا کہ مَیں کچھ دن روزہ رکھتا ہوں، کچھ دن افطار کرتا ہوں۔ کچھ وقت سوتا ہوں، کچھ دیر عبادت کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، اس لئے میرے طریقہ پر چلو، جو آدمی میرے طریقہ سے ہٹے گا؛ اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

﴿دین اس کا نام نہیں ہے﴾

حقیقت یہی ہے کہ دین اس کا نام نہیں کہ آدمی اپنے طور پر کوئی طریقہ تجویز کرلے، اپنے طور پر کوئی روش اختیار کرلے اور اسی کو پکڑے رہے اور یوں سمجھے کہ مَیں اس طرح اللہ کا قرب اور اس کی رضامندی حاصل کرلوں گا۔ بلکہ دین تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے جو چاہتے ہیں؛ ہم وہی کریں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے جو طریقہ ہمیں بتلادیا؛ وہی دین ہے، چاہے وہ طریقہ آسان ہو یا مشکل ہو۔ ویسے حضور ﷺ کا معمول یہی تھا ﴿مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بَيْنَ أَمْرَيْنِ اِلَّا أَخْتَارَ أَهْوَنَهُمَا (بخاری شریف ۱/۵۰۳)﴾ آپ ﷺ کو دو چیزوں میں سے اگر ایک چیز کا اختیار دیا جاتا تھا؛ تو جو آسان چیز ہوتی تھی اسی کو آپ پسند فرماتے تھے۔

نعوذ باللہ! کیا آپ سہل نگاری کے طور پر یا عیش کوشی کے طور پر یا اپنے جسم کو آرام دینے کے واسطے آسان چیز اختیار کرتے تھے؟ نہیں! بلکہ آپ اپنے اس طریقہ سے امت کو ایک تعلیم دینا چاہتے تھے۔

بہر حال! جو طریقہ شریعت نے بتلایا اس کے مطابق چلنے کا نام ہی دین ہے۔ دین یہ نہیں کہ ہم اپنی مرضی سے ایک چیز تجویز کرلیں اور اس پر چلتے رہیں، اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالانے کا نام دین ہے۔ اگر اس کا حکم یہ ہے کہ سو جاؤ؛ تو سو جانا ہی دین ہے۔ اور اگر حکم ہے کہ جاگو؛ تو پھر جاگنا دین ہے۔

﴿آپ کی پکڑ ہو جائے گی﴾

نماز سے بڑھ کر بڑی عبادت اور کونسی ہو سکتی ہے؟ لیکن شریعت نے بعض اوقات وہ بھی بتلائے جن میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ سورج طلوع ہو رہا ہو، یا بالکل سر کے

اوپر ہو، یا غروب ہو رہا ہو۔ یہ اوقات اور ٹائم کیوں رکھے؟ گویا تعلیم دی جارہی ہے کہ دیکھئے! یہ نماز اپنی جگہ پر بہت اونچی چیز ہے، لیکن ہم نے منع کر دیا کہ اس وقت نماز نہ پڑھیے؛ اب اگر اس وقت آپ نماز پڑھیں گے، تو گنہ گار قرار دئے جائیں گے۔ ثواب ملنا تو دور کی بات رہی؛ اس پر گناہ ہوگا اور آپ کی پکڑ ہو جائے گی۔

روزہ ایک عبادت ہے لیکن شریعت نے کچھ ایام ایسے بھی رکھے ہیں کہ ان میں روزہ رکھنا منع ہے۔ عید کے دونوں دن اور ایام تشریق ۱۱، ۱۲، ۱۳/ ذی الحجہ۔ اگر کوئی شخص ان دنوں میں روزہ رکھے گا؛ تو گنہ گار ہوگا۔ دیکھئے! روزہ اپنی جگہ پر عبادت ہے، لیکن ایسے احکام کیوں دئے؟ یہ بتلانے کے لئے کہ آپ ان عبادتوں کی صورتوں کو یہ نہ سمجھئے کہ یہی اصل ہے؛ بلکہ اصل تو اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالانا ہے۔

حج میں کیا ہوتا ہے؟

حج میں کیا ہوتا ہے؟ آٹھویں ذی الحجہ کو آپ مکہ مکرمہ سے منیٰ روانہ ہو جائیے، اب منیٰ جا کر کیا کرنا ہے؟ کچھ کرنا نہیں ہے، وہاں ٹھہر کر صرف پانچ نمازیں پڑھنی ہیں۔ ارے بھائی! حرم شریف کو چھوڑ کر - جہاں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہے، کعبہ اپنی نگاہوں کے سامنے ہے، اس کو چھوڑ کر - وہاں جائیں؟ حالانکہ وہاں کوئی کام بھی نہیں کرنا ہے، وہاں صرف ٹھہرنا ہے اور پانچ نمازیں - ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور دوسرے دن کی فجر - پڑھنی ہیں اور پھر نویں تاریخ کو عرفہ جانا ہے۔ تو آٹھویں تاریخ کو منیٰ کیوں بھیجا گیا؟ یہی بتلانے کے لئے کہ آپ کو ہم نے اپنے گھر پر حج کے واسطے بلایا ہے، تو یہ نہ سوچئے کہ یہاں حرم کی نماز چھوڑ کر جا رہے ہیں، بلکہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا ہے، اسی میں اس کی رضامندی اور خوشنودی ہے۔

بلکہ حج کے تو تمام افعال ہی ایسے ہیں کہ وہاں عشق کا مظاہرہ کرایا جارہا ہے۔ عاشق دوسرا کچھ نہیں دیکھتا ہے، وہ تو بس یہی دیکھتا ہے کہ محبوب مجھ سے کیا چاہتا ہے، محبوب جو کہے؛ اس کو کرنے کے لئے تیار ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ عبادت کسی خاص فعل یا خاص صورت کا نام نہیں ہے؛ بلکہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجاآوری کا نام ہے، جس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا گیا، اس حکم کو آپ بجالائیں؛ یہی عبادت ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی میانہ روی اسی وقت اختیار کرے گا؛ جب اس کا ذہن صاف ہوگا اور کسی خاص عمل میں یہ نہیں دیکھے گا کہ اسی عمل کے ذریعہ میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہوں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے بے شمار طریقے ہیں۔ یہ طریقہ نہیں تو اور سہی۔ آگے روایت لائیں گے، اس میں تفصیل آئے گی۔

بہرحال! مَیں یہ بتلانا چاہتا تھا کہ جو عنوان قائم کیا ہے ﴿الاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ﴾ آدمی کو عبادت کے اندر درمیانی راہ اختیار کرنی چاہیے، وہ اسی لئے کہ آدمی اگر افراط وتفریط اور مبالغہ سے کام لے گا؛ تو پھر وہ کبھی بھی پابندی اور مداومت نہیں کرسکے گا، اور جب مداومت نہیں کرسکے گا؛ تو کبھی اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اسی لئے شریعت نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

﴿اللہ تبارک وتعالیٰ عمل کی توفیق نصیب فرمائے﴾

اَلاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ

(عبادات میں درمیانی راہ)

﴿مجلس ۲﴾

اقتباس

دو شکلیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی دین پر عمل کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لے؛ تو اس کو تفریط سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دین پر عمل کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی سے اور بہت زیادہ مبالغہ سے کام لے؛ اسی کو غلو سے تعبیر کیا گیا۔

جو آدمی دین کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لے، اس کا غلط ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اس کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا، اور کسی کو اس کے متعلق یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ چیز دین میں پسندیدہ ہوگی

لیکن ایک آدمی دین کے معاملہ میں مبالغہ سے کام لیتا ہے، شریعت نے جو حدود مقرر کی ہیں، ان سے آگے بڑھ کر اپنی ذات کے ساتھ سختی کا معاملہ کرتا ہے، اس کے متعلق لوگوں کو شاید یہ خیال ہوسکتا تھا کہ یہ آدمی دین پر عمل کرنے کے معاملہ میں لوگوں سے بہت زیادہ آگے بڑھا ہوا ہے اور ترقی کیئے ہوئے ہے، اور ہوسکتا تھا کہ کچھ لوگ اس کی اس روش کو پسندیدہ قرار دیں

تو نبی کریم ﷺ نے خاص طور پر ایسے لوگوں کے معاملہ میں فرمایا

”ایسے لوگ ہلاک ہوگئے“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:

﴿ ایسے لوگ ہلاک ہوگئے ﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:ھَلَکَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ.قَالَھَاثَلاثاً. (رواہ مسلم)

((اَلْمُتَنَطِّعُوْنَ))اَلْمُتَعَمِّقُوْنَ الْمُشَدِّدُوْنَ فِیْ غَیْرِمَوْضِعِ التَّشْدِیْد.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ ”مُتَنَطِّعُوْن“ ہلاک ہوگئے۔آپ نے تین مرتبہ یہ فرمایا۔”مُتَنَطِّعُوْن“کامطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جوایسی جگہ سختی کرتے ہیں جہاں سختی نہیں کرنی چاہیے،جولوگ تشددسے کام لیتے ہیں اور غلوکرتے ہیں،ایسے لوگوں کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشادفرمایا۔گویاغلوآخری اورانتہا کادرجہ ہے۔

دوشکلیں ہیں اگرکوئی آدمی دین پرعمل کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لے؛تواس کو تفریط سے تعبیرکیاجاتاہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ دین پرعمل کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی سے اوربہت زیادہ مبالغہ سے کام لے؛اسی کوغلوسے تعبیرکیاگیا۔اورجوآدمی دین کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لے،اس کاغلط ہوناتوسب ہی جانتے ہیں،اس کوکوئی بھی اچھانہیں سمجھتا، اورکسی کواس کے متعلق یہ خیال نہیں ہوتاکہ یہ چیزدین میں پسندیدہ ہوگی۔مثلاًایک آدمی

نمازوں کا اہتمام نہیں کرتا، اس میں کوتاہی کرتا ہے۔ روزوں کی ادائیگی میں، زکوۃ کی ادائیگی میں، دوسری عبادات اور احکام کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے؛ اس کا برا ہونا تو سب ہی کو معلوم ہے۔ لیکن ایک آدمی ان چیزوں کی ادائیگی میں مبالغہ سے کام لیتا ہے، شریعت نے جو حدود مقرر کی ہیں، ان سے آگے بڑھ کر اپنی ذات کے ساتھ سختی کا معاملہ کرتا ہے، اس کے متعلق لوگوں کو شاید یہ خیال ہو سکتا تھا کہ یہ آدمی دین پر عمل کرنے کے معاملہ میں لوگوں سے بہت زیادہ آگے بڑھا ہوا ہے اور ترقی کئے ہوئے ہے، اور ہو سکتا تھا کہ کچھ لوگ اس کی اس روش کو پسندیدہ قرار دیں؛ تو نبی کریم ﷺ نے خاص طور پر ایسے لوگوں کے معاملہ میں فرمایا کہ ایسے لوگ ہلاک ہو گئے۔

''ہلاک ہو گئے'' کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے دین پر عمل کے معاملہ میں اپنی ذات کے ساتھ سختی کی جو روش اختیار کر رکھی ہے؛ وہ ایسی ہے جو ہمیشہ باقی نہیں رہتی اور اس پر وہ پابندی نہیں کر سکتے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود اس کو نباہنے سے عاجز ہو جائیں گے اور یہی چیز ان کے لئے ہلاکت کا باعث ہوگی۔

﴿دین آسان ہے﴾

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ، وَلَن یُّشَادَّ الدِّیْنُ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَأَبْشِرُوْا وَأَسْتَعِیْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَیْئٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ.

وفی روایة له: سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا، وَاغْدُوْا وَرُوْحُوْا وَشَیْئٌ مِنَ الدُّلْجَةِ. اَلْقَصْدَ اَلْقَصْدَ تَبْلُغُوْا.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دین آسان ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کے اندر جن چیزوں کے کرنے کا بندوں کو مکلّف بنایا ہے؛ وہ ایسے ہی احکام ہیں کہ جن پر بندے آسانی سے عمل کر سکتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کے معاملہ

میں ان کے لئے کوئی دشواری یا تکلیف نہیں ہے۔اور یہی دین کا خاص مزاج ہے کہ انسانوں کی طبیعتوں کوملحوظ رکھتے ہوئے احکام کا مکلّف بنایا جائے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی انسانوں کو پیدا کیا ہے ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ جو پیدا کرنے والی ذات ہے؛ کیا بھلا وہی نہیں جانے گی؟ وہ تو بخوبی واقف ہے کہ جن کو پیدا کیا ہے،ان کا مزاج کیسا ہے اور ان کی طبیعتیں کتنی چیز کو برداشت کرسکتی ہیں۔لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ اتنی حد تک ہی بندوں کو حکم دیتے ہیں؛ جو ان کی برداشت کے اندر ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی کو ایسی چیز کا مکلّف اور پابند نہیں بناتے؛ جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ لہٰذا شریعت کے جتنے بھی احکام ہیں،وہ تمام اسی انداز سے دیے گئے ہیں کہ بندے وہ آسانی کے ساتھ ان پر عمل کرسکیں۔اسی کو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دین عمل کے اعتبار سے آسان ہے اور دین کے ساتھ زور آزمائی نہیں کی جائیگی؛مگر یہ کہ دین ہی اس کے اوپر غالب آئے گا۔

﴿دین اس پر غالب آجاتا ہے﴾

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے دوسرے الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔ ﴿لَنْ يُّشَادَّ﴾ مجہول کا صیغہ ہے،عربی جاننے والے موجود ہیں جو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں ﴿الدِّينُ﴾ اس کا نائب فعل بنتا ہے۔لیکن دوسری روایت میں ہے ﴿لَن يُّشَادَّ الدِّيْنَ أَحَدٌ﴾ کوئی آدمی اگر اس دین کے ساتھ زور آزمائی اور مقابلہ کرتا ہے؛ تو دین ہی اس کے اوپر غالب آجاتا ہے۔

”دین اس پر غالب آجاتا ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ دین اس کی اصل کے اعتبار سے تو آسان ہی ہے،لیکن یہ آدمی اپنے طور پر دین پر عمل کے معاملہ میں اپنے اوپر کچھ سختیاں

لا د کر یوں سمجھتا ہے کہ مَیں کچھ اور ترقی کر لوں گا، لیکن ان سختیوں کو اپنے اوپر لاگو کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ان چیزوں کو نباہ نہیں سکے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام دیئے گئے ہیں اس میں بندوں کی طبیعتوں کا لحاظ کیا گیا ہے اور وہ اس سے آگے بڑھنا چاہتا ہے، گویا اس کی طبیعت جس چیز کو آگے تک برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس نے ازخود اپنے اوپر اس کو لاگو کر دیا اور اپنے آپ کو اس کا پابند بنا دیا۔ اب ممکن ہے کہ چند دنوں تک تو اس کو نباہ سکے اور اس پر عمل کر سکے؛ لیکن ایک وقت آئے گا کہ وہ اس پر پابندی نہیں کر سکے گا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ تھک ہار کر بیٹھ جائے گا۔ اس کو پہلے ہی سے کہا گیا تھا کہ یہ راستہ اختیار مت کرو، اس راستہ پر آپ آگے تک نہیں جا سکتے، لیکن اس نے نہیں مانا اور خود ہی اپنے اوپر پابندی عائد کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حد تک جانے کے بعد وہ خود ہی تھک گیا اور عاجز آ گیا۔

﴿لِكَثْرَةِ طُرُقِهِ﴾ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دین کے اندر کسی ایک عمل کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ دین میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے طرف سے بیشمار چیزیں بندوں کو بتلائی گئی ہیں، روزہ بھی ہے، نماز بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے، حج بھی ہے؛ اور بیشمار ایسے راستے ہیں جن کی بندوں کو ہدایت اور رہنمائی کی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ آدمی جو غلو کر رہا ہے اور اپنے آپ پر سختی کا جو معاملہ کر رہا ہے، یہ معاملہ تمام چیزوں میں تو نہیں کر سکتا۔

فرض کر لیجئے کہ ایک آدمی نے پوری رات نماز پڑھنے کی ٹھان لی، تو بس! وہ نماز تک اپنے اوپر سختی کرے گا، لیکن جب روزوں کا معاملہ آئے گا؛ وہاں یہ نہیں کر سکے گا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی اور مال خرچ کرنے کی بات آئے گی؛ وہاں یہ نہیں کر سکے گا۔ یعنی اگر اس کو آگے ہی بڑھنا تھا، تو پھر ان سب میں کرتا لیکن وہ نہیں کر سکے گا۔ اور یہاں پر بھی یہ رات بھر نماز پڑھنے

کا جو سلسلہ شروع کرے گا؛ اس کو بھی آگے جاکر اپنے مزاج اور طبیعت کی وجہ سے نباہ نہیں سکے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا تفصیلی قصہ آگے آئے گا۔

﴿اگر پہلے ہی سے اس پر عمل کرلیا ہوتا......﴾

خلاصہ یہ ہوا کہ دین کے کام اور نیکی کے راستے تو بیشمار ہیں، کوئی شخص اگر غلو کرے گا؛ تو کہاں تک کرے گا؟ ایک میں کرے گا، دوسرے میں کرے گا، لیکن کتنی چیزوں میں نباہ سکے گا؟ آخر تھک ہار کر بیٹھ جائے گا، اور پھر دین اس پر غالب آجائے گا۔ گویا دین نے پہلے روز سے جو حکم دیا تھا کہ اس طرح چلنا؛ آج اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ بات اس کی سمجھ میں آئی، اگر پہلے ہی سے اس پر عمل کرلیا ہوتا؛ تو اس کی نوبت نہ آتی۔

﴿بہت اونچی اُڑان مت بھرو﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ﴿فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَأَبْشِرُوْا﴾ اسی لئے میانہ روی اختیار کرو، نہ افراط سے کام لو، نہ تفریط سے کام لو۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ﴿سَدِّدُوْا﴾ کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ بلند پروازیاں مت کرو، بہت اونچی اُڑان مت بھرو؛ بلکہ شریعت نے جو حدود رکھے ہیں؛ ان کے اندر چلو۔ اور میانہ روی کا جیسا حق ہے؛ وہ تو تم پورا نہیں کرسکو گے، اس لئے کم سے کم میانہ روی کے قریب رہنے کی کوشش کرنا، اس سے بہت زیادہ دور مت جا پڑیو۔ ﴿وَأَبْشِرُوْا﴾ اور لوگوں کو بشارتیں سناؤ۔

﴿یہ بھی ایک سفر ہے﴾

اور صبح کی کچھ سیر اور سفر سے، اور شام کے سفر سے، اور رات کے سفر سے مدد حاصل کرو۔ اصل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی راہ چلنے والے کو مسافر سے تشبیہ دی ہے، چونکہ اس

زمانہ میں سواریوں کا یہ رواج جو آج ہمارے دور میں ہے؛ وہ تو تھا نہیں۔ جہاں بھی جانا ہوتا تھا تو عام طور پر قافلے والوں کے ساتھ اونٹوں کے اوپر جایا کرتے تھے اور مسافتیں طے کیا کرتے تھے۔ اور اس وقت نظام یہ ہوتا تھا کہ قافلے دن کے شروع میں سورج اُگنے کے بعد کچھ دیر چلتے تھے یعنی دو تین گھنٹے کا سفر کیا جاتا تھا اور پھر جب دھوپ تیز ہوتی تھی تو وہ لوگ چلنے کا سلسلہ منقطع کر کے کسی جگہ پڑاؤ ڈال دیتے تھے اور آرام کر لیتے تھے۔ پھر دوپہر کے بعد دھوپ کی تیزی کچھ کم ہونے لگتی تھی تو پھر سفر شروع ہوتا اور یہ سفر دن کے آخری وقت میں تین چار گھنٹے کا ہوتا، جب تھک جاتے تو پھر ذرا آرام کر لیتے۔ رات کے شروع حصہ میں آرام کیا اور پھر رات کے اخیر حصہ میں سفر شروع ہوتا تھا، چند گھنٹے کا وہ سفر ہوتا۔ اس طرح تین حصہ میں دن بھر کا سفر کیا جاتا تھا۔ اسی طرح مہینہ دو مہینہ کا سفر ہوتا تھا اور سفر قطع کرنے کی صورت یہی ہوتی تھی۔

ایسا نہیں کرتے تھے کہ صبح سات بجے سفر شروع کیا تو شام کے سات بجے تک چلتے ہی رہے۔ آج کل کی ہماری جو سواریاں ٹرین وغیرہ کی ہیں، یہ تو اپنے طور پر چلتی ہیں، جہاں ہمیں اترنا ہوتا ہے، وہاں پر ہم اتر جاتے ہیں، یہ ایک الگ نظام ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں اونٹ اور دوسرے جانوروں کے ذریعہ یا پیدل سفر کیا جاتا تھا، لہٰذا وہاں تو ظاہر ہے کہ سواری کو بھی آرام دینا ہی پڑتا تھا۔

اعتدال؛ منزل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ تمہارا یہ جسمانی اور ظاہری سفر دن بھر کی تین قسطوں میں چلاتے ہو اور اس طرح دھیرے دھیرے اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہو، یہ درمیانی اور معتدل

طریقہ ہے؛ اسی طرح روحانی سفر کو قطع کرنے کے لئے بھی یہی روش اختیار کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور عبادت کے معاملہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ کچھ دیر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہے، پھر جسم میں تھکاوٹ کا احساس ہونے لگا تو جسم کو کچھ آرام دے دیا، پھر طبیعت میں نشاط پیدا ہوگیا اور تازگی آگئی، طبیعت کچھ فریش (Fresh) ہوگئی؛ تو پھر سے اپنا کام شروع کردیا۔ اگر اسی طرح کرتے رہو گے تو پوری توجہ اور دل بستگی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہے گا، کبھی طبیعت کے اندر اُکتاہٹ پیدا نہیں ہوگی، اور ہمیشہ پوری قوت اور اعتدال کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہو گے اور ایک وقت آئے گا کہ منزل تک پہنچ جاؤ گے۔ اور اگر کبھی جوش میں آکر زور آزمائی کرلی اور ایک ساتھ زیادہ کام کرلیا؛ تو پھر تھک کر ایسے بیٹھ جاؤ گے کہ منزل تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

آپ کو لذت بھی محسوس ہوگی

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور ﷺ کی اسی حدیث کو ایک اور طریقہ سے سمجھایا کہ دیکھو! تمہاری طبیعتوں کے بھی نشاط کے اوقات ہوتے ہیں جیسے کہ سفر کے لئے یہ تین وقت نشاط کے ہوتے ہیں کہ ان اوقات میں طبیعت کی تازگی کے ساتھ سفر کیا جاتا ہے، اسی طریقہ سے اپنے روحانی سفر اور اعمال کی ادائیگی کے لئے بھی نشاط والے اوقات کو پسند کرو، ان اوقات میں اگر ہم عبادت کریں گے؛ تو پورا دل لگے گا اور اس کا حق بھی ادا ہوگا اور پوری دل جمعی اور دل بستگی کے ساتھ عبادت کرسکیں گے اور اس میں لذت بھی محسوس ہوگی۔ اس لئے کہ آدمی جب نشاط کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے تو لذت بھی محسوس ہوتی ہے۔ اور جو کام اکتاہٹ اور دل کی تنگی کے ساتھ کرتا ہے؛ وہ ایک بوجھ سمجھ کر کرتا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس

طرح تم کرو گے تو اپنے مقصود تک اور اپنی منزل تک پہنچ جاؤ گے ﴿کَمَا أَنَّ الْمُسَافِرَ الْحَاذِقَ یَسِیْرُ فِی هٰذِهِ الاوْقَاتِ وَیَسْتَرِیْحُ هُوَ وَدَابَّتُهُ فِیْ غَیْرِهَا،فَیَصِلُ الْمَقْصُوْدَ بِغَیْرِ تَعْبٍ﴾ جیسے سمجھ دار مسافران تین اوقات میں چلتا ہے اور سفر جاری رکھتا ہے، باقی اوقات میں خود بھی آرام کرتا ہے اور اپنی سواری کو بھی آرام دیتا ہے اور اس طرح منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

﴿ایک اصول﴾

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: دَخَلَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم الْمَسْجِدَ،فَإِذَا حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ بَیْنَ السَّارِیَتَیْنِ. فَقَالَ: مَا هٰذَا الْحَبْلُ؟ قَالُوْا: هٰذَا حَبْلٌ لِزَیْنَبَ. فَإِذَا فَتَرَتْ،تَعَلَّقَتْ بِهٖ. فَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: حُلُّوْهُ لِیُصَلِّ أَحَدُکُمْ نَشَاطَهُ،فَإِذَا فَتَرَ فَلْیَرْقُدْ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دوستونوں کے بیچ میں آڑی (عرض میں) ایک رسّی بندھی ہوئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ رسّی کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ زینب کی باندھی ہوئی رسّی ہے۔ ایک صحابیہ عورت تھیں جو بڑی عبادت گذار تھیں۔ لوگوں نے بتلایا کہ جب وہ نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہیں تو رسّی کو پکڑ لیتی ہیں؛ تاکہ کھڑے رہنے میں مدد ملے۔ گویا اس کو پکڑ کر اپنے آپ کو کھڑا رکھتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو کھول دو۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول بتلادیا کہ جب تک طبیعت میں تازگی، نشاط اور چُستی باقی رہے؛ وہاں تک عبادت کرو، جب تھک جاؤ تو کوئی زبردستی نہیں ہے کہ اس طرح رسّیاں باندھ کر اپنے آپ کو لگائے رکھو، بلکہ پھر آرام کرلو کیونکہ تھکنے کے بعد بھی اس طرح اپنے آپ کو زبردستی اسی میں لگائے رکھنا؛ یہ ایک طرح کا غلو تھا، اور غلو کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا ہے۔

دورانِ عبادت جب اونگھ آئے

عن عائشة رضی اللہ عنہا أَنّ رسولَ اللهِ ﷺ قال: اِذَا نَعَسَ أَحَدُکُمْ وَهُوَ یُصَلِّیْ فَلْیَرْقُدْ، حَتّٰی یَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ، فَاِنَّهٗ اِذَا صَلّٰی وَهُوَ نَاعِسٌ لَایَدْرِیْ لَعَلَّهٗ یَذْهَبُ یَسْتَغْفِرُ فَیَسُبَّ نَفْسَهٗ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی آدمی رات کے وقت نماز پڑھ رہا ہے یا اور کوئی عبادت کرر ہا ہے، اس دوران اونگھ آنے لگے اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں (کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے بھی اونگھ آتی ہے) تو اس کو سوجانا چاہیے، یہاں تک کہ نیند کی وجہ سے جو سُستی تھی؛ وہ ختم ہوجائے اور کچھ آرام مل جائے۔ اس لئے کہ اگر اونگھتے اونگھتے نماز پڑھے گا تو شاید وہ اپنے لئے مغفرت کی دعا کرنا چاہتا ہوگا اور اونگھ کی حالت میں دُعا کے بجائے بددُعا کے الفاظ اس کے منہ سے نکل جائیں گے اور اس کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اس لئے کہ اونگھ کی وجہ سے اپنے اوپر کنٹرول اور قابو تو رہتا نہیں، اور عبادت کا جو مقصد ہے؛ وہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اونگھ آرہی ہو اس کے باوجود بھی لگے ہوئے رہنا؛ یہ طریقہ غلو کا تھا، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

یہ یاد رہے

اس جگہ پر ایک اور بات ہے کہ یہ حکم اس آدمی کے لئے ہے جو اپنے نشاط کے اوقات میں عبادت کو ادا کرتا ہے اور نوافل میں ایسی صورت پیش آتی ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو فرض نماز پڑھنے کے لئے آتے ہیں تب بھی ان کو اونگھ آنے لگتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرض نماز چھوڑ دی جائے، بلکہ پھر تو ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ ایک بیماری ہے جس کا ہم کو علاج کرانا چاہیے۔ لہٰذا اپنے اس مرض کے علاج کی طرف توجہ کرے اور اس

کو دور کر کے ایسی شکل اختیار کرے کہ اللہ تعالیٰ کے فرائض اور احکام کی ادائیگی میں اس کا جی لگنے لگے، اور آئندہ ایسی سستی کی نوبت نہ آئے۔ ورنہ پھر تو لوگ اسی حدیث کو بہانہ بنا کر فرائض کو بھی چھوڑنے لگیں گے، حالانکہ کوئی بھی اس کی اجازت نہیں دے گا۔ یہ یاد رہے۔

آپ ﷺ کی نماز اور خطبہ

وعن أبی عبداللہ جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنْتُ أُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ ﷺ الصَّلَوَاتَ فَكَانَتْ صَلاَتُهُ قَصْداً، وَخُطْبَتُهُ قَصْداً. (قَصْداً أَیْ بَيْنَ الطُّوْلِ وَالْقِصَرِ)

حضرت جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا تو آپ کی نماز بھی درمیانی ہوتی تھی اور آپ کا خطبہ بھی درمیانی ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی نماز نہ بہت لمبی ہوتی تھی، نہ بہت مختصر۔ یہی حال خطبہ کا ہوتا تھا، نہ بہت طویل ہوتا تھا، نہ بہت مختصر ہوتا تھا؛ بلکہ درمیانی ہوتا تھا۔ یہاں اسی کو بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اُمت کے لئے نماز اور خطبات میں عملی طور پر بھی جو نمونہ پیش فرمایا؛ اس میں درمیانی شکل اختیار فرمائی۔

بھائی چارگی کا رشتہ بھی ہوتا ہے

وعن أبی جُحَيْفَةَ وھب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قَالَ آخَى النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ سَلْمَانَ وَأَبِي الدَّرْدَاءِ، فَزَارَ سَلْمَانُ أَبَا الدَّرْدَاءِ. فَرَأَى أُمَّ الدَّرْدَاءِ مُتَبَذِّلَةً. فَقَالَ: مَاشَأْنُكِ؟ قَالَتْ: أَخُوكَ أَبُو الدَّرْدَاءِ لَيْسَ لَهُ حَاجَةٌ فِي الدُّنْيَا. فَجَاءَ أَبُو الدَّرْدَاءِ، فَصَنَعَ لَهُ طَعَاماً. فَقَالَ لَهُ: كُلْ فَإِنِّي صَائِمٌ. قَالَ: مَاأَنَا بِاٰكِلٍ حَتّٰى تَأْكُلَ، فَأَكَلَ. فَلَمَّا كَانَ اللَّيْلُ ذَهَبَ أَبُو الدَّرْدَاءِ يَقُوْمُ. فَقَالَ لَهُ: نَمْ فَنَامَ، ثُمَّ ذَهَبَ يَقُوْمُ. فَقَالَ لَهُ: نَمْ. فَلَمَّا كَانَ آخِرُ اللَّيْلِ قَالَ سَلْمَانُ: قُمِ الْآنَ. فَصَلَّيَا جَمِيعاً. فَقَالَ

لَہٗ سَلْمَانُ: اِنَّ لِرَبِّکَ عَلَیْکَ حَقّاً، وَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقّاً، وَلِأَ ھْلِکَ عَلَیْکَ حَقّاً، فَأَعْطِ کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ. فَأَتٰی النَّبِیَّ ﷺ، فَذَکَرَ ذٰلِکَ لَہٗ. فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: صَدَقَ سَلْمَانُ.

حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے درمیان بھائی چارگی کا رشتہ کرادیا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے، تو وہاں حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپس میں دو دو کے درمیان تعلق قائم کرادیا تھا کہ یہ تمہارا بھائی ہے۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان بھی اور ایک موقعہ پر خود مہاجرین مہاجرین کے درمیان بھی حضور ﷺ نے اس طرح بھائی چارگی کا رشتہ قائم کرایا تھا۔ تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو بھی ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ آپ ﷺ کے قائم فرمائے ہوئے اس رشتہ کا وہ حضرات اتنا زیادہ لحاظ کرتے تھے کہ ایک دوسرے کی پوری خبر گیری کرتے، جیسے اپنے حقیقی بھائی کی خبر گیری کی جاتی ہے۔

چنانچہ ایک مرتبہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب حضور ﷺ بھی تشریف فرما تھے، آپ کی وفات نہیں ہوئی تھی۔ جب حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، اس وقت حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ گھر پر نہیں تھے، ان کی اہلیہ ام درداء رضی اللہ عنہا بالکل معمولی لباس میں تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ شوہر کی موجودگی میں عورت کو جو اہتمام کرنا چاہیے؛ حضرت سلمان نے وہ بات ان میں نہیں دیکھی۔

﴿زینت کس کے لئے ہے؟﴾

اس لئے کہ عورت کو یہ حکم ہے کہ جب شوہر موجود ہو؛ اس وقت تو زینت کرے تا کہ

شوہر کا حق ادا ہو، اور شوہر کی غیر موجودگی میں عورت کو زینت کا لباس نہیں پہننا چاہیے۔ اور اگر کسی کام سے جب گھر سے باہر بھی جائے تو زینت کا لباس پہن کر نہ جائے بلکہ معمولی کپڑوں میں باہر نکلنا چاہیے، اور خوشبو بھی نہ لگائے۔

آج کل ہمارے معاشرے اور سماج میں معاملہ برعکس ہو گیا ہے کہ شوہر کے سامنے تو عورتیں زینت اختیار کرتی نہیں، اور کسی کے یہاں شادی میں جانا ہو، یا کسی تقریب میں جانا ہو؛ تو اس وقت خوب زینت اختیار کی جاتی ہے۔

حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: بے چارہ وہ شوہر؛ جس نے کتنے پیسے خرچ کر کے جوڑا سلوایا اور زیور بنوایا؛ وہ تو دیکھنے سے محروم ہی رہ جاتا ہے یعنی زینت کا سامان لانے کے لئے پیسے تو شوہر نے ہی دیئے، لیکن زینت کا فائدہ وہ تو اٹھاتا نہیں۔ حقیقت میں معاملہ برعکس ہو گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے جو آج کل نزاعات کی شکل میں دیکھنے ملتا ہے۔ حالانکہ شریعت نے تو اس کا خاص اہتمام کروایا تھا تاکہ یہ چیزیں پیش نہ آئیں۔

﴿شوہر کو اپنے گھر بھی اچانک پہنچنے کی اجازت نہیں﴾

دیکھئے! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کا حال آپ احادیث میں پڑھیں گے، اس سے عام تأثر یہ ملے گا کہ شوہر کی عدم موجودگی میں وہ عورتیں کبھی زینت نہیں کرتی تھیں۔ اسی لئے وہ حضرات غزوات سے یا کسی سفر سے واپس آتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو تاکید تھی کہ سیدھے گھر مت چلے جائیو۔ اس زمانہ میں خبر پہنچانے کے وہ وسائل اور آلات بھی نہیں تھے؛ جو اس زمانہ میں ہیں۔ اگر کسی طویل سفر سے واپس آرہے تھے تو وہاں ایسا تو تھا نہیں کہ ٹیلیفون کر دیا، یا ٹیلی گرام کر دیا، یا خط بھیج دیا کہ مَیں فلاں تاریخ کو فلاں وقت پر پہنچنے

والا ہوں۔ یہ بات تو وہاں ممکن ہی نہیں تھی، اور لمبے سفر سے ایک ایک مہینے، دو دو مہینے کے بعد آتے تھے اور اچانک ہی پہنچتے تھے، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے سیدھے گھر پہنچ جانے کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اجازت نہیں دی تھی۔

بخاری شریف میں بلکہ تمام کتبِ حدیث میں موجود ہے کہ حضور ﷺ کی طرف سے ان کو اس بات کی تاکید تھی کہ گھر مت جاؤ، بلکہ ابھی ٹھہر جاؤ؛ تاکہ گھر والوں کو اطلاع ہو جائے ﴿وَتَسْتَحِدَّ الْمُغِيْبَةُ [بخاری شریف ۲/۷۶۰]﴾ اور اگر عورت پراگندہ بال اور حال ہے تو وہ اپنے بال اور اپنا حال ٹھیک ٹھاک کرلے، جسم کو صاف کرلے اور نہا دھوکر زینت کا لباس پہن لے۔ ایسا حکم کیوں ہے؟ اس لئے کہ شوہر اگر اچانک پہنچ جائے گا تو عورت تو اس کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے عام لباس میں رہتی تھی، زینت کا اہتمام نہیں کرتی تھی، اور بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی شخصیت کو آپ زینت کے لباس میں دیکھیں تو اس کی وجہ سے جی خوش ہوتا ہے، اور عام لباس میں دیکھیں تو دل میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ تو چونکہ عام لباس میں دیکھنے کی وجہ سے یہ احتمال تھا کہ کہیں شوہر کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا نہ ہوجائے اس لئے یہ حکم دیا گیا تھا

﴿ اور یہاں تو قصداً ایسا ہوتا ہے ﴾

دیکھئے! نکاح کے رشتہ میں کسی بھی لائن سے ذرا سی بھی خرابی اور چوک پیدا نہ ہونے پائے، اس کا شریعت نے کتنا اہتمام کیا کہ عام لباس میں بیوی پر نظر پڑ جائے گی تو ہوسکتا ہے کہ بیوی شوہر کے دل سے اتر جائے، اس لئے حضور ﷺ نے فوراً گھر جانے کی اجازت نہیں دی بلکہ فرمایا کہ رات ٹھہر کر جانا؛ تاکہ اس کو اطلاع ہوجائے اور وہ کچھ تیاری کرلے، اب تم جاؤ گے تو وہ اس قابل ہو چکی ہے کہ تمہارے استقبال کے لئے تیار ہے اور اس صورت میں تم

اس کو دیکھو گے تو یہ ڈر اور اندیشہ نہیں رہا کہ وہ تمہاری نگاہ سے اور دل سے اتر جائے۔

تو دیکھئے! وہاں غیر اختیاری طور پر یہ چیز پیدا ہو سکتی تھی پھر بھی اتنا زیادہ اہتمام کروایا اور ہمارے سماج میں تو قصداً ایسا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں معاملہ اُلٹ گیا ہے، جیسا کہ مَیں کہا کرتا ہوں کہ عورتیں گھر میں قصداً عام لباس میں، میلے کچلے، پھٹے پرانے کپڑوں میں رہا کرتی ہیں، حالانکہ اس سے شریعت نے منع کیا ہے۔ وہاں کبھی کبھار ایسی صورت غیر اختیاری طور پر پیش آتی تھی، اس کی بھی پیش بندی کر دی گئی کہ ایسا نہ ہونے پائے، اور ہمارے معاشرہ میں قصداً ایسا کیا جاتا ہے، اور زینت والے لباس کو دوسروں کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔ معاملہ بالکل اُلٹ گیا ہے۔ شریعت کی تعلیمات کو ختم کر دیا گیا، اس پر عمل ہی نہیں ہو رہا ہے، جس کا نتیجہ ہم بھگت رہے ہیں۔

﴿خاص خاص ہدایات﴾

ویسے تو عورت کے لئے حکم یہ ہے ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ اپنے گھروں کے اندر رہو گھروں سے باہر نہ نکلو۔ قرآنِ پاک عورتوں کو خاص طور پر تاکید کرتا ہے کہ ان کو باہر نہیں نکلنا چاہیے، گھر ہی میں رہیں؛ لیکن اگر کسی ضرورت کی وجہ سے نکلنا پڑے؛ تو اس کے لئے بھی شریعت کی طرف سے خاص خاص ہدایات دی گئی ہیں کہ زینت کا لباس نہ ہو، خوشبو لگائے ہوئے نہ ہو، میلے کپڑے میں چادر اوڑھ کر نکلیں، راستہ کے کنارے چلیں۔ ان ہدایات کے ساتھ باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔ یہ صورت نہیں ہونی چاہیے کہ غیروں کے سامنے زینت کے ساتھ آئے اور شوہر کے سامنے عام سی صورت میں آئے۔

﴿ترکِ زینت پر مارنے کی اجازت﴾

اسی لئے شریعت نے جن جن چیزوں پر عورت کی پٹائی کرنے کی شوہر کو اجازت دی ہے؛ وہ چند ہی ہیں۔ اگر بیوی نماز نہیں پڑھتی ہے؛ تو مارنا چاہیے یا نہیں؟ تو اکثر علماء منع فرماتے ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کو سمجھایا تو جائے، تنبیہ بھی کی جائے؛ لیکن پٹائی نہ کی جائے۔ لیکن اگر بیوی شوہر کے لئے زینت نہیں کرتی؛ تو شوہر اس کی پٹائی کرسکتا ہے (مرقاۃ شرح مشکوۃ ۶/۲۷۳) اور اس کی وجہ بھی عرض کرتا چلوں کہ نماز تو اللہ تعالیٰ کا حق تھا اس لئے اس کو ادا کروانے کے لئے سمجھانے کی کوشش تو کرے؛ لیکن اس کے لئے پٹائی کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور زینت کرنا خود شوہر کا حق ہے کہ بیوی اس کے لئے زینت کرے۔

﴿......نگاہ غیر عورت پر نہیں اٹھے گی﴾

تو مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے معاشرے میں معاملہ اُلٹ گیا ہے، اس کے جو نتائج برپا ہورہے ہیں؛ وہ ہمارے سامنے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی آدمی کو گھر کے اندر پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہو؛ تو کبھی وہ دردر کی بھات نہیں کھائے گا۔ اگر عورتیں اس کا اہتمام کرلیں کہ وہ اپنے شوہر کے لئے خوب زینت کریں؛ تو کبھی اس کے شوہر کی نگاہ غیر عورت پر نہیں اُٹھے گی۔ شریعت نے جو زینت کا حکم دیا ہے؛ اس کی خاص مصلحت یہی ہے۔ اگر گھر میں شوہر کی وہ ضرورت پوری ہوجاتی ہے جو اس کی نگاہ ڈھونڈتی ہے کہ کوئی چیز دیکھنے کو ملے، اور اس کی بیوی اس کی اس ضرورت کو پورا کررہی ہے؛ تو پھر شوہر کاہے کو گھر کے باہر بھٹکتا ہوا اِدھر اُدھر مارا مارا پھرے گا۔ جب گھر میں اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی؛ تو پھر وہ جھانکتا پھرتا ہے۔

﴿دونوں پرابلم سول (Problem Solve)﴾

آج کل عام طور پر باہر نظریں اُٹھتی ہیں؛ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورتیں کوتاہی کررہی ہے، اس لئے عورتوں کو ان تعلیمات کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور مردوں کو اس پر عمل کروانے کی کوشش بھی کرنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب عورتیں میلے کچیلے کپڑوں میں باہر نکلیں گی؛ تو پرائے آدمی کو اس کی طرف دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، اُدھر سے بھی حفاظت ہوجائے گی۔ اور اِدھر آپسی حقوق کی ادائیگی کا بھی اہتمام ہوجائے گا۔ دونوں پرابلم سول (Problem Solve) ہوجائیں گے۔ معاملہ اتنا آسان ہے لیکن ہم نے ہی اس کو اُلجھادیا ہے۔

﴿آمدم برسرِ مطلب﴾

بہرحال! بات اس پر چل رہی تھی کہ حضرت سلمانِ فارسی رضی اللہ عنہ اپنے دینی بھائی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے لئے ان کے گھر پر پہنچے؛ تو ان کی بیوی کو دیکھا کہ وہ بالکل میلے کچلے لباس میں ہے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ کیا ابوالدرداء گھر پر نہیں ہیں؟ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، اس طرح کیوں رہ رہی ہو؟ انہوں نے کہا: آپ کے بھائی ابوالدرداء کو دنیا کی رغبت ہے ہی نہیں، وہ تو عبادت میں مشغول رہتے ہیں، دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے ہیں۔ گویا مَیں بھی دنیا ہی کا ایک حصہ اور فرد ہوں؛ اس لئے میری طرف بھی کچھ توجہ نہیں دیتے۔ انہوں نے اپنی بات اشارے میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو بتلادی اب حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ تو باہر تھے، جب وہ آئے تو دیکھا کہ مہمان آئے ہیں اور وہ بھی دینی بھائی؛ جن کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتۂ اخوت کرایا ہے۔ چونکہ وہ تو روزے سے

تھے لیکن مہمان کے لئے خصوصی طور پر کھانا بنوایا، اور کھانا پیش کر کے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا: کھایئے، میرا تو روزہ ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب تک آپ نہیں کھائیں گے؛ مَیں بھی نہیں کھاؤں گا، آپ پہلے کھایئے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کا روزہ تڑوایا، اس لئے کہ نفل روزہ تھا اور پہلے بتلا چکا ہوں کہ نفل روزہ مہمان کے لئے توڑ سکتے ہیں ﴿اَلضِّیَافَۃُ عُذْرٌ لِلضَّیْفِ وَلِلْمُضَیِّفِ﴾ میزبانی اور مہمانی دونوں عذر ہے۔

مثلاً ولیمہ کی دعوت آئی اور آپ کا روزہ ہے تو دعوت قبول کرنی چاہیے یا نہیں کرنی چاہیے؟ یہ ایک مسئلہ ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ دعوت ضرور قبول کیجیے اور اس کے یہاں جایئے، اور صاحبِ دعوت کو بتلا دیجیے کہ میرا روزہ ہے۔ اگر وہ راضی ہو جائے؛ تو ٹھیک ہے، دُعا کر دیجیے اور واپس آجایئے، لیکن اگر وہ کہے کہ آپ کو کھانا ہی پڑے گا؛ تو آپ روزہ توڑ سکتے ہیں اور بعد میں قضاء کرنی پڑے گی۔

یہ نفل روزہ کے بارے میں بتلا رہا ہوں (رمضان کا روزہ، واجب یا قضاء کے بارے میں نہیں) اسی طرح آپ کے یہاں کوئی مہمان آیا اور اس کے سامنے آپ نے کھانا پیش کیا اور آپ نے کہا کہ میرا تو روزہ ہے، اور وہ کہتا ہے کہ مَیں تو نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہیں کھائیں گے؛ تو اس مہمان کو کھلانے کے لئے آپ روزہ توڑنا چاہیں تو شریعت نے اس کی اجازت دی ہے اور جائز ہے، آپ کے لئے بعد میں قضاء ضروری ہے، یہ یاد رہے۔

﴿حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اصلاح کردی﴾

یہاں پر بھی یہی صورت ہوئی کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے - جو کہ مہمان ہیں - حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے - جو کہ میزبان ہیں - کہا کہ آپ جب تک نہیں کھائیں گے؛ مَیں بھی نہیں کھاؤں گا۔ کیونکہ وہ ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے کہ وہ غلو کی حد تک پہنچے ہوئے تھے

کہ روزانہ روزہ رکھ رہے ہیں اور رات بھر عبادت کر رہے ہیں، چنانچہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کھایا، اس لئے کہ ان کو مہمان کو کھلانا ہی تھا۔ پھر جب رات ہوئی تو عشاء کی نماز کے بعد حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے نماز کے واسطے مصلیٰ بچھایا تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت! اس وقت سو جاؤ۔ وہ نماز کے لئے ارادہ رکھتے تھے لیکن ان کو سونے کا حکم دیا، لہٰذا وہ سو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اٹھنا چاہا تو حضرت سلمان نے کہا: ابھی نہیں؛ اس وقت سو جاؤ، اور سلا دیا۔ جب رات کا آخری حصہ آیا - اور یہی مستحب اور مسنون طریقہ ہے - اس وقت حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اب اٹھو۔ ان کو اُٹھایا اور خود بھی اُٹھے اور دونوں نے تہجد پڑھی۔ عملی طور پر تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے سبق دے دیا تھا؛ پھر زبان سے بھی سمجھایا کہ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ اپنے رب کا بھی حق ہے لہٰذا کسی دن روزہ رکھو۔ اور جان کا بھی حق ہے اس لئے کسی دن روزہ نہ رکھو۔ اور گھر والوں کا بھی حق ہے کہ کچھ دیر ان کے ساتھ آرام کرو۔ لہٰذا ہر حق دار کا حق ادا کرو، کسی ایک ہی چیز میں لگے رہنا؛ یہ ایک طرح کا غلو ہے، جس کی شریعت میں اجازت نہیں دی جاتی۔ پھر اتنا ہی نہیں کیا؛ بلکہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قصہ بیان کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿صَدَقَ سَلْمَان﴾ سلمان نے سچ کہا یعنی ایسا ہی ہے۔ چونکہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روش غلو والی تھی اور ان کا طریقہ معتدل نہیں تھا؛ اس لئے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اس کی اصلاح کر دی۔

اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں دین پر عمل کا اہتمام نصیب فرمائے

أَلاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ

(عبادات میں درمیانی راہ)

مجلس ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً.

یہ معتدل طریقہ ہے

باب کا عنوان ہے کہ آدمی کو ہر کام میں درمیانہ روی اختیار کرنی چاہیے، اسی سلسلے میں پچھلے دو ہفتوں میں کچھ روایات پیش کی گئیں تھیں، آج بھی اسی سے متعلق روایتیں پیش کر رہے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ کو خبر دی گئی کہ مَیں یہ کہتا ہوں کہ جب تک زندہ رہوں گا؛ دن میں روزہ رکھوں گا اور رات بھر نماز پڑھوں گا جب نبی کریم ﷺ نے یہ سنا تو مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے یہ بات کہی ہے؟ مَیں نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مَیں نے ہی ایسا کہا ہے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم ایسا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یعنی اس طرزِ عمل کو زیادہ نباہ نہیں سکو گے؛ اس لئے ہمیشہ روزہ مت رکھا کرو بلکہ کبھی روزہ رکھو اور کبھی مت رکھو اسی طرح رات بھر نماز پڑھنے کا جو تم سوچتے ہو؛ اس پر بھی مداومت نہیں ہو سکے گی، اس لئے کچھ سو جایا کرو اور پھر اُٹھ کر نماز بھی پڑھو۔ اور ایسا کرو کہ ہر مہینہ میں تین دن روزے رکھا کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قاعدہ ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا دیا جاتا ہے، لہٰذا ہر ماہ تین

روزے رکھو گے تو اس پر تیس روزوں کا ثواب دیا جائے گا اور اسی طرح ہر مہینے رکھتے رہو گے؛ تو یہ ایسا ہی ہو جائے گا گویا پورے سال روزے رکھے۔ مَیں نے عرض کیا کہ جتنا آپ نے بتلایا، مَیں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر ایسا کرو کہ ایک دن روزہ رکھو اور دو دن ناغہ کر دو۔ مَیں نے عرض کیا کہ مَیں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر ایسا کرو کہ ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن افطار کر لیا کرو؛ یہ صومِ داؤد کہلاتا ہے۔ حضرت داؤد علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ یہی تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ اور روزے رکھنے کے اندر معتدل طریقہ یہی ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ روزے سب سے زیادہ افضل ہیں۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۴۶۶۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے عرض کیا کہ مَیں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس سے افضل روزے اور کوئی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر مَیں حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق تین روزے والی بات مان لیتا؛ تو یہ مجھے اپنے اہل و مال سے زیادہ محبوب ہوتا۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ مَیں نے سنا ہے کہ تم دن میں روزے رکھتے ہو اور رات بھر نماز پڑھتے ہو، کیا صحیح سنا ہے؟ مَیں نے کہا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو، بلکہ کبھی روزہ رکھو اور کبھی مت رکھو، کچھ سو جایا کرو اور پھر اٹھ کر عبادت کیا کرو۔ اس لئے کہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے؛ لہٰذا اس کو آرام بھی دیا کرو۔ اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے؛ لہٰذا کچھ دیر سو جایا کرو، اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، اگر دن میں روزہ رکھو گے؛ تو اس کے پاس نہیں جا سکو گے اور جب

رات بھر عبادت کیا کرو گے؛ تو اس کے حقوق کب ادا کرو گے؟ اس کے حقوق کی رعایت بھی ضروری ہے۔ اور تمہارے مہمانوں کا بھی تم پر حق ہے۔ عام طور پر جو ملاقاتی آتا ہے اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ میزبان بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک رہیں، اس کی وجہ سے اس کی مسرت اور خوشی میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور اس کی خوشی دوبالا ہوجاتی ہے۔

مَیں نے سختی کی؛ تو مجھ پر سختی کی گئی

﴿وَاِنَّ بِحَسْبِکَ أَنْ تَصُوْمَ مِنْ کُلِّ شَهْرٍ ثَلاثَةَ أَيَّامٍ﴾ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر مہینہ میں تین روزے رکھ لو؛ یہ تمہارے لئے کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر نیکی کا اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں دس گنا بدلہ ملتا ہے۔ جب تین روزے رکھو گے تو تیس روزوں کا ثواب ملے گا، گویا یوں سمجھا جائے گا کہ آپ نے ہمیشہ روزے رکھے۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں: ﴿فَشَدَدْتُ فَشُدِّدَ عَلَيَّ﴾ مَیں نے اپنے معاملہ میں سختی کی تو میرے ساتھ سختی کا معاملہ کیا گیا۔ یعنی میرے لئے نبی کریم ﷺ نے ایک بہترین اور آسان شکل پیش فرمائی تھی اور فرما دیا تھا کہ اس پر بھی ہمیشہ روزے رکھنے کا ثواب ملتا رہے گا، اس کے باوجود مَیں نے اس پر قناعت نہیں کی، اور آپ کی اس پیشکش کو قبول نہ کرتے ہوئے صاف انکار تو نہیں کیا لیکن مزید کا اصرار کیا، چنانچہ مَیں نے عرض کیا ﴿يَا رَسُوْلَ اللهِ! اِنِّیْ أَجِدُ قُوَّةً﴾ آپ تو مہینہ میں تین ہی روزے رکھنے کی اجازت مرحمت فرما رہے ہیں؛ مجھ میں تو اس سے زیادہ طاقت ہے، یعنی مَیں تو زیادہ روزے رکھ سکتا ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اچھا! حضرت داؤد علیہ السلام والا روزہ رکھو یعنی ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کرنا ﴿وَلَا تَزِدْ عَلَيْهِ﴾ اس سے زیادہ مت رکھنا۔

﴿دشواری پیدا ہوگئی﴾

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام والا روزہ کون سا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدھا سال۔ جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بوڑھے ہوگئے اس وقت کہا کرتے تھے ﴿یَالَیْتَنِیْ قَبِلْتُ رُخْصَۃَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم﴾ اے کاش! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کو مَیں نے منظور کرلیا ہوتا یعنی اس وقت قبول کرلیتا؛ تو آج اس بوڑھاپے میں میرے لئے دشواری نہ ہوتی

اس روایت کو لانے کا مقصد یہی ہے کہ دیکھو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً از خود جو طریقہ تلقین فرمایا تھا؛ اس میں جو اعتدال تھا وہ ایسا تھا جس کو وہ ہمیشہ آسانی کے ساتھ نباہ سکتے تھے۔ ویسے انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کر کے جو منظور کروایا اس کو بھی نبھایا، لیکن وہ خود فرماتے ہیں کہ میرے لئے بوڑھاپے میں دشواری پیدا ہوگئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا طریقہ وہ تھا جس میں بعد میں بھی کوئی دشواری پیدا نہ ہوتی۔ آگے اس کی مزید تفصیل ایک اور روایت میں آرہی ہے۔

﴿قرآنِ پاک ختم کرنے کی ترتیب﴾

چنانچہ دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم ہمیشہ روزے رکھتے ہو، پورے قرآنِ پاک کی ہر رات تلاوت کرتے ہو۔ مَیں نے کہا: جی ہاں! میرا مقصد تو اس سے نیکی حاصل کرنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت داؤد علیہ السلام والا روزہ رکھو، اس لئے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے تھے، اور مہینے میں ایک قرآن ختم کرو۔ مَیں نے کہا: اللہ کے رسول! مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا! بیس دن میں ایک قرآن ختم کرو۔ مَیں نے عرض کیا:

اللہ کے رسول! اس سے بھی زیادہ کی مجھ میں طاقت ہے۔ تو فرمایا: ہر دس دن میں قرآن ختم کرو۔ مَیں نے عرض کیا: اس سے بھی زیادہ کی مجھ میں طاقت ہے۔ تو فرمایا: اچھا! ہر سات دن میں قرآن ختم کرو؛ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔

﴿قرآنِ پاک کی سات منزلیں﴾

عام طور پر نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول یہی تھا کہ قرآنِ پاک کو سات دن میں ختم کیا کرتے تھے، اس لئے قرآنِ پاک میں جو سات منزلیں بنی ہوئی ہیں جس کا مجموعہ ہے ﴿فَمِیْ بِشَوْقٍ﴾ فؔ سے مراد ''الفَاتِحَة''، مؔ سے مراد ''المَائِدَة''، یؔ سے مراد ''یونس''، بؔ سے مراد ''بنی اسرآئیل''، شؔ سے مراد ''الشعرآء''، وؔ سے مراد ''الصّٰفّٰت'' اور قؔ سے مراد ''ق'' ہے۔ یہ سات منزلیں ہیں، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عام طور پر ان ہی سات منزلوں کے مطابق سات دن میں قرآنِ پاک ختم کرتے تھے، حضورِ اقدس ﷺ نے ان کو بھی یہی بات تلقین فرمائی کہ سات دن سے کم میں ختم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

﴿وہ مَیں نے منظور کر لی ہوتی﴾

﴿فَشَدَّدْتُ فَشُدِّدَ عَلَیَّ﴾ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھے ایک مہینہ میں ختم کرنے کے لئے فرمایا تھا لیکن مَیں بار بار اصرار کر کے سات دن تک لے آیا میرے اس کہنے پر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوا۔

اسی موقعہ پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا ﴿اِنَّکَ لَاتَدْرِیْ لَعَلَّکَ یَطُوْلُ بِکَ عُمُرٌ﴾ دیکھو! تمہیں معلوم نہیں! شاید تمہاری عمر طویل ہو جائے اور بوڑھاپے میں ان چیزوں کو نباہ نہ سکو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جو فرمایا تھا ایسا ہی ہوا۔ میری عمر

بہت طویل ہوئی، جب مَیں بوڑھا ہوا؛ تو مَیں نے اپنے دل میں تمنا کی کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے جو رخصت اور سہولت عطا فرمائی تھی؛ کاش! مَیں نے وہ منظور کر لی ہوتی۔

﴿ گھر کا بڑا حالات سے باخبر رہے ﴾

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ابا نے میرا نکاح ایک شریف گھرانہ کی عورت سے کرادیا ﴿وَكَانَ يَتَعَاهَدُ كِنَّتَهٗ﴾ اور وہ اپنی بہو کی یعنی میری بیوی کے حالات کی کبھی کبھی خبر لیا کرتے تھے، اس کو پوچھتے تھے۔

﴿يَتَعَاهَدُ﴾ کا معنٰی حالات پوچھتے تھے۔ یہاں پر علماء نے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا گھر کا جو بڑا ہو، اس کو گھر کے حالات کی خبر رکھنی چاہیے اور پوچھتے رہنا چاہیے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ بیٹے کا نکاح کرادیا تو ایسا نہیں کہ نکاح کرا کر اطمینان سے بیٹھ گئے، بلکہ دیکھتا بھی رہے کہ بیٹا اس کی بیوی کا حق برابر ادا کر رہا ہے یا نہیں؟ اس میں کوئی کوتاہی تو اس کی طرف سے نہیں ہو رہی ہے۔

چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنی بہو (بیٹے کی بیوی) سے شوہر کے متعلق پوچھتے رہتے تھے۔ بہو جواب میں کہتی تھی ﴿نِعْمَ الرَّجُلُ مِنْ رَجُلٍ﴾ عبداللہ بڑے اچھے آدمی ہیں ﴿لَمْ يَطَأْ لَنَا فِرَاشًا وَلَمْ يُفَتِّشْ لَنَا كَنَفًا مُنْذُ أَتَيْنَاهُ﴾ بڑے عبادت گزار ہیں، دن بھر روزے رکھتے ہیں، رات بھر عبادت کرتے رہتے ہیں اور جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں کبھی بھی وہ ہمارے بستر پر تشریف نہیں لائے ہیں۔ بہو کو جو بات کہنی تھی؛ اس نے اچھے انداز میں اپنے خسر کو بتلادی۔

﴿ ......تو باپ ایسا کر سکتا ہے ﴾

ان کے والد نے یوں سوچا کہ ٹھیک ہے، راہ پر آجائیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر

پوچھا تو یہی جواب ملا۔ دوسری مرتبہ جب ایسا ہوا، تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ حضور اقدس ﷺ سے کیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑکا جب بڑا ہو، اور ایسا ہو کہ باپ کو خیال ہو کہ میں اس کے سامنے خود یہ بات کہوں اور اس معاملہ میں میں خود براہِ راست اس سے گفتگو کروں اور اس کو سمجھاؤں؛ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ بعض معاملے ایسے ہوتے ہیں کہ باپ کے علم میں ہوتا ہے اور وہ چاہتا بھی ہے کہ معاملہ درست ہو جائے، لیکن وہ براہِ راست دخل اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتا، تو ایسے معاملہ میں باپ کا دوسروں کو بیچ میں ڈالنا، خاندان کے جو بڑے لوگ یا ذمہ دار ہوں، اور لڑکا بھی جن کو بڑا سمجھتا ہو، ایسے لوگوں کو بیچ میں ڈالنا کیسا ہے؟ اس روایت سے معلوم ہوا کہ باپ ایسا کر سکتا ہے۔

چنانچہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کو پوری بات بتلادی کہ یہ صورت حال ہے کہ میں نے ان کا نکاح ایک شریف گھرانے کی عورت سے کرادیا، لیکن ان پر تو عبادت کا ذوق وشوق اتنا زیادہ سوار ہے اور عبادت کے اندر ایسے مشغول ہیں کہ بس! دن بھر روزہ رکھتے ہیں، رات بھر عبادت میں مشغول رہتے ہیں، بیوی کی تو کوئی خیر خیریت پوچھتے ہی نہیں۔ میں بارہا معلوم کر چکا ہوں لیکن ابھی تک حالات میں کوئی اصلاح اور درستگی نہیں آئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ﴿أَلْقِنِيْ بِهٖ﴾ اچھا! ان سے کہنا کہ مجھ سے ملیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آکر بتلادیا کہ حضور نے آپ کو بلایا ہے، اس لئے حضور ﷺ سے ذرا مل آنا۔

﴿ایسا مت کرو﴾

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا،

حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ معلوم ہوا ہے کہ تم روزے بہت رکھتے ہو، تمہارے روزوں کی ترتیب کیا ہے؟ مَیں نے کہا: مَیں تو روزانہ روزے رکھتا ہوں۔ حضور ﷺ نے کہا کہ اچھا! روزانہ قرآن کتنا پڑھتے ہو؟ مَیں نے کہا: روزانہ رات بھر میں پورا قرآن ختم کر لیتا ہوں۔ ظاہر ہے شروع رات سے آخر رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اب حضور ﷺ نے ان کو بتلایا کہ دیکھو! یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے، ایسا مت کرو؛ بلکہ مہینہ میں ایک قرآن ختم کرو۔ وہ کم کرتے کرتے سات دن پر آئے، چنانچہ اخیری عمر کے اندر وہ منزل جو رات کو پڑھنا ہوتی تھی، دن میں اپنے گھر میں کسی کو سنایا کرتے تھے تاکہ رات کو پڑھنا آسان ہو جائے۔

﴿ایسا کرتے تھے﴾

اور ایک دن روزہ، ایک دن افطار جو خود انہوں نے ہی اپنے سر لیا تھا اور حضور ﷺ سے اصرار کر کے منظور کروایا تھا؛ آخری عمر میں بوڑھاپے کی وجہ سے اس کی پابندی نہیں ہو پاتی تھی۔ اس لئے ایسا کرتے تھے کہ جب طبیعت ذرا کمزور ہوتی تو تین چار روز تک مسلسل افطار کرتے یعنی روزہ نہیں رکھتے، اس کے بعد پھر طبیعت ذرا ٹھیک ٹھاک ہو جاتی؛ تو تین چار روز تک مسلسل روزہ رکھ لیا کرتے، تاکہ ایک دن روزہ، ایک دن افطار والا حساب برابر (Balance) ہو جائے۔ اور اب وہ تمنا بھی کرتے تھے کہ کاش! حضور ﷺ کی دی ہوئی سہولت کو مَیں منظور کر لیتا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کام فرض اور واجب تو تھے نہیں، یعنی انہوں نے نبی کریم ﷺ سے گفتگو کر کے عرض کیا تھا اور انہی کے اصرار پر حضور ﷺ نے اجازت دی تھی، اب اگر وہ نہ بھی کرتے تو یہ کام تو نفل کا درجہ رکھتے تھے، کوئی اشکال اور گناہ تو تھا نہیں،

پھر کیوں یہ فرماتے ہیں کہ کاش! مَیں نے نبی کریم ﷺ کی دی ہوئی سہولت قبول کرلی ہوتی؟ آج بھی اختیار تھا، نہ کرتے تو کونسی پابندی تھی؟ اس کا جواب خود ہی دیتے ہیں ﴿کَرَاهِيَةَ أَنْ يَتْرُكَ شَيْئًا فَارَقَ عَلَيْهِ النَّبِیَّ ﷺ﴾

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک معمول یہ بھی تھا﴾

دیکھو! صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ایک معمول تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ دنیا سے جب تشریف لے گئے اُس وقت جو صحابی دینی اعتبار سے جس حال میں تھا (مطلب یہ ہے کہ عبادت، روزہ، نماز، تلاوت وغیرہ کا ان کا جو معمول تھا) اور حضورِ اکرم ﷺ ان کو عبادت کی جس حالت پر چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے؛ صحابہ اب یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اس میں کچھ کمی آوے۔

جیسے ایک آدمی اپنے گھر والوں کو جس حال پر چھوڑ کر جاوے، تو وہ یہی چاہتا ہے کہ اس میں کوئی کمی آنی نہیں چاہیے، ہاں! اگر اضافہ ہو؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ دنیا کے اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شریف آدمی جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کرتا ہے اور کوئی بات چیت طے ہو جاتی ہے، تو اس کی شرافت اور مروت اس بات کو چاہتی ہے کہ جو بات ہوئی ہے اس میں کمی نہ ہو۔ جیسے آپ نے کسی کو کہا کہ ہر مہینہ آپ کو دس روپیہ دیا کروں گا، اب آپ نے جس وقت وعدہ کیا تھا اس وقت آپ کی آمدنی اور آپ کی کمائی اس کی متحمل تھی، پھر بعد میں کمائی اتنی نہیں رہی پھر بھی ایک شریف آدمی سوچتا ہے کہ مَیں نے کہہ دیا ہے، وہ منتظر رہتا ہے، تو آپ کبھی اس میں کمی نہیں کرتے، حالانکہ یہ کوئی فرض اور واجب نہیں تھا۔ آپ چاہتے تو یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ پہلے مَیں نے اپنی کمائی کے اعتبار سے آپ سے وعدہ کیا تھا، آج

میری کمائی اس کی متحمل نہیں ہے؛ اس لئے مَیں یہ سلسلہ ختم کرتا ہوں، اس میں شرعی طور پر بھی گناہ نہیں مگر ایک آدمی شرافت کے پیشِ نظر ایسا نہیں کرتا۔

اسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو دینی اعتبار سے جس حال پر چھوڑا (کہ ان حضرات کے نماز روزہ تلاوت وغیرہ کے جو معمولات تھے) اس میں کوئی کمی آئے۔ گویا وہ یوں سوچتے تھے کہ کل کو جب نبی کریم ﷺ سے میدانِ حشر میں ملاقات ہوگی- اور ہم کو آپ ﷺ نے جس حال میں چھوڑا تھا اگر اس میں ہم نے کمی کی- تو کیا منہ دکھائیں گے۔ یہ ان کا خاص مزاج تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اسی لئے تمنا کیا کرتے تھے کہ وہ سہولت قبول کر لی ہوتی تو آج اس کے مطابق آسانی سے کام چلتا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جس مقصد کے لئے یہ باب قائم کیا تھا کہ میانہ روی اختیار کرو اگر میانہ روی اختیار کروگے؛ تو آگے جا کر کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی اور آپ نے اپنے لئے ایک راہ جو پہلے سے پسند کی ہے؛ اس راہ پر آسانی سے چل سکوگے۔

﴿حضرت حنظلہ نامی دو صحابی ہیں﴾

وعن أَبِی رِبْعِیٍّ حنظلةَ بْنِ الرَّبِیْعِ الْأُسَیِّدِیِّ الْکَاتِبِ أَحَدِ کُتَّابِ رَسولِ اللہِ ﷺ قَالَ: لَقِیَنِی أَبُوْبَکْرٍ رضی اللہ عنہ. فَقَالَ: کَیْفَ أَنْتَ یَاحَنْظَلَةُ؟ قُلْتُ: نَافَقَ حَنْظَلَةُ. قَالَ: سُبْحَانَ اللہِ مَاتَقُوْلُ؟ قُلْتُ: نَکُوْنُ عِنْدَرَسُوْلِ اللہِ ﷺ یُذَکِّرُنَابِالْجَنَّةِ وَالنَّارِ کَأَنَّارَأْیَ عَیْنٍ، فَإِذَاخَرَجْنَا مِنْ عِنْدِرَسُوْلِ اللہِ عَافَسْنَاالْأَزْوَاجَ وَالْأَوْلَادَوَالضَّیْعَاتِ نَسِیْنَاکَثِیْراً. قَالَ أَبُوْبَکْرٍ رضی اللہ عنہ: فَوَاللہِ اِنَّا لَنَلْقٰی مِثْلَ ھٰذَا. فَانْطَلَقْتُ أَنَاوَأَبُوْبَکْرٍحَتّٰی دَخَلْنَاعَلٰی رَسُوْلِ اللہِ ﷺ فَقُلْتُ: نَافَقَ حَنْظَلَةُ یَارَسُوْلَ اللہِ! فَقَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ وَمَاذَاکَ؟ قُلْتُ: یَارَسُوْلُ اللہِ! نَکُوْنُ عِنْدَکَ، تُذَکِّرُنَا

بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ كَأَنَّا رَأْیَ عَیْنٍ، فَإِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِکَ عَافَسْنَا الْأَزْوَاجَ وَالْأَوْلَادَ وَالضَّیْعَاتِ نَسِیْنَا کَثِیْراً. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ تَدُوْمُوْنَ عَلیٰ مَا تَکُوْنُوْنَ عِنْدِیْ، لَصَافَحَتْکُمُ الْمَلَآئِکَةُ عَلیٰ فُرُشِکُمْ وَفِیْ طُرُقِکُمْ، وَلٰکِنْ یَاحَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً. ثلاث مرات

حضرت ابوربعی حنظلہ بن الربیع اسیدی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی وحی کے لکھنے والے لوگوں میں سے ایک تھے۔ دیکھو! ایک تو حنظلہ بن ربیع ہیں اور دوسرے ایک حنظلہ اور ہیں جو غسیلِ ملائکہ سے مشہور ہیں۔ غزوۂ احد کے واقعہ میں آتا ہے کہ ایک صحابی جن کا نام حضرت حنظلہ تھا، تازہ تازہ ان کا نکاح ہوا تھا، پہلی ہی رات تھی اور صبح میں حضورِ اکرم ﷺ کی طرف سے اعلان ہوا، بیوی سے صحبت کی تھی اور غسل کی نوبت بھی نہیں آئی تھی اسی حالت میں نکل پڑے، میدانِ جنگ میں پہنچے اور شہید ہوگئے، چونکہ حالتِ جنابت میں شہید ہوئے تھے اور فرشتوں نے ان کو غسل دیا؛ اس لئے ان کا لقب غسیلِ ملائکہ ہے یعنی وہ جن کو فرشتوں نے غسل دیا۔ لیکن اس روایت کے راوی دوسرے صحابی ہیں۔ بہت سے لوگ ایک سمجھ کر حدیث کی کتابوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

حکایاتِ صحابہ میں حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے یہ واقعہ ذکر کیا ہے، جس کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ کہا کہ حضرت حنظلہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد میں، بیوی بچوں میں جاتے ہیں اور یہاں بچوں کی نوبت ہی کہاں آئی، شادی کے پہلے ہی روز تو شہید ہوگئے تھے، پھر یہ کیسی بات ہوئی؟ حالانکہ وہ ایک الگ شخصیت ہیں اور یہ ایک الگ شخصیت ہیں۔ دونوں کو ایک سمجھ لیا گیا؛ اس لئے اعتراض پیدا ہوا۔ آدمی کو اعتراض اپنی ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، جب پوری بات سامنے آجاتی ہے تو وہ اعتراض آپ ہی آپ ختم ہوجاتا ہے۔

﴿کبھی یہ، کبھی وہ﴾

یہ حضرت حنظلہ بن ربیع رضی اللہ عنہ ان حضرات میں سے ہیں جو نبی کریم ﷺ کی وحی لکھنے کا کام کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری ملاقات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہوئی، انہوں نے مجھ سے پوچھا: اے حنظلہ! تمہارا کیا حال ہے؟ قلب کا حال اور دل کا معاملہ کیسا ہے؟ مَیں نے عرض کیا: حنظلہ تو منافق ہوگیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا ﴿سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاتَقُوْلُ؟﴾ تعجب کے موقع پر لفظ ''سبحان اللہ'' بولا جاتا ہے۔ تعجب ہے، سبحان اللہ! آپ کیا کہتے ہیں؟ منافق ہوگیا، منافق ہونا تو بہت بری بات ہے، یعنی کفر کی ایک بہت بری قسم ہے، تم مؤمن ہوکر یوں کہتے ہو کہ مَیں منافق ہو گیا، یہ کیسی بات ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ دیکھو! نفاق کا مطلب تو یہی ہے نا کہ آدمی ایک حال پر نہ رہے۔ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ۔ مَیں بھی جب اپنے حالات دیکھتا ہوں؛ تو یہی خطرہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے مَیں تو ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ آپ ہی بتاؤ! ہم لوگ جب نبی کریم ﷺ کی مجلس میں اور آپ کی صحبت میں موجود اور حاضر ہوتے ہیں اور نبی کریم ﷺ ہم کو جب وعظ ونصیحت فرماتے ہیں، جنت اور جہنم کا تذکرہ فرماتے ہیں؛ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنت اور جہنم ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

ظاہر ہے نبی کریم ﷺ کی مجلس کا حال کیا ہوگا۔ آج جب بعض اہل اللہ کا یہ حال ہے کہ ان کی مجالس میں ہم بیٹھتے ہیں؛ تو دنیا کی طرف سے دل سرد ہو کر آخرت ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، تو حضور اکرم ﷺ کی مجلسِ بابرکات میں تو ظاہر ہے جنت اور جہنم کو آدمی اگر اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہو؛ تو اس میں کوئی اشکال نہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام یہی تو تھا۔

خیر!انہوں نے یہی کہا کہ جب حضور ﷺ کی مجلس میں ہوتے ہیں اور آپ نصیحت فرماتے ہیں، جنت اور جہنم کا تذکرہ کرتے ہیں؛ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے، کاروبار سے دل بالکل اُٹھ جاتا ہے، پھر حضور ﷺ کی مجلس سے اُٹھ کر جب گھر آتے ہیں، اور اپنے کاروبار میں، کھیتی باڑی اور تجارت میں مشغول ہوتے ہیں؛ تو بہت سی باتیں جو نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ہماری نگاہوں کے سامنے ہوتی تھیں؛ ان میں کی بہت سی ہم بھول جاتے ہیں یعنی وہ کیفیت باقی نہیں رہتی بلکہ اس میں فرق آجاتا ہے۔

ایک آدمی دینی مجلس میں ہو؛ اس وقت قلب کی کیفیت اور ہوتی ہے، اور اپنی تجارت میں دوکان پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے؛ اس وقت دل کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ آج بھی جب یہ باتیں محسوس ہوتی ہیں، تو ان حضرات کا مقام تو بہت اونچا تھا، اس لئے وہ اس کو بہت صاف طریقہ سے محسوس فرماتے تھے، حالانکہ وہ حضرات بیوی بچوں میں رہتے تھے؛ تب بھی کوئی غفلت کی نوبت آتی نہیں تھی لیکن نبی کریم ﷺ کی مجلس میں رہ کر جو کیفیت ہوتی تھی؛ وہ تو باقی نہیں رہتی تھی، اس میں تو کچھ نہ کچھ کمی آہی جاتی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب ان کی یہ بات سنی تو کہا بھائی! ہمارا بھی یہی حال ہے، اگر اسی کا نام نفاق ہے؛ تو پھر یہی کیفیت میری بھی ہے یعنی حضور ﷺ کی مجلس میں ہوتے ہیں اس وقت بات الگ ہوتی ہے اور جب ہم اپنی تجارت میں اور گھر میں جا کر بیوی بچوں میں مشغول ہوتے ہیں؛ تو دل کی وہ کیفیت نہیں رہتی، لہٰذا اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی اپنا فکر لاحق ہوا۔

حضرت حنظلہ فرماتے ہیں کہ مَیں اور حضرت ابوبکر اپنی مشکل لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چنانچہ وہاں جا کر حضرت حنظلہ نے ہی بات شروع کی اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ کیوں ایسی بات کررہے ہو؟ مَیں نے وہی بات جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کہی تھی؛ پھر دہرائی۔ اس کو سن کر حضور ﷺ نے فرمایا ﴿وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْتَدُوْمُوْنَ عَلٰی مَاتَکُوْنُوْنَ عِنْدِیْ، لَصَافَحَتْکُمُ الْمَلَآئِکَۃُ عَلٰی فُرُشِکُمْ وَفِیْ طُرُقِکُمْ، وَلٰکِنْ یَاحَنْظَلَۃُ سَاعَۃً وَسَاعَۃً﴾ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے؛ اگر ہمیشہ تم اسی حالت میں رہو، جس حالت میں میری مجلس میں اور میرے سامنے ہوتے ہو، اور اس وقت تمہارے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے؛ وہی کیفیت اگر چوبیس گھنٹے اور ہمیشہ رہے؛ تو پھر تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں پر فرشتے تم سے آکر مصافحہ کریں گے، لیکن یاد رکھو! کبھی یہ، کبھی وہ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ایک حالت پر رہ نہیں سکتا، اس کی فطرت کا تقاضہ بھی ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آتی رہے؛ تب ہی اس کے مزاج میں اعتدال باقی رہے گا۔ اگر وہ چوبیس گھنٹے اسی طرح رہے، تو پھر بات نہیں بنے گی۔

﴿ بر پشتِ پائے خود نہ بینم ﴾

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا۔ آپ حضرات کو قصہ تو معلوم ہی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائی لے گئے تھے اور کنوئیں میں ڈال دیا تھا، پھر وہاں سے قافلے والے نکال کر لے گئے اور مصر کے حاکم کے ہاتھ بیچ دیا، وہاں رہے، یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی یاد میں تڑپتے اور روتے رہے یہاں تک کہ ان کی بینائی بھی ختم ہوگئی، پھر بھی اخیری زمانہ میں جب دوسرے

بیٹے بنیامین بھی گم ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں سے کہا کہ جاؤ اور ان دونوں کو ڈھونڈو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو ملا دے، حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو بھولے نہیں تھے، وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ خیر! وہ سب بھائی گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی مل گئے، اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے ان بھائیوں کو اپنا کرتہ دیا کہ جاؤ! اور والد صاحب کے چہرہ پر ڈال دینا، جس سے ان کی بینائی واپس آجائے گی۔ قرآنِ کریم میں یہ پورا قصہ موجود ہے، جس وقت یہ قافلہ مصر سے کرتہ لے کر نکلا اور ابھی کنعان پہنچا بھی نہیں تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کہنے لگے کہ مجھے تو یوسف کے کرتہ کی خوشبو آرہی ہے۔

تو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

زمصرش بوئے پیراہن شنیدی ❁ چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

تم نے مصر سے ان کے کرتہ کی خوشبو محسوس کرلی، اور شروع میں جب بھائیوں نے ان کو یہاں قریب ہی کنویں میں ڈال دیا تھا؛ اس وقت آپ کو پتہ بھی نہیں چلا؟ اُس وقت تو یہاں اپنی بستی کے قریب ہی صحرا کے کنوئیں میں ڈالا تھا، کہیں دور بھی نہیں تھے اور اِس وقت تو بہت دور ہیں۔ اور اُس وقت تو خود حضرت یوسف علیہ السلام ہی یہاں تھے، اس وقت تو آپ کو پتہ بھی نہیں چلا، اور اب وہاں سے کرتہ کی خوشبو آگئی؛ کیا بات ہے؟ تو جواب میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو بات کہی، وہ یہ ہے:-

بگفت احوالِ ما برقِ جہان است ❁ دمے پیدا و دیگر دم نہان است

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم ❁ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اگر درویش بر حالے بماندے ❁ سرِ دست از دو عالم برفشاندے

(گلستاں، ص۴۷۔ حکایت ۹)

ہمارے حالات تو کوندنے والی بجلی جیسے ہیں کہ پل بھر میں چمکتی ہے اور پھر پل بھر میں اندھیرا ہوجاتا ہے۔اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ملاءِ اعلیٰ پر پہنچ جاتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کے پاس کیا ہے اس کا بھی ہم کو پتہ نہیں چلتا۔ پھر کہا: بھائی دیکھو! اگر سالک ایک ہی حالت پر رہتا تو دونوں جہاں سے ہاتھ دھولیتا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے۔ چونکہ انسان کے اوپر بیوی بچوں کے بھی حقوق رکھے ہیں، اگر یہ بات نہ ہوتی؛ تو پھر بیوی بچوں کے حقوق کون ادا کرتا۔ اگر ہر وقت وہی کیفیت رہتی، گھر جانے کے بعد بھی اور دوکان پر جانے کے بعد بھی؛ تو پھر کون دکانداری کرتا، اور کون تجارت کرتا، کون بیوی بچوں کے حقوق ادا کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو بنایا ہی اس انداز سے ہے کہ اس کی فطرت میں یہ ساری چیزیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرسکے؛ اس کا بھی ایک جذبہ رکھا۔ بیوی بچوں کا حق بھی ادا کرسکے؛ اس لئے کچھ ان کی محبت بھی ڈال دی۔ اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿ساعةً وساعةً﴾ اے حنظلہ! کبھی یہ، کبھی وہ۔ یہ ہے تب ہی انسان قائم ہے، اگر ایک حالت پر رہے تو پھر انسان جی نہیں سکتا۔

﴿حاصل کلام﴾

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی میانہ روی اختیار کرے۔ یہ نہیں کہ بیوی بچوں میں ایسا پھنس گیا کہ بھول کر بھی اللہ کا نام نہیں لیتا، جیسا کہ آج کل ہم کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ ادھر ایسے مشغول ہوگئے کہ بیوی بچوں کے حق ضائع ہو رہے ہیں، اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ شریعت نے تو معتدل راستہ بتایا ہے۔

﴿منت کس چیز کی صحیح ہوتی ہے؟﴾

عَنِ ابْنِ عَبَّاس رضی اللہ عنہ قَالَ: بَیْنَمَا النَّبِیُّ ﷺ یَخْطُبُ اِذَا هُوَ بِرَجُلٍ قَائِمٍ. فَسَأَلَ عَنْهُ فَقَالُوا: أَبُوْ اِسْرَائِیْلَ نَذَرَ أَنْ یَّقُوْمَ فِی الشَّمْسِ وَلَا یَقْعُدَ وَلَا یَسْتَظِلَّ وَلَا یَتَكَلَّمَ وَیَصُوْمَ. فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: مُرُوْهُ فَلْیَتَكَلَّمْ وَلْیَسْتَظِلَّ. وَلْیَقْعُدْ وَلْیُتِمَّ صَوْمَهُ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے، اس دوران ایک آدمی کو دیکھا کہ دھوپ میں کھڑا ہے، آپ نے پوچھا: بھائی! کیا بات ہے، وہ وہاں دھوپ میں کیوں کھڑا ہے؟ بتلایا گیا کہ یہ ابو اسرائیل ہے، جنہوں نے نذر اور منت مانی ہے کہ دھوپ میں ہی رہیں گے، کبھی چھاؤں میں نہیں جائیں گے، اور کھڑے ہی رہیں گے، بیٹھیں گے نہیں، اور خاموش ہی رہیں گے، کسی سے بات نہیں کریں گے، اور ہمیشہ روزہ ہی رکھیں گے حضور ﷺ نے فرمایا ﴿مُرُوْهُ فَلْیَتَكَلَّمْ﴾ ان سے کہو؛ بات کریں ﴿وَلْیَسْتَظِلَّ﴾ اور سائے میں بھی آویں ﴿وَلْیَقْعُدْ﴾ کھڑے نہ رہیں؛ بلکہ بیٹھ جائیں ﴿وَلْیُتِمَّ صَوْمَهُ﴾ ہاں! البتہ روزہ رکھیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دیکھو! منت کس چیز کی صحیح ہوتی ہے؟ جو مسائل جانتے ہیں ان کو معلوم ہے اور یہاں علماء بھی موجود ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ جو چیز عبادت کے قبیل سے ہو، یعنی ایسی عبادت جو اللہ تعالیٰ نے فرض کر رکھی ہو، اسی کی جنس کی کسی چیز کی کوئی آدمی منت مانے؛ تو وہ منت صحیح ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اتنی رکعات نماز پڑھوں گا، یا اتنا صدقہ کروں گا یا حج کروں گا۔ یہ ساری وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے، روزے فرض کیے ہیں، نماز فرض کی ہے، زکوٰۃ کی شکل میں مال نکالنا فرض کیا ہے؛ تو ایسی کسی چیز کی منت مانی جا سکتی ہے۔

اور اگر ایسی چیز کی منت مانی جس کے قبیل کی کوئی عبادت فرض نہیں ہے، تو پھر وہ منت صحیح نہیں ہوتی۔ مثلاً کوئی آدمی یوں کہے کہ میرا فلاں کام ہوگیا؛ تو مَیں دھوپ میں دو گھنٹے تک کھڑا رہوں گا۔ تو دھوپ میں کھڑا رہنا کوئی عبادت نہیں ہے، اس لئے آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ دھوپ میں کھڑے رہنے کی ضرورت نہیں، سائے میں آ جائیں۔

یا مثلاً کسی نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہوگیا تو مَیں کسی سے بات نہیں کروں گا، تو کسی سے بات نہ کرنا کوئی عبادت نہیں ہے؛ اس لئے یہ منت ماننا بھی صحیح نہیں ہے۔ اس سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ لیکن ایک چیز کے بارے میں فرمایا کہ روزہ پورا کرلو، اس لئے کہ ان کی وہ منت صحیح تھی۔ انہوں نے جو چار پانچ چیزوں کی منت مانی تھی؛ ان میں سے ایک ہی چیز صحیح تھی، باقی سب غلط تھیں، اس لئے وہ سب ختم کردیں۔

خلاصہ یہی نکلا کہ اعمال کے معاملہ میں آدمی کو میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ شروع ہی سے ایسا انداز لے کر چلے، جس پر آخر تک مداومت کر سکے اور وہ طریقہ وہی ہے: جو نبی کریم ﷺ نے عملی نمونہ کے طور پر ہم لوگوں کو بتلایا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں



سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلیٰ سَیِّدِنَامُحَمَّدٍالنَّبِیِّ الْاُمِّیِّ کَمَاتُحِبُ وَتَرْضٰی بِعَدَدِمَاتُحِبُ وَتَرْضٰی

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! ہم پر اپنا خصوصی فضل فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں اور سنتوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں

جاری کرنے کی توفیق عطا فرما۔نفس اور شیطان کی شرارتوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔اے اللہ! ہمارے بیماروں کوصحت کاملہ، عاجلہ، مستمرہ عطا فرما۔مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔پریشان حالوں کی پریشان حالی کودورفرما۔اے اللہ! روزی کے معاملہ میں جو پریشان ہیں ان کی پریشانیوں کودورفرما کرروزیوں میں برکت اورکشادگی پیدا فرما۔اے اللہ! کاروبار میں برکت عطا فرما۔حرام سے حفاظت فرما،حلال کا اہتمام نصیب فرما اے اللہ! ہماری تمام ضروریات کی اپنے خزانۂ غیب سے کفالت فرما،ہمیں کسی کامحتاج اور دست نگرنہ بنا۔اے اللہ! ہمیں تیری ذات عالی پراعتماداورتوکل کامل نصیب فرما۔اے اللہ! تیرے غیروں کی طرف سے ہماری نگاہوں کوہٹالے۔اے اللہ! ہمارے دلوں کوتیری ذات ہی کے اوپر،اورصرف تجھ ہی سے متعلق فرمادے۔نبی کریم ﷺ نے جتنی خیراور بھلائی تجھ سے مانگی ؛ وہ سب ہم کوعطا فرما۔اور نبی کریم ﷺ نے جن شروراور برائیوں سے پناہ چاہی ؛ ان سے ہماری حفاظت فرما۔

ربناتقبل منااِنک أنت السمیع العلیم وتب علینااِنک أنت التواب الرحیم

وصلّی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیرخلقہ سیدناومولٰنامحمدواٰلہ وأصحابہ أجمعین

برحمتک یاأرحم الراحمین

اَلْمُحَافَظَةُ عَلٰی الْأَعْمَالِ

اعمال کی پابندی

مجلس ﴿۱﴾

۱۵/جمادی الاخریٰ ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۸/اکتوبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُوْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰه اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:

فأعوذباللہمن الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِاللّٰهِ وَمَانَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَايَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ أُوْتُواالْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ

پابندی؛ اعتدال کی برکت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور عنوان قائم کیا ہے: ”الْمُحَافَظَةُ عَلىٰ الْأَعْمَالِ“ پچھلا عنوان یہ تھا کہ اعمال میں آدمی میانہ روی اور درمیانی راہ اختیار کرے اور اب یہ باب قائم کیا کہ اعمال کے اوپر مداومت، ہیشگی اور پابندی کرے۔ ویسے آدمی جب درمیانی راہ اختیار کرے گا تو اس کے نتیجہ میں آپ ہی آپ اس کو پابندی بھی نصیب ہوگی۔

عام طور پر آدمی جب غلو کرنے لگتا ہے یا افراط سے کام لیتا ہے تو پھر وہ پابندی نہیں کر پاتا، پچھلے باب میں اور اس باب میں یہی مناسبت ہے، اسی لئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب ”الجامع الصحیح“ میں اسی مناسبت سے باب کی ترتیب دی ہے۔ جہاں انہوں نے میانہ روی اختیار کرنے والا عنوان قائم کیا ہے اس کے بعد یہی عنوان ہے کہ آدمی اعمال کی پابندی اور اہتمام کرے۔

﴿دل میں قساوت پیدا ہونے کی ایک وجہ﴾

اس سلسلے میں قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ کیا ایمان والوں کے واسطے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے واسطے اور جو قرآنِ پاک اُترا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور گڑگڑائیں یعنی قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو چیزیں اور احکام اتارے ہیں اور جن چیزوں کے کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس کے سامنے اہل ایمان کے دل جھک جائیں اور اس کے لئے مطیع، فرمانبردار اور تابع بن جائیں؛ کیا یہ وقت نہیں آیا؟ اور ان لوگوں کی طرح نہ بن جائیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن اعمال کے کرنے کے لئے کہا گیا تھا ان اعمال کی بجا آوری میں انہوں نے پابندی سے اور محافظت سے کام نہیں لیا، بلکہ اس میں کوتاہی کرتے رہے اور ان پر ایک زمانہ گذر گیا، جس کے نتیجے میں ان کے دل سخت ہو گئے۔

یہاں خاص طور سے یہی بتانے کے لئے لائے ہیں کہ اہل کتاب پر ایک زمانہ ایسا گذرا کہ ان لوگوں نے اعمال کا جو اہتمام اور پابندی کرنی چاہیے؛ وہ پابندی نہیں کی اور وقت گذرتا رہا، جس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں قساوت اور سختی آ گئی اور اس کے بعد وہ راہِ ہدایت سے ہٹ گئے۔ اس آیت کے لانے کا مقصد یہی ہے کہ آدمی جب عبادات کے اندر کوتاہی اور سستی کرنے لگتا ہے اور اعمال میں پابندی سے کام نہیں لیتا اور پابندی نہ کرنے والا زمانہ جوں جوں طول پکڑتا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے قلب میں ایک قسم کی سختی پیدا ہو جاتی ہے۔

بزرگوں سے بھی سنا ہے کہ معمولات جب چھوٹ جائیں اور اس پر ایک زمانہ گذر جائے تو پھر دوبارہ بڑی مشکل اور بہت مشقت اٹھانے کے بعد مداومت نصیب ہوتی ہے۔ وہ اسی لئے کہ ایک زمانہ تک چھوڑنے کے نتیجے میں اس کے دل میں ایک طرح کی قساوت اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اس پر مداومت جلدی نصیب نہیں ہو پاتی۔

کسی معمول کو شروع کرنے کے بعد چھوڑنا مضر ہے

اس آیت کو لاکر اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا کہ آدمی جو بھی اعمالِ خیر اختیار کرے اس میں مداومت و ہمیشگی کرے۔ ایک تو فرائض ہیں، پنج وقتہ نمازیں رمضان المبارک کے روزے، زکوٰۃ کی ادائیگی اور جو جو چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض اور واجب کی گئی ہیں؛ ان کو تو انجام دینا ہی ہے، ان کو چھوڑنے کی صورت میں تو آدمی گنہگار رہوگا۔ لیکن ان کے علاوہ آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے، اس کی رضا مندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو نفل اعمال شروع کرے تو پھر ان پر پابندی بھی کرے۔ مثلاً اس نے ایک معمول بنالیا کہ روزانہ اشراق کی نماز پڑھے گا یا اوابین کا معمول بنالیا، یا تہجد کا معمول بنالیا، تو اگرچہ اوابین، اشراق، تہجد یا چاشت وغیرہ جتنی بھی نمازیں ہیں؛ یہ فرض اور واجب نہیں ہیں، لیکن جب اس نے ان اعمال کو شروع کیا تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب تک شروع نہیں کیا تھا تب تک تو کوئی حرج کی بات نہیں تھی، لیکن شروع کرنے کے بعد پھر ان کو چھوڑ دینا مضر ہے۔

یہ تو ایسا ہی ہے جیسے آپ کوئی درخت لگائیں، بیج ڈالیں یا اس کی (કલમ) قلم لگائیں اور اس کے بعد اس کو پانی دینا چھوڑ دیں، اس کی حفاظت کرنا چھوڑ دیں؛ تو وہ سوکھ

جائے گا اور ختم ہو جائے گا۔ یا تو درخت ہی نہ لگاتے، لیکن جب لگایا ہی ہے؛ تو اب اس کی طرف توجہ کرنا اور اس کی حفاظت کا اہتمام کرنا بہت ضروری ہے۔

﴿دوسری آیت﴾

اسی مناسبت سے دوسری آیت پیش کی ہے ﴿وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَّةَ ا بْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ اس سے پہلے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بھیجنے کا تذکرہ ہے، چند انبیاء کے نام لئے گئے ہیں، پھر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ہم نے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھیجا؛ جو مریم کے صاحبزادے ہیں اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بندوں کے واسطے ہدایتیں تھیں اور ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کی؛ نرمی اور مہربانی ڈال دی۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو پیروکار اور ان کے ماننے والے تھے اور ان پر ایمان لانے والے تھے؛ ان کے دلوں میں ہم نے نرمی اور شفقت کا جذبہ ڈال دیا۔

﴿رہبانیت کا پس منظر﴾

اور رہبانیت یعنی ترکِ دنیا۔ رہبانیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ جائز لذات؛ جن کو اختیار کرنے کی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجازت دی گئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور اس کو راضی کرنے کے لئے اور اس مقصد سے کہ ان جائز چیزوں کو اختیار کرنے کی صورت میں کہیں حدود سے تجاوز کرتے ہوئے آگے نہ نکل جائے، اس لئے وہ ان جائز لذات سے اپنے آپ کو بچاتا ہے؛ تو یہ رہبانیت ہے۔

امم سابقہ میں خاص کر نصاریٰ کے اندر رہبانیت کا رواج پڑ گیا تھا اور اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب ان کے بادشاہوں میں اور پھر بادشاہوں کی دیکھا دیکھی رعایا کے اندر جو لوگ اہلِ ثروت اور مال و دولت والے تھے؛ ان کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اور اس کی نافرمانی کا سلسلہ شروع ہوا، تو ان میں جو لوگ اللہ کے مطیع اور فرمانبردار تھے، انہوں نے نافرمانوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے روکنے کے لئے ان کا مقابلہ کیا اور قوت سے کام لیا، لیکن چونکہ نافرمانوں کے پاس قوت اور طاقت تھی اور ان کی تعداد بھی زیادہ تھی، لہٰذا جو لوگ ان کو نافرمانیوں سے روکنے کے لئے میدان میں آئے ان کو ان نافرمانوں نے قتل کر دیا۔

اس کے بعد پھر ایک دوسری جماعت پیدا ہوئی جنہوں نے قوت سے روکنے کے بجائے انہیں کے درمیان میں رہتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کو بجالانے کا اور اس کی خلاف ورزیوں اور نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا، اور ساتھ ہی ساتھ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑتے تھے اور نافرمانیوں میں مبتلا تھے؛ ان کو قوت سے نہیں بلکہ زبان سے روکنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان نافرمان لوگوں نے اس کو بھی برداشت نہیں کیا اور حکومت وطاقت اور مال ودولت کے نشہ میں آکر ایسے لوگوں کو بھی قتل کر دیا۔

اس کے بعد پھر جو لوگ آئے انہوں نے دیکھا کہ ان کے درمیان رہتے ہوئے زبان سے بھی ان کو روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا مشکل ہے، اس لئے کہ یہ لوگ قتل کر دیتے ہیں، تو پھر انہوں نے ایک صورت یہ اختیار کی کہ چلو! لوگوں سے کٹ کر جنگلوں میں اور پہاڑوں کے اوپر چلے جائیں اور وہاں جا کر دنیا کی ساری چیزیں چھوڑ چھاڑ دیں،

بیوی بچوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو سارے سماج اور معاشرے سے الگ کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے اندر مشغول کر لیں؛ تا کہ ان کے درمیان میں رہ کر برائیوں میں پھنسنے کی بھی نوبت نہ آئے، اور جب الگ رہیں گے تو ان کی طرف سے جو اندیشہ اور خطرہ لاحق تھا اس سے بھی اپنے آپ کو بچالیں گے۔ یہ جو تیسرا گروہ پیدا ہوا انہوں نے یکسوئی اور تنہائی اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اہتمام کرنے ہی کے لئے اپنے آپ کو الگ کیا؛ اسی کو رہبانیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿اسلام میں رہبانیت نہیں ہے﴾

اسلام میں تو رہبانیت کے نظریہ کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ﴿لاَ رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ (مسند احمد ۶/۲۲۶)﴾ اسلام کے اندر رہبانیت نہیں ہے، بلکہ جہاد کو رہبانیت سے تعبیر کیا گیا ہے (مسند احمد ۳/۸۴) آدمی جب جہاد میں جاتا ہے تو اپنے سارے مشاغل و دنیاداری چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکلتا ہے، گویا جہاد میں آدمی اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے لئے ممنوع ٹھہرادیا کرتا ہے۔

﴿حلال کو استعمال نہ کرنے کی شکلیں اور ان کا حکم﴾

ویسے اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزیں اگر کوئی آدمی اپنے اوپر حرام کر لے اور اس کے استعمال سے اپنے آپ کو روکنے لگے تو اس کے اندر تفصیل ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ عقیدے کے طور پر اس چیز کو حرام سمجھتا ہے۔ لہٰذا اگر اس حرام کی ہوئی چیز کا حلال ہونا کسی نصِ قطعی سے ثابت ہے اور وہ عقیدے کے اعتبار سے اس کو حرام ٹھہراتا ہے؛ تو اسلام میں باقی ہی نہیں رہے گا، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دینا کفر ہے۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ عقیدے کے اعتبار سے تو وہ اس کو حلال سمجھتا ہے، لیکن عملی طور پر اس نے اپنے آپ پر اس کو حرام کرلیا؛ تو یہ بھی گناہ ہے، اس لئے کہ قرآن پاک کے اندر اس سے بھی منع کیا گیا ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پاک اور حلال ٹھہرائی ہیں ان پاکیزہ چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ کرلو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی حلال چیز کے استعمال میں آدمی کے لئے کوئی دینی یا دنیوی نقصان ہے اور اپنے آپ کو اس نقصان سے بچانے کے لئے اس سے پرہیز کرتا ہے۔ مثلاً کوئی بیماری ہوگئی، اور طبیب، ڈاکٹر یا معالج نے مشورہ دیا کہ فلاں چیز کا استعمال نہ کیجیے، نمک استعمال نہ کیجیے، شکر استعمال نہ کیجیے، گوشت استعمال نہ کیجیے، تو نمک، شکر اور گوشت اپنی جگہ پر حلال چیزیں ہیں لیکن چونکہ اس کے استعمال کے نتیجے میں ہم اپنی بیماری کی وجہ سے مزید نقصان میں پڑ جائیں گے، لہٰذا اپنے آپ کو جسمانی ضرر سے بچانے کے لئے اگر آدمی ان چیزوں کو استعمال نہیں کرتا؛ تو اس صورت میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔

بہت سی چیزوں کا استعمال کرنا جس طرح جسمانی بیماری کے اندر مضر ہوتا ہے، اسی طرح کبھی روحانی بیماری کے اندر بھی نقصان دہ ہوتا ہے، مثلاً ایک آدمی کی طبیعت میں شہوت کا غلبہ ہے اور ابھی نکاح کا بھی انتظام نہیں ہوا اور اس کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر مَیں گوشت کھاؤں گا تو طبیعت میں مزید انتشار پیدا ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ مَیں زنا کاری اور بدکاری میں مبتلا ہوجاؤں، لہٰذا اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کی نیت سے اگر وہ گوشت نہیں کھا رہا ہے؛ تو اس کی گنجائش ہے۔

یا مثلاً لوگوں کے اندر مل جل کر رہے گا تو غیبت میں ابتلاء ہوجائے گا، جھوٹ میں

مبتلا ہو جائے گا، لوگوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے میں مبتلا ہونے کا ڈر ہے، اس لئے اپنے آپ کو لوگوں سے یکسو رکھتا ہے، ان کے ساتھ ملتا جلتا نہیں ہے؛ تو گنجائش ہے۔

بہر حال! دوسری صورت تو یہ ہوئی کہ حلال، مباح اور جائز چیز سے کسی جسمانی یا روحانی نقصان سے بچنے کی خاطر اپنے آپ کو بچاتا ہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

﴿یہ ایک طرح کا غلو ہے﴾

تیسری صورت یہ ہے کہ ایسی چیزیں جو مباحات کے قبیل سے ہیں اور نبی کریم ﷺ نے خود استعمال کر کے عملی طور پر امت کو بتلا دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی رخصتوں کی طرف توجہ دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے استعمال کرنے کی سہولتیں دی ہیں، پھر بھی کوئی آدمی ایسی چیزوں کے معاملہ میں اپنے آپ پر تشدد اور سختی کرتے ہوئے؛ سہولت کو اختیار کرنے کے بجائے کسی دشواری کے پہلو پر۔۔جس کو عزیمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔عمل کرے؛ تو یہ ایک طرح کا غلو ہے، اور اللہ تعالیٰ کو جس طرح یہ پسند ہے کہ اس کی عزیمت والے احکام پر عمل کیا جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں کو عملی جامہ پہنایا جائے، اور یہ آدمی نبی کریم ﷺ کے اس عمل کو جائز ٹھہرانے اور اس رخصت کو عملی طور پر بتلانے کے باوجود اس کو اختیار نہیں کرتا؛ جو ایک طرح کا غلو ہے، اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔

بہر حال! کسی جائز کو استعمال نہ کرنے کی یہ تین صورتیں ہیں، اس میں دوسری صورت جس میں وہ اپنے آپ کو جسمانی یا روحانی نقصان سے بچانے کے لئے اگر احتراز کرتا ہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

﴿مقاصد کو نظر انداز کر دینا برا ہے﴾

اس آیت میں یہی بتلایا ہے کہ وہ گروہ جس نے رہبانیت کو اپنی طرف سے ایجاد کیا تھا﴿مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ﴾ ہم نے ان پر اس کو لازم نہیں کیا تھا یعنی بنی اسرائیل کے اندر یہ تیسرا گروہ پیدا ہوا جنہوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم لوگوں کے درمیان میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا نہیں لاسکیں گے، اس لئے انہوں نے لوگوں سے دوری اختیار کی اور پہاڑوں کے اوپر یا جنگلوں میں جا کر یکسوئی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوئے اور وہ ساری چیزیں جو اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی تھیں اُن کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان پر لازم نہیں کیا تھا کہ تم یہ طریقہ اختیار کرو بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ شروع کر رکھا تھا۔

خیر! ان کے اگلے لوگ جنہوں نے اس کو شروع کیا تھا ان کی نیت تو یہی تھی کہ اس طریقہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی احکام کی بجا آوری چاہتے تھے اور معاشرے کی برائیوں سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے تھے، لیکن پھر بعد میں یہی سلسلہ آگے بڑھا اور دوسری نسلیں آتی گئیں، جنہوں نے اس رہبانیت والے طریقہ میں ان مقاصد کو نظر انداز کر دیا جن کے لئے شروع کیا تھا۔ خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا جوئی کو چھوڑ کر دنیا کو اپنا مقصود بنالیا اور پھر اس رہبانیت کا جو تقاضا تھا اس کو انجام نہیں دیا۔ اسی کو بیان فرمایا ہے: ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ اس کا جیسا خیال رکھنا چاہیے؛ ویسا خیال نہیں رکھا۔

اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ ایک ایسی چیز تھی جس کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے ارادے سے اپنے طور پر شروع کی تھی، اگر چہ ان کی نیت بخیر تھی لیکن چونکہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری نہیں کی گئی تھی ،اس لئے اس کے جو تقاضے تھے ان کو وہ پورے نہیں کر سکے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو چیز ایسی ہو جس کو شریعت نے جاری نہ کیا ہو،اور کوئی آدمی اس کو نیتِ خیر سے شروع کرے؛ تب بھی اس کے تقاضے کو وہ پورا نہیں کر سکے گا، آگے جا کر اس میں کوتاہیاں سرزد ہونے ہی والی ہیں۔

اس آیت کو لا کر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ان لوگوں نے رہبانیت والا طریقہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے شروع کیا تھا لیکن اس کو نباہ نہیں پائے اور اس کی پابندی نہیں کر سکے،اس پر ان کی برائی بیان کی گئی ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کوئی بھی نفل کام شروع کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ پابندی کے ساتھ اس کو نبھائے،اور عملی طور پر باقی و جاری رکھے،اس کو چھوڑ نہ دے۔

﴿یہ مناسب نہیں ہے﴾

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا﴾ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ تیسری آیت لائے ہیں کہ اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جس نے اپنے سوت کو بڑی محنت سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔اس آیت کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک عورت خفیف العقل تھی؛ جو دن بھر سوت کاتتی تھی اور پھر ہاتھ سے جو سوت تیار ہوتا تھا؛ شام کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھی، گویا اس نے اتنی محنت سے ایک چیز تیار کی اور پھر اپنے ہی ہاتھوں اس کو ضائع کر دیا۔اسی طرح جو آدمی کوئی عمل شروع کرتا ہے اور چند روز کرنے کے بعد پھر اس کو چھوڑ دیتا ہے؛ یہ بھی ایسا ہی ہے کہ بڑی محنت سے ایک چیز شروع کی اور اس کے بعد اپنے ہی ہاتھوں اس کو ضائع کر دیا۔باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ایسے مت بنو۔

چنانچہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب اہلِ ایمان کی طرف سے بعض اعمال میں کوتاہی کا صدور ہونے لگا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس آیت کے ذریعہ سے ان کو متنبہ کیا گیا کہ تم اپنے اعمال میں جو کوتاہی کررہے ہو؛ یہ مناسب نہیں ہے۔

﴿دمے فارغ مباش﴾

باری تعالیٰ کا ایک اور ارشاد نقل کیا ﴿وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَأْتِیَکَ الْیَقِیْنُ﴾ تم اپنے رب کی عبادت کرتے رہو؛ یہاں تک کہ موت آجائے۔"الیقین" یعنی موت۔ موت آنے تک تمہاری عبادت واطاعت کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی جو بھی عمل شروع کرے، چاہے وہ نفل کے قبیل سے ہی کیوں نہ ہو؛ شروع کرنے کے بعد اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ بلکہ آدمی اس پر پابندی کے ساتھ موت تک عمل کرتا رہے:

اندریں راہ می تراش وی خراش ❁ تا دم آخر دمے فارغ مباش

اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستہ میں آدمی کو تکلیف اور مشقت اٹھاتے ہی رہنا چاہیے اور آخری سانس تک آدمی کو فرصت اور اطمینان سے بیٹھنا نہیں چاہیے، گویا آدمی اپنے آپ کو موت تک اللہ کی اطاعت میں لگائے رکھے۔

وأما الأحاديث فمنها حديث عائشة رضی اللہ عنہا وكَانَ أَحَبُّ الدِّيْنِ مَادَاوَمَ صَاحِبُهُ عَلَيْهِ

احادیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث ہے جو پہلے بھی بتلا چکے ہیں کہ دین میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر آدمی مداومت، ہمیشگی اور پابندی کرے، آدمی ایک عمل شروع کرے اور پھر چھوڑ دے؛ یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔

کوئی معمول قضا ہوجائے تو کیا کرے؟

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهِ مِنَ اللَّيْلِ أَوْ عَنْ شَيْئٍ مِنْهُ فَقَرَأَهُ مَابَيْنَ صَلاةِ الْفَجْرِ وَصَلاةِ الظُّهْرِ، كُتِبَ لَهُ كَأَنَّمَا قَرَأَهُ مِنَ اللَّيْلِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد اس آیت کے ذیل میں پیش کیا ﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَنْ یَّذَّکَّرَ أَوْ أَرَادَ شُکُوْرًا﴾ ہم نے رات اور دن کو (عبادت کے باب میں) ایک دوسرے کا نائب بنا رکھا ہے اس آدمی کے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہے۔ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی کہ اگر کسی آدمی کا رات کا معمول چھوٹ گیا، مثلاً آدمی نے تہجد کے اندر روزانہ قرآن کی ایک مخصوص مقدار پڑھنا مقرر کرلیا کہ مثلاً روزانہ تہجد میں ایک پارہ، دو پارے، تین پارے یا ایک منزل پڑھا کروں گا (قرآن کی ایک مخصوص مقدار کو ''حزب'' کہتے ہیں) لیکن کسی وجہ سے آنکھ لگی رہی اور نہیں کھل سکی، جس کی وجہ سے رات کا جو معمول تھا وہ نہیں پڑھ پایا، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ فجر اور ظہر کے درمیان۔ طلوع آفتاب کے بعد جب وقتِ مکروہ گذر جائے وہاں سے لے کر زوال سے پہلے تک۔ کا جو وقت ہے، اس میں اگر اپنا وہی معمول پڑھ لے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے نامۂ اعمال کے اندر ایسا ہی ثواب لکھا جائے گا جیسا کہ اُس نے رات میں پڑھا۔

ایسا ہوتا ہے جو لوگ اعمال کا اہتمام کرتے ہیں، پابندی بھی کرنا چاہتے ہیں، کبھی کسی وجہ سے بیماری یا زیادہ تھکن کی وجہ سے آنکھ نہیں کھلی تو گویا ان لوگوں کے لئے جن کا معمول تو اٹھنے کا ہے اور اٹھنے کے لئے انہوں نے ساری تدبیریں بھی کرلیں لیکن آنکھ لگی

رہی (ایسا نہیں کہ آنکھ کھلی اور پھر بھی نہ اُٹھا) اور اُٹھ نہیں پایا، پھر عین فجر کے وقت آنکھ کھلی، تو اب یہ آدمی اشراق سے لے کر چاشت تک کے وقت میں رات والے اس معمول کو پورا کرلے؛ تو اس کا پورا ثواب اس کو ملے گا۔

اس طریقہ سے نبی کریم ﷺ نے غیر اختیاری طور پر (یعنی ایک ایسے طریقہ سے جس میں آدمی کے ارادے کو دخل نہیں ہے) جو معمول چھوٹ گیا تھا؛ اس کی تلافی کی صورت بتلادی۔ اس لئے کہ یہ ایک معمول ایسا ہے کہ جس کے غیر اختیاری طور پر چھوٹنے کا امکان موجود ہے، باقی دوسرے معمولات تو آدمی اچھے طریقہ سے اپنے وقت پر انجام دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن اِس معمول میں چونکہ نیند کا معاملہ رہتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ آنکھ نہ کھل پائے اس لئے حدیثِ پاک میں اس کا بدل خاص طور پر تجویز کردیا گیا۔

﴿فلاں جیسا مت بنو﴾

عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال قال لی رسول اللہ ﷺ: یَاعَبْدَاللّٰہِ! لاتَکُنْ مِثْلَ فُلاَنٍ، کَانَ یَقُوْمُ اللَّیْلَ فَتَرَکَ قِیَامَ اللَّیْلِ.

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: اے عبد اللہ! فلاں جیسا مت بنو؛ کہ وہ رات کو نماز کے لئے اٹھا کرتا تھا لیکن پھر اس نے یہ سلسلہ چھوڑ دیا۔

دیکھو! نبی کریم ﷺ نے اس آدمی کی اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ گویا بتلادیا کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ آدمی ایک کام شروع کرے پھر اس کے بعد اس کو چھوڑ دے، آدمی نے جو معمول شروع کیا ہے؛ زندگی کے آخری لمحات تک اس پر پابندی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی لئے پہلے بھی جو روایت گذری تھی اس میں انہیں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن

العاص رضی اللہ عنہ کا قصہ تھا کہ رات کی نماز میں قرآن پاک پڑھنے کے سلسلے میں اور دن میں روزے رکھنے کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ نے ان کو تخفیف کے لئے فرمایا تھا اور آخر میں ایک خاص مقدار پر بات طے ہوئی، لیکن وہ بوڑھاپے کے زمانے میں اپنی کمزوری کی وجہ سے جب اس کو کما حقہٗ ادا نہیں کر پاتے تھے؛ تب بھی عملی طور پر اس کا بدل کر لیا کرتے تھے کہ مثلاً ایک دن افطار اور ایک دن روزہ کا معمول تھا لیکن کسی دن روزہ نہیں رکھ پاتے تھے تو کبھی مسلسل چار پانچ دن افطار کر لیا کرتے تھے اور اس کے بعد اس کے بدلے میں مسلسل چار پانچ دن روزے بھی رکھ لیا کرتے تھے۔ وہ ایسا اسی لئے کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے عمل کے متعلق تعلیم دی ہے کہ شروع کرنے کے بعد پھر اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے، بلکہ اس پر مداومت اور ہمیشگی رہنی چاہیے۔

﴿تہجد پر مداومت کا ایک طریقہ﴾

عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: کان رسول اللہ ﷺ اِذَا فَاتَتْہُ الصَّلاۃَ مِنَ اللَّیْلِ مِنْ وَجَعٍ أَوْ غَیْرِہٖ، صَلّیٰ مِنَ النَّھَارِ ثِنْتَیْ عَشَرَۃَ رَکْعَۃً.

یہاں خود نبی کریم ﷺ کا معمول بھی بتلا دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی رات کی نماز اگر کسی بیماری کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے چھوٹ جاتی تو دن میں (سورج کے طلوع ہونے کے بعد وقتِ مکروہ ختم ہونے کے بعد سے لے کر زوال سے پہلے تک) بارہ رکعتیں ادا فرما لیا کرتے تھے، گویا آپ ﷺ نے مداومت کا ایک طریقہ عملی طور پر بھی امت کو سکھلا دیا۔

جیسا کہ پہلے میں نے عرض کیا کہ یہی ایک عمل ایسا تھا کہ جس میں غیر اختیاری طور پر چھوٹنے کے امکانات موجود تھے، اب اس پر مداومت کے لئے کیا شکل اختیار کی جائے؛ تو

نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر بتلادیا کہ اگر غیر اختیاری طور پر آنکھ لگی رہنے کی وجہ سے آپ نہیں اٹھ پائے؛ تو مداومت کی صورت یہ ہے کہ دن میں اتنی ہی رکعتیں آپ پڑھ لیجیے؛ تاکہ اس کی تلافی ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے

الْمُحَافَظَةُ عَلٰى السُّنَّةِ

سنتوں کا اہتمام

مجلس ﴿ ۱ ﴾

۲۲؍جمادی الآخریٰ ۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۵؍اکتوبر ۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰـہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد

فأعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

مَااٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَانَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا

وقال تعالیٰ: وَمَایَنْطِقُ عَنِ الْھَویٰ اِنْ ھُوَاِلَّاوَحْیٌ یُّوْحیٰ.

وقال تعالیٰ: قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ.

وقال تعالیٰ: لَقَدْکَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ أُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوْااللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ

قال تعالیٰ: فَلاَ وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَاشَجَرَبَیْنَھُمْ ثُمَّ لاَیَجِدُوْافِیْ أَنْفُسِھِمْ حَرَجاً مِمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْاتَسْلِیْمًا.

باب قائم کیا ہے ﴿الْأَمْرُبِالْمُحَافَظَۃِعَلٰی السُّنَّۃِوَاٰدَابِھَا﴾ نبی کریم ﷺ کے طریقوں کواپنانے کی تاکیداورسنتوں کااہتمام کرنا۔کچھ آیتیں پیش کی ہیں۔

پہلی آیت ہے ﴿مَااٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَانَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا﴾ اللہ کے رسول تم کوجس چیز کاحکم دیں؛اس کولے لویعنی اس کے اوپرعمل کرواورجس چیز سے تم کو روکیں؛اس سے بازآجاؤ۔نبی کریم ﷺ کے ذریعہ سے جتنے بھی احکام امت کودیئے گئے، چاہے وہ ازقبیلِ اوامرہوں یعنی وہ چیزیں جن کوکرنے کاحکم دیاگیاہے یاازقبیل نواہی ہوں

یعنی وہ چیزیں جن سے بچنے کا اور رُکنے کا حکم دیا گیا ہے؛ دونوں کے متعلق اس آیت کے اندر امت کو تاکید کر دی گئی کہ آپ ﷺ کی طرف سے جن چیزوں کا حکم دیا جائے ان کو لے لو یعنی ان پر عمل کرو، اور جن چیزوں سے منع کیا جائے اس سے باز آ جاؤ۔

﴿اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر......﴾

بخاری شریف میں روایت ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو اپنے بالوں میں دوسری عورتوں کے بالوں کے ذریعہ سے جوڑ لگاتی ہیں ﴿اَلْـوَاصِـلَةَ وَالْـمُسْتَـوْصِـلَةَ﴾ جو عورتیں یہ کام کرواتی ہیں اور کرتی ہیں ﴿اَلْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ﴾ گوندھنے لگانے والی اور گوندھنے لگوانے والی عورت؛ ان سب پر لعنت ہے۔ اس موقعہ پر ایک عورت نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے طور پر اس کو بیان فرما رہے ہیں اور میں نے پورا قرآنِ پاک پڑھا، قرآن میں کہیں یہ چیز موجود نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا ﴿لَوْقَرَأْتِيْهِ لَوَجَدْتِّيْهِ﴾ اگر غور سے قرآن پاک کو پڑھتی تو ضرور یہ چیز بھی مل جاتی۔ تم نے یہ آیت نہیں پڑھی ﴿مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ اس میں تو ساری چیزیں آ گئیں۔

﴿مجھ سے جو سوال چاہو؛ کرو......﴾

ایک موقعہ پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں سے کہا کہ مجھ سے جو سوال چاہو کرو، میں اس کا حکم قرآنِ پاک سے بتلاؤں گا۔ چنانچہ سوالات کئے گئے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کے ذریعہ سے جواب دینے کے بعد یہ آیت پڑھ دی اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے

جو حکم دیا ہے اس کو عمل میں لاؤ اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے باز آ جاؤ۔ قرآن میں یہ موجود ہے، اور نبی کریم ﷺ کے اقوال اور افعال سب قرآنِ پاک کی تشریح ہی ہیں ﴿لِتُبَیِّـنَ لِلنَّـاسِ مَـانُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ نبی کریم ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھیجا ہی اس لئے ہے کہ قرآن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بندوں تک جو چیزیں اتاری ہیں؛ آپ ﷺ اس کی تشریح اپنے اعمال، اقوال اور افعال سے فرماویں۔

﴿وحی متلو اور وحی غیر متلو﴾

اسی کو آگے دوسری آیت میں فرمایا ﴿وَمَـا یَـنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾ نبی کریم ﷺ کوئی چیز اپنی خواہش نفسانی سے اپنی زبان سے نہیں نکالتے بلکہ جو کچھ بھی آپ فرماتے ہیں وہ وحی ہی ہے جو آپ پر بھیجی جا رہی ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے جو کچھ بھی نکل رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر اتارا گیا ہے؛ اسی کو قرآن کہا جاتا ہے، یہ وحی متلو ہے، یعنی وہ وحی جس کی باقاعدہ تلاوت کی جاتی ہے۔ الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے ہوئے ہیں۔ اور بعض چیزیں وہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اوپر معانی کا القا کیا جاتا ہے، یعنی معانی اور مفہومات حضور ﷺ کو بتلائے جاتے ہیں اور آپ اپنی زبان سے اپنے الفاظ کے اندر لوگوں کے سامنے پیش فرماتے ہیں جس کو وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔ بہر حال! آپ ﷺ جو بھی فرما رہے ہوتے ہیں وہ اپنی خواہش نفسانی سے نہیں فرماتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہی ہے جو آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہو رہی ہے۔

﴿اس زبان سے حق کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا﴾

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ معمول بنالیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے اس کو وہ لکھ لیا کرتے تھے، اور منضبط کر لیتے تھے، اس طرح ایک مجموعہ ان کے پاس جمع ہو گیا۔ بعض لوگوں نے اس پر ٹوکا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی فرماتے ہیں اس کو آپ لکھ لیتے ہیں، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان ہیں، کبھی غصے میں ہوتے ہیں، کبھی خوشی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ کہنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ چیز حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لکھ لیا کرو، اس لئے کہ اس زبان سے حق کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا چاہے میں غصے کی حالت میں ہوؤں، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ جو کچھ بھی آپ بولتے ہیں اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری ہوئی وحی ہے۔　(جامع بیان العلم، ۱/۶۷)

﴿تمام چیزوں میں میری پیروی کرو﴾

باری تعالیٰ کا ایک اور ارشاد نقل کیا ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ اے نبی! آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اور اتباع کرو، مَیں جس طرح کرتا ہوں اس طرح کرو، جس طرح چلتا ہوں اس طرح چلو، ساری چیزوں میں میری پیروی کرو؛ اللہ تبارک وتعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔

ظاہر ہے کہ محبت ایک ایسی چیز ہے کہ کوئی آدمی اس کو دیکھ نہیں سکتا، اس کا تعلق

قلب اور دل سے ہے، کس کے ساتھ محبت ہے، کس کے ساتھ نہیں ہے، اور اگر ہے تو کتنی مقدار میں ہے، زیادہ ہے یا کم ہے؛ وہ دیکھی نہیں جاسکتی، البتہ علامتوں، قرائن اور نشانیوں کے ذریعہ ہی آدمی اس کا اندازہ لگا سکتا ہے :

محبت کون کہتا ہے کہ پہچانی نہیں جاتی ❁ ٹپکتی ہے اداؤں سے، برستی ہے نگاہوں سے

کسی سے محبت ہو تو بھی، عداوت ہو تو بھی؛ آدمی کے آثار اور علامتوں سے ہی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تک نبی کریم ﷺ کے ذریعہ سے یہ پیغام پہنچایا گیا کہ اے نبی! جو لوگ میری محبت کا دعویٰ کرتے ہیں آپ ان لوگوں کو کہہ دیجیے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو پھر میری پیروی کرو۔ اگر واقعۃً تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہے تو پھر میری پیروی کروگے۔ اور اللہ تعالیٰ سے جتنی زیادہ محبت ہوگی، اتنی ہی مکمل پیروی آپ ﷺ ہوگی، اور جتنی محبت میں کمی ہوگی اسی حساب سے آپ ﷺ کی پیروی اور اتباع کے اندر کمی آئے گی۔ پھر آگے اس کا ثمرہ بھی بتادیا ﴿يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ اگر تم میری پیروی کروگے تو اس کے نتیجے میں کیا ملے گا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ تم سے محبت کرے گا ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا۔

﴿......تو پھر خود اس ذات کا کیا حال ہوگا؟﴾

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ جس کثرت سے جگہ جگہ موجود ہے کسی اور نبی کا تذکرہ اس کثرت سے نہیں ہے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ باری تعالیٰ کے تعلق کا قرآنِ پاک میں اظہار کیا گیا ہے۔ دنیا میں تشریف فرما ہوئے وہاں سے لے کر نبوت سے سرفراز کئے

جانے تک اور اس کے بعد جو معاملہ ان کا اپنی امت اور اپنی قوم کے ساتھ رہا؛ وہ تمام واقعات تفصیل سے قرآنِ پاک میں موجود ہیں اور بعض واقعات تو مکرر سہ کرر مختلف الفاظ میں آئے ہیں۔ تو حضرت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ اس کثرت کو دیکھ کر بار بار میرے دل میں خیال آیا کہ قرآنِ پاک میں ان کا ذکر عجیب وغریب طریقہ سے فرمایا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام بڑا ہوگا، اور حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے سب کا سردار بنایا اس کے باوجود اتنی کثرت سے آپ کا تذکرہ موجود نہیں۔ ایسا کیوں؟ پھر فرماتے ہیں کہ جب اس آیت کے اوپر مَیں نے غور کیا تو میرے دل کو اطمینان ہوا کہ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام لوگوں کو کھلم کھلا بتلا دیا ہے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میری (حضور ﷺ کی) پیروی کرو؛ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ تو جس کی شان یہ ہو کہ اس کے نقشِ قدم پر چلنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبوبیت کا مقام ان چلنے والوں کو حاصل ہوتا ہو؛ تو پھر خود اس ذات کا کیا حال ہوگا؟ یہ عام اعلان کیا گیا ہے، سب کو کہا کہ میرے راستے پر چلو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

متبعِ سنت کو محبوبیت سے نوازا جاتا ہے

اگر کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی محبوبیت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے نقشِ قدم پر چلے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں ایسے بندے پیدا فرمائے اور نبی کریم ﷺ کے زمانہ سے لیکر آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ جو لوگ آپ ﷺ کی سنتوں کا اور آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کا اور آپ کی پیروی کا جتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں؛ اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے یہاں بھی محبوبیت عطا فرماتا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ

کے یہاں کوئی محبوب بن جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اللہ کی مخلوق میں بھی اس کو محبوبیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ پہلے بھی روایت گذری ہے اور وہاں یہ بتلا چکا ہوں۔

اہل اللہ کی مقبولیت کا راز

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ تم ان سے محبت کرو، اس لئے کہ مَیں ان سے محبت کرتا ہوں، پھر حضرت جبرئیل آسمان والوں سے کہتے ہیں کہ تم ان سے محبت کرو، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں اور مَیں بھی ان سے محبت کرتا ہوں ﴿فَيُوضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْأَرْضِ (بخاری شریف ۲۴۰۹)﴾ حدیث کے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے واسطے زمین کے اندر مقبولیت رکھ دی جاتی ہے۔ اہل اللہ کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ بہت سے ایسے بندے جنہوں نے ان اللہ والوں کو دیکھا بھی نہیں ہے، بہت سے اللہ والے ہمارے ملک ہی کے اندر ایسے ہیں کہ جن کے صرف نام ہم نے سنے ہیں، کبھی ان کی زیارت کی نوبت بھی نہیں آئی؛ اس کے باوجود ان کی محبت سے ہمارے دل بھرپور ہیں، ہمارے دلوں کے اندر یہ محبت کس نے ڈالی؟ اللہ تعالیٰ نے ڈالی۔

کون سی مقبولیت مطلوب ہے؟

اور یہی ایک بڑی علامت ہے کہ کس کی مقبولیت لوگوں کے اندر کیسی ہے؟ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ایک آدمی کا چرچا اور شہرت ہو جاتی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کی علامت ہے یا نہیں؟ یہ جاننا ہو تو اس کی علامت یہی بتلائی گئی ہے کہ جس آدمی کی مقبولیت خواص سے شروع ہو کر عوام میں پھیلے، یعنی جو صلحاء ہیں پہلے وہ اس

سے محبت کریں اور اس کے بعد پھر اس کی مقبولیت لوگوں میں اور عوام کی طرف بڑھے تو یہ عنداللہ مقبول ہونے کی علامت ہے۔ اور اگر عوام کے اندر تو خوب چرچا ہے لیکن خواص، اہل اللہ اور صلحاءِ زمانہ میں سے کوئی اس سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں، تو پھر چاہے عوام میں اس کا کتنا ہی چرچا کیوں نہ ہو؛ وہ عنداللہ مقبولیت کی علامت نہیں ہے۔

بہرحال! ﴿قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ﴾ ایک عجیب وغریب آیت ہے، نبی کریم ﷺ کی پیروی کی اہمیت بتلانے کے لئے یہی ایک آیت کافی تھی، اس کے باوجود علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے اور آیتوں کو پیش کیا ہے۔

﴿فَلَاوَرَبِّکَ لَایُؤۡمِنُوۡنَ الخ﴾ پس قسم ہے تمہارے رب کی! یہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ آپ کو فیصل بناویں ان چیزوں میں جن میں ان کے آپس میں جھگڑا ہے پھر وہ اپنے جی میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اس فیصلے سے جو آپ نے کیا ﴿وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا﴾ اور اس فیصلے کو پورے پورا تسلیم کرلیں، دل سے مان لیں۔ اس آیت کے متعلق تفصیل بعد میں عرض کرتا ہوں۔

﴿جو نبی کے فیصلہ پر راضی نہ ہو؛ اس کا فیصلہ......﴾

روایتوں کے اندر اس آیت کا شانِ نزول بتلایا گیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک منافق جو ظاہری طور پر مسلمان تھا اس کے اور ایک یہودی کے درمیان کسی معاملہ میں جھگڑا ہوگیا، دونوں اپنے اس جھگڑے کا فیصلہ کروانا چاہتے تھے۔ وہ چونکہ سچا مسلمان تو تھا نہیں بلکہ منافق تھا اور پھر جس معاملہ میں جھگڑا ہوا تھا اس میں وہ حق پر بھی نہیں تھا، حق پر یہودی تھا، اس لئے یہودی کا اصرار یہ تھا کہ فیصلے کے لئے حضورِ اکرم ﷺ کے پاس جائیں اور اس کو معلوم تھا کہ

اگر چہ مَیں مسلمان ہوں، اسلام کا دعویٰ کرتا ہوں لیکن چونکہ نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ ہے کہ جو حق پر ہو، اسی کے موافق فیصلہ فرماتے ہیں، اس لئے مَیں مسلمان ہوں اس مناسبت سے میری طرفداری تو کریں گے نہیں، آپ ﷺ تو حق کے مطابق فیصلہ کریں گے، اس لئے وہ یوں کہتا تھا کہ ہم اپنا فیصلہ کعب بن اشرف (منافقین کے سردار) کے پاس لے چلیں۔ بہر حال! یہ بات کچھ دنوں تک ان کے درمیان اٹکی ہوئی رہی، آخر وہ مسلمان (جو ظاہر میں مسلمان تھا اور حقیقت میں منافق تھا) نبی کریم ﷺ کے پاس فیصلہ لے جانے کے لئے تیار ہو گیا، جب آپ کی خدمت میں وہ بات پیش کی گئی تو دونوں کی باتیں سننے کے بعد آپ ﷺ نے اسی یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا اس لئے کہ وہ حق پر تھا۔ اس فیصلے کے بعد اس منافق نے یوں کہا کہ ہم اپنا فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کروائیں۔ وہ یوں سمجھتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غیر مسلموں کے بارے میں بڑے سخت ہیں، اس لئے شاید اس فیصلے کے اندر وہ میری طرفداری کریں گے۔ اس یہودی نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ دونوں گئے، وہاں پہنچنے کے بعد اُس یہودی نے سارا قصہ بیان کیا کہ ہمارے درمیان یہ جھگڑا ہے اور ہم اپنا فیصلہ حضور ﷺ کے پاس لے گئے اور آپ نے ہمارے درمیان یہ فیصلہ کیا ہے، اس کے بعد بھی اس کا اصرار یہ رہا کہ آپ کے پاس فیصلے کے لئے آویں؛ لہٰذا اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، آپ ہمارے معاملہ کا فیصلہ کر دیجیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ یہ جو کہہ رہا ہے وہ ٹھیک ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ٹھہرو! مَیں ابھی آتا ہوں، گھر میں گئے، تلوار لے کر آئے اور اس منافق کا سر قلم کر دیا اور فرمایا کہ جو آدمی نبی اکرم ﷺ کے فیصلے پر راضی نہ ہو؛ اس کا یہی فیصلہ ہے۔ اب منافق کے جو رشتہ دار اور خاندان والے تھے انہوں

نے اس پر بڑا شور مچایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مسلمان، ایمان دار اور کلمہ گو کو قتل کردیا اور پھر اس معاملے کو بہت بڑھا چڑھا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا کہ یا رسول اللہ! انہوں نے ایک مسلمان کو قتل کردیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ میں عمر کے بارے میں یہ گمان نہیں کرتا کہ وہ اتنی جرأت کریں کہ ایک مسلمان کو قتل کریں۔ چونکہ وہ ظاہری طور پر ایمان کا مدعی تھا اور نفاق کا تعلق تو دل سے ہے، اور نفاق کو کون ثابت کرسکتا ہے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی رہنمائی ہو۔ چنانچہ اسی موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، گویا آیت نے آکر یہ بتلا دیا کہ وہ مسلمان نہیں تھا، جب وہ مسلمان تھا ہی نہیں تو اس کے قتل پر یہ کہنا کہ حضرت عمر نے مسلمان کو قتل کردیا؛ صحیح نہیں ہے۔

یہاں اسی کو فرمایا گیا ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ قسم ہے تمہارے پروردگار کی! وہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ وہ آپ کو فیصل اور (حاکم) بناویں یعنی آپ کے ذریعہ سے فیصلہ کرائیں ان معاملات اور چیزوں میں جن میں ان کے آپس میں جھگڑا ہے ﴿ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ﴾ اور پھر جب آپ فیصلہ کردیں تو اس فیصلے کے متعلق دل میں ذرہ برابر تنگی محسوس نہ کریں، یعنی دل میں ذرہ برابر یہ نہ آئے کہ ایسا فیصلہ کیوں کیا؟ ﴿وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ اور اس فیصلے کو پورے پورا یعنی سچے دل سے تسلیم کرلیں؛ تب مؤمن ہوں گے۔ اور جب یہ بات پائی نہیں جاتی تو وہ اہل ایمان میں سے نہیں ہیں۔

آپسی جھگڑے کہاں حل کریں؟

علماء نے لکھا ہے کہ یہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ خاص نہیں ہے، جب تک

نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے وہاں تک تو آپ کی خدمت میں براہِ راست فیصلہ لے جایا جاتا تھا، آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ جس شریعت کو چھوڑ کر گئے ہیں، اس کا فیصلہ بھی وہی حکم رکھتا ہے جو آپ کا فیصلہ ہے۔قرآنِ پاک اور احادیث کے ذریعہ سے فیصلے کا وہی حکم ہے۔اس لئے آج بھی یہ آیت اپنی جگہ پر جوں کی توں موجود ہے۔آج بھی ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ اگر آپس میں جھگڑے کا کوئی معاملہ پیش آوے تو اس معاملہ کو شریعت پر پیش کرے اور شریعت کا جو فیصلہ آوے اس کو دل سے تسلیم کرلے، ذرہ برابر اس کے متعلق دل میں تنگی محسوس نہ کرے۔اگر اس کے دل میں اس کے متعلق ذرہ برابر بھی تنگی ہوگی تو وہ مؤمن نہیں کہلائے گا۔اس آیت کے متعلق تمام مفسرین نے بالاتفاق یہ چیز لکھی ہے۔گویا آج بھی اسی کے مطابق ہر مؤمن کا ایمان ہے۔

جو لوگ شریعت کے ہوتے ہوئے اپنے جھگڑوں اور مسائل کو دوسرے لوگوں کے پاس لے جاتے ہیں؛ ان کے متعلق بڑی وعیدیں سنائی گئی ہیں، ہر مسلمان کے ذمہ ہے کہ آپس میں جھگڑے کا کوئی بھی معاملہ ہو؛ اس کو شریعت ہی کے ذریعہ فیصل کرانے کی اور درست کرانے کی کوشش کرے، غیروں کے پاس لے جانے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

﴿ہرگز بمنزل نخواہد رسید﴾

﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ تمہارے لئے نبی کریم ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے، یعنی جس کے دل میں یہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے، مجھے مرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، ایسے ہر آدمی کے لئے نبی کریم ﷺ کی ذات میں نمونہ موجود ہے، آپ ﷺ نے جس طرح جی کر بتلایا، اپنی زندگی کے ذریعہ سے

اپنے اقوال و افعال سے جو نمونہ امت کے سامنے پیش کیا؛ وہی بہترین نمونہ ہے۔اب کوئی آدمی آپ ﷺ کے اس نمونہ کو-جس کو باری تعالیٰ کی طرف سے بہترین نمونہ کہا گیا ہے- چھوڑ کر دوسرے طریقہ کو اختیار کرے گا؛ تو ظاہر ہے کہ وہ کبھی ہدایت یافتہ نہیں ہوسکتا: ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید ❁ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ کے طریقہ کے خلاف جو بھی راستہ اختیار کرے گا کبھی منزلِ مقصود تک پہنچ نہیں سکتا،اس لئے کہ وہ راستہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا نہیں۔اللہ تک پہنچانے والا تو وہی ایک راستہ ہے جو نبی کریم ﷺ نے بتلایا: ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی ❁ کیں راہ کہ تو می روی بترکستان است

ایک آدمی مکہ مکرمہ جانا چاہتا ہے اور جا رہا ہے ترکستان کی طرف؛ تو وہ کہاں مکہ مکرمہ پہنچے گا؟ اس لئے جدھر منزلِ مقصود بنائی ہے اور اس کے لئے جو راہ ہے، اسی پر چلو گے، تو منزل پر پہنچو گے؛ ورنہ نہیں۔

﴿آخری فیصلہ﴾

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْئٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں جھگڑا اور نزاع ہو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ اور ان کے سامنے پیش کرو۔"اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ" کا کیا مطلب ہے؟ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح فرماتے ہیں ﴿قال العلماء معناهٗ الیٰ الکتاب والسنة﴾ مطلب یہ ہے کہ جھگڑے کا کوئی بھی معاملہ پیش آیا ہو تو اس کے فیصلے کے لئے قرآن اور حدیث موجود ہے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر اس کو پیش کرو اور وہاں سے اس سلسلے میں جو ہدایت اور فیصلہ ملے؛ اسی کو آخری فیصلہ سمجھ کر آدمی اس پر عمل کرے۔

﴿اطاعتِ رسول: اطاعتِ خدا﴾

﴿مَن يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ﴾ جو آدمی نبی کریم ﷺ کا اتباع اور اطاعت کرتا ہے؛ اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ یعنی حضور ﷺ کے احکام کو ماننا ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننا، اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی اطاعت کو بھی اپنی اطاعت قرار دیا، اس میں کوئی فرق نہیں کیا گیا یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وہی ہے؛ جو حضور ﷺ کی ہو۔

﴿صراطِ مستقیم﴾

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ باری تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: آپ لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف چلا رہے ہیں، راہ نمائی کر رہے ہیں اور لے جا رہے ہیں۔ گویا حضور ﷺ والا راستہ وہی صراطِ مستقیم ہے، اس میں کوئی تردد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو صراطِ مستقیم اختیار کرنا ہو، تو حضور ﷺ نے جس طریقہ پر چل کر بتلایا؛ اسی پر چلے۔

﴿ان کو ڈرنا چاہیے﴾

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهٖ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْيُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ جو لوگ نبی کریم ﷺ کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں؛ ان کو ڈرنا چاہیے اس بات سے کہ کہیں ان کو کوئی آزمائش اور فتنہ یا دردناک عذاب پہنچ جائے۔ نبی کریم ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی صورت میں آدمی دین سے ہٹ جاتا ہے اور کبھی تو وہ دین سے ہٹنا یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ ایمان سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور یہی چیز ہمیشہ کی ناکامی کا ذریعہ بنتی ہے

ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاذْكُرْنَ مَايُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ آيٰتِ اللهِ وَالْحِكْمَةِ﴾ تمہارے گھروں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جو

آیتیں پڑھی جاتی ہیں؛ ان کو یاد کرو اور ان سے نصیحت حاصل کرو ﴿الحکمۃ﴾ سے مراد نبی کریم ﷺ کا طریقہ اور آپ کی سنت ہے، اسی کو بتلانا مقصود ہے۔

اب اس سلسلے میں روایتیں پیش کرتے ہیں۔

﴿زیادہ کھود کرید مت کرو﴾

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: دَعُوْنِیْ مَاتَرَکْتُکُمْ، أَنَّمَا أَهْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَثْرَۃُ سُؤَالِھِمْ وَاِخْتِلَافُھُمْ عَلٰی أَنْبِیَائِھِمْ. فَاِذَا نَھَیْتُکُمْ عَنْ شَیْئٍ فَاجْتَنِبُوْہُ، وَاِذَا أَمَرْتُکُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْہُ مَا اسْتَطَعْتُمْ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم مجھے چھوڑے رکھو؛ جب تک مَیں تمہیں چھوڑے رکھوں۔

ایک موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو حج کی فرضیت کا حکم بتلایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے اوپر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے، اس موقعہ پر ایک صحابی نے کھڑے ہوکر سوال کیا ﴿أکُلَّ عامٍ یارسول اللہ؟﴾ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کا حج جو فرض کیا ہے تو کیا ہر سال فرض ہے؟ اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی، انہوں نے پھر کھڑے ہوکر یہی سوال کیا جب تیسری مرتبہ سوال کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر مَیں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال تم پر حج فرض ہوجاتا اور پھر تم اس کو نباہ نہ سکتے، اور اس موقعہ پر آپ نے یہ فرمایا کہ تم بھی مجھے چھوڑے رکھو جب تک مَیں تمہیں چھوڑے رکھوں، یعنی جب مَیں نے اپنی طرف سے یہ بات نہیں کہی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر سال کے لئے حج فرض کیا گیا ہے تو پھر تم بار بار کیوں پوچھتے ہو؟ میری طرف سے جب یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حج فرض کیا ہے تو بس! اتنا

سننے کے بعد عمل کرلو، زیادہ کھود کرید اور مزید تحقیقات کے اندر اترنے کی کوشش نہ کرو، یہی چیز کبھی مزید سختی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اگر وہ کھود کرید نہ کرتے

حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے زمانہ میں قتل کا ایک واقعہ پیش آیا تو مقتولین کے ورثاء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ قاتل معلوم ہونا چاہیے، اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ ایک گائے ذبح کرنے کے بعد اس کے جسم کا حصہ مقتول کے اوپر رکھ دو، تو وہ مرا ہوا آدمی خود بتلائے گا کہ کس نے قتل کیا ہے، اب اللہ تعالیٰ کا یہ حکم مطلق تھا، جونسی بھی گائے لاکر ذبح کرتے اور اس کے جسم کا حصہ مقتول کے اوپر رکھ دیتے؛ باری تعالیٰ کے ارشاد کے بموجب وہ مردہ بول دیتا اور بتلا دیتا کہ کس نے اس کو قتل کیا ہے۔ لیکن وہ لوگ مزید سوالات اور تفصیلات کے اندر پڑے کہ گائے کیسی ہونی چاہیے، اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیے، جوں جوں پوچھتے گئے؛ توں توں پابندیاں ان کے اوپر عائد ہوتی گئیں اور پھر باری تعالیٰ کی طرف سے جیسی گائے بتلائی گئی، ویسی صفات پر ساری شرائط والی گائے ایک ہی تھی۔ اصل میں اللہ تعالیٰ کو اس گائے کے مالک کی مدد کرنا منظور تھا اس لئے ان کو بھی سوالات کے اوپر آمادہ کیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ اس موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ لوگ اس کے متعلق زیادہ کھود کرید نہ کرتے اور شروع ہی میں جہاں اللہ کا حکم ملا، ویسے ہی فوراً جونسی بھی گائے کو لاکر ذبح کرتے اور اس کے جسم کا حصہ مقتول کے اوپر رکھتے؛ تو ان کا مقصد حاصل ہو جاتا، لیکن وہ لوگ گہرائی میں اترے اور کھود کرید کی؛ تو ان کے اوپر پابندی عائد ہوئی۔

(تفسیر مظہری، ۱۴۴۲)

﴿کثرتِ سوال نے انہیں ہلاک کیا﴾

اسی کو یہاں فرمایا گیا ہے کہ تم لوگ مجھے چھوڑے رکھو، جب تک مَیں تمہیں چھوڑے رکھوں۔ مطلب یہ ہے کہ میری طرف سے جب کسی حکم کے معاملہ میں کوئی پابندی، شرائط اور تفصیلات نہ بتلائی جائیں تو تم بھی ان کے پوچھنے کے درپے مت رہو، اس لئے کہ جتنا پوچھوگے، اتنی شرطیں اور پابندیاں بڑھیں گی، اور اتنا ہی عمل تمہارے لئے دشوار اور مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ گویا پوچھ پاچھ کر تم اپنے لئے مزید پابندیاں پیدا کر رہے ہو۔

﴿أَنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَثْرَةُ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلٰى أَنْبِيَائِهِمْ﴾ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے کثرتِ سوال نے ہی ہلاک کیا، یعنی اپنے نبیوں سے وہ احکامات کے سلسلے میں غیر ضروری سوالات کرتے رہتے تھے، ان کے غیر ضروری سوالات کے نتیجے میں جواب کے طور پر ان پر پابندیاں عائد ہوتی رہتی تھی اور انبیاء سے اختلاف کرنے کی وجہ سے وہ ہلاک ہوئے۔

﴿فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْئٍ فَاجْتَنِبُوْهُ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ بس! یہ آخری ٹکڑا ہے جس کی وجہ سے اس روایت کو یہاں لائے ہیں۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں جب تم کو کسی چیز سے روکوں تو تم اس سے باز رہو اور رک جاؤ، اور جہاں کسی چیز کا حکم دوں؛ تو جتنا تم سے ہو سکے اس پر عمل کر لو۔

﴿یہ بے کار باتیں ہیں﴾

شریعت میں جن چیزوں سے منع کیا ہے، وہاں کوئی قید نہیں لگائی ہے، بلکہ ان چیزوں سے باز رہنے کے لئے مطلق حکم دیا گیا ہے ﴿فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ اس سے بچو۔ اور کسی کام کو

کرنے کے لئے آدمی کو کچھ زحمت اٹھانی پڑتی ہے اس لئے وہاں قید لگائی اور کہا ﴿مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تم سے جتنا ہو سکے، اپنی طاقت کے مطابق اس کام کو انجام دو۔

مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے نہ کرنے کے لئے کونسی طاقت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا جن گناہ کے کاموں کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ ان سے بچا نہیں جاتا؛ وہ ایسی ہی بے کار بات ہے۔ اس لئے کہ اس سے نہ بچ سکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ کام تو تم کر رہے ہو۔ بھائی! کسی کام کے نہ کرنے کے لئے کونسی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے؟ ہاں! یہ ہے کہ ہمارا نفس نفسانیت کی وجہ سے اس کا عادی بنا ہوا ہے اور ہم نے بے جا طریقہ سے اپنے آپ کو اس کام کی عادت ڈال رکھی ہے، اس وجہ سے نفس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ باقی یہ کہنا کہ ''نہیں ہوتا'' اور ''مجھ سے نہیں ہوسکتا'' ''میں بدنگاہی سے بچ نہیں سکتا'' ''فلاں گناہ سے بچا نہیں جاتا'' یہ جو باتیں کی جاتی ہیں؛ وہ سب بے کار ہیں۔

﴿نوکیلے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو﴾

عن أبی نجیح العرباض بن ساریة رضی اللہ عنہ قال: وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً، وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْب، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْن. فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! كَأَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا. قَالَ: أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوىٰ اللهِ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَإِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبْشِيٌّ. وَإِنَّهُ مَن يَّعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرىٰ اِخْتِلَافاً كَثِيْراً. فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْن، عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ. وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْر، فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ.

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ ہم کو نصیحت فرمائی اور بہت مؤثر وعظ فرمایا جس کے نتیجے میں لوگوں کے دل دہل گئے اور آنکھیں

بھی بہہ پڑیں، تو ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آج آپ نے جو تقریر فرمائی اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے الوداع کہنے والا آدمی نصیحتیں کر رہا ہو۔ آپ کی اس تقریر کے سننے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آپ کا قیام اور ہمارے درمیان آپ کی تشریف فرمائی زیادہ دیر نہیں ہے، آخری آخری ہے؛ لہٰذا آپ ہم کو اور کچھ اہم باتوں کے متعلق نصیحت اور تاکید فرما دیجیے۔

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مَیں تم کو اللہ سے ڈرنے کی اور تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہوں اور تمہارے اوپر جو حاکم مقرر ہوں ان کی بات سن کر اس کو ماننے کی تاکید کرتا ہوں، چاہے تمہارا حاکم حبشی غلام ہی ہو۔ حبشی لوگ قومی اور نسلی اعتبار سے باقی نسلوں اور قوموں کے مقابلہ میں ذرا کم تر سمجھے جاتے تھے اور اس میں بھی پھر غلام ہو۔ گویا ایسا آدمی کہ جس کی امارت کو تمہارا دل قبول نہیں کرتا لیکن حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے اگر اس کو تمہارے اوپر مقرر کیا گیا ہے تو تم اس کی بات سنو اور اس پر عمل کرو۔

اور تم میں سے جو آدمی آئندہ زندہ رہے گا وہ بڑے اختلافات دیکھے گا۔ ایسے زمانہ میں جب بڑے اختلافات رونما ہوں تو تمہاری نجات کے لئے میرے طریقہ کو اور میرے بعد میرے نائبین خلفاء جو راہ یاب اور ہدایت پائے ہوئے ہیں (جن کو خلفاءِ راشدین اور خلفاء اربعہ کہا جاتا ہے) ان کے راستہ کو مضبوطی سے لازم پکڑنا ضروری ہے۔ ”نَاجِذَۃٌ“ نوکیلے دانت کو کہتے ہیں، جس کو کچلیاں کہتے ہیں۔ تو فرمایا کہ ان کو نوکیلے دانتوں سے مضبوط پکڑیو۔

کسی چیز کے متعلق کہنا کہ ”دانتوں سے پکڑ لو“ یہ ایک محاورہ ہے، کسی چیز کو مضبوطی سے تھامنے کے واسطے بولا جاتا ہے یعنی میرے اور میرے نائبین جو ہدایت یافتہ اور راہ یاب

ہیں ان کے طریقہ کو مضبوطی سے تھام لینا، اور دیکھنا! جو نئی نئی باتیں دین کے اندر پیدا ہوں ان سے ضرور بچنا، اس لئے کہ ہر نئی بات گمراہی ہے۔ اس سے بھی سنت کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔

لہٰذا ہمیں اس بات کا پورا اہتمام کرنا چاہیے کہ اپنی ہر چیز میں- چاہے وہ قول ہو، فعل ہو، روش ہو، رفتار ہو، گفتار ہو- نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر چلیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں نبی کریم ﷺ نے ہمارے لئے نمونہ چھوڑا ہے، اگر ہم اس کو اختیار کرنا چاہیں، تو کوئی دشواری نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں سنتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے

اَلْمُحَافَظَةُ عَلَىٰ السُّنَّةِ

سنتوں کا اہتمام

مجلس ﴿ ۲ ﴾

۲۹ر جمادی الآخری ۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم یکم نومبر ۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰه اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:

کون ہے انکار کرنے والا؟

عَنْ أَبِىْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: كُلُّ أُمَّتِىْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ أَبىٰ. قِيْلَ: وَمَن يَّأْبىٰ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَنْ أَطَاعَنِىْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِىْ فَقَدْ أَبىٰ رواہ البخاری

گذشتہ مجلس میں بات ہوئی تھی کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں اور سنتوں کا اہتمام اور اس کے آداب کی رعایت کے بارے میں قائم کیا ہے۔ آج اور روایتیں پیش کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری پوری امت جنت میں جائے گی؛ مگر وہ آدمی جس نے انکار کیا۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ انکار کرنے والا کون ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اور میری بات مانی؛ وہ تو جنت میں جاوے گا اور جس نے میری نافرمانی کی گویا اس نے میرا انکار کیا اور وہ جنت میں نہیں جائے گا اس موقعہ پر شراح نے لکھا ہے کہ ﴿كُلُّ أُمَّتِىْ﴾ سے مراد امتِ دعوت ہے۔

امتِ دعوت اور امتِ اجابت

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا اور وحی کا سلسلہ شروع ہوا؛ اس کے بعد سے لے کر قیامت تک جتنے بھی انسان روئے زمین

پر ہوئے یا ہوں گے؛ وہ سب امتِ دعوت کہلاتے ہیں۔ دعوت کا معنیٰ ہے بلانا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف بلانے کے لئے نبی کریم ﷺ کو بھیجا گیا، ایسے تمام لوگوں کو امتِ دعوت کہا جاتا ہے، چاہے وہ آپ پر ایمان لاویں یا نہ لاویں۔ گویا روئے زمین کے سارے انسان جو نبی کریم ﷺ سے لے کر قیامت تک ہیں؛ وہ سب امتِ دعوت ہیں۔ اب ان میں سے جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی اس دعوت پر لبیک کہی اور آپ پر ایمان لائے وہ امتِ اجابت کہلاتے ہیں۔ اجابت کا معنی قبول کرنا۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی دی ہوئی دعوتِ اسلام کو قبول کیا۔ تو یہاں اس روایت کے اندر ﴿كُلُّ أُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جن کی طرف اسلام کی دعوت دینے کے لئے میں بھیجا گیا ہوں یعنی امتِ دعوت؛ وہ جنت میں جائے گی، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے انکار کیا۔ انکار کرنے والے یعنی جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ گویا امتِ اجابت جنت میں جائے گی۔ یہ روایت اس بات کو بتلانے ہی کے لئے لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری آدمی کو جنت تک پہنچانے والی ہے اور آپ کی پیروی اور اقتداء سے انکار جنت میں داخل ہونے سے روکنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

﴿اس کا وہ ہاتھ بے کار ہو گیا﴾

عن أبی مسلم وقیل أبی أیاس سلمة بن عمرو بن الاکوع رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلاً أَكَلَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ بِشِمَالِهِ. فَقَالَ: كُلْ بِيَمِيْنِكَ. قَالَ: لَا أَسْتَطِيْعُ. قَالَ: لَا اسْتَطَعْتَ. مَامَنَعَهُ اِلَّا الْكِبْرُ، فَمَا رَفَعَهَا اِلٰى فِيْهِ. (رواہ مسلم)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے

پاس آپ کے دسترخوان پر آپ کے ساتھ کھانے میں شریک تھا اور بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا، نبی کریم ﷺ نے اس کو فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔

یہاں ان روایتوں کو لانے کا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ امور جن کا تعلق روزمرہ کی عادات سے ہے، کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے سے ہے؛ ان میں بھی نبی کریم ﷺ کا اتباع اور آپ کی پیروی کا اہتمام ہونا چاہیے اور جو آدمی ان چیزوں میں نبی کریم ﷺ کی پیروی نہیں کرتا بلکہ کبر و غرور کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کی پیروی سے انکار کرتا ہے؛ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؛ وہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس سے یوں کہا کہ بھائی! دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ دائیں ہاتھ سے کھانا؛ یہ آداب میں سے ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ مَیں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا، اس نے جو یہ کہا کہ ''نہیں کھا سکتا'' یہ اس لئے نہیں کہ دایاں ہاتھ کام نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا یہ جواب کبر و غرور کی وجہ سے تھا۔ گویا نبی کریم ﷺ نے اس کو دائیں ہاتھ سے کھانے کے لئے جب کہا تو وہ آپ کی اس بات پر عمل کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا، اور آپ کے اس ارشاد کے جواب میں اس نے غرور و کبر کی وجہ سے منع کیا۔ اسی کو راوی کہتے ہیں ﴿مَا مَنَعَهُ اِلَّا الْكِبْرُ﴾ تکبر کی وجہ سے اس نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد اور حکم پر عمل کرنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ مَیں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا۔

ایک تو معذوری ہوتی ہے کہ دایاں ہاتھ کام نہیں کرتا، بیماری ہے، مثلاً دایاں ہاتھ فالج زدہ ہے جس کی وجہ سے وہ اٹھ نہیں سکتا؛ وہ دوسری بات تھی۔ لیکن یہاں ایسا نہیں تھا۔ جب اس نے یہ جواب دیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿لَا اسْتَطَعْتَ﴾ ٹھیک ہے! تم آئندہ بھی

اس سے کام نہیں لے سکو گے یعنی اس نے کہا تھا کہ مَیں نہیں کھا سکتا تو آپ نے کہا کہ نہیں کھا سکو گے۔ اس نے یوں کہا تھا کہ مَیں نہیں اٹھا سکتا تو حضور ﷺ نے بھی کہا کہ نہیں اٹھا سکتے تو مت اُٹھاؤ، آئندہ بھی نہیں اٹھا سکو گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس کے بعد سے اس کا وہ ہاتھ بے کار اور شل ہوگیا یعنی کسی کام کا نہیں رہا۔

﴿سننِ ہدیٰ اور سننِ زوائد﴾

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے ہر کام میں جو طریقے اور آداب بتلائے ہیں ان کو معلوم کرنے اور ان پر عمل کا اہتمام ہونا چاہیے، خاص طور پر شریعت کے وہ احکام جو شرائط و واجبات سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو سننِ ہدٰی کہا جاتا ہے کہ آدمی اگر ان پر عمل کا اہتمام کرے تو وہ ہدایت یافتہ اور راہِ راست پر چلنے والا ہے، اور اگر اس کے خلاف کرے تو وہ راہِ راست سے ہٹا ہوا ہے؛ ان میں تو آپ ﷺ کا اتباع اور پیروی ضروری ہی ہے، لیکن جو امورِ عادیہ ہیں یعنی عادت کے طور پر جو چیزیں نبی کریم ﷺ نے کر کے بتلائیں اور ان کی تاکید بھی فرمائی، مثلاً لباس، چلنا، اُٹھنا، بیٹھنا؛ ان میں بھی آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا؛ اس کا اہتمام ہونا چاہیے؛ انہیں سننِ زوائد کہتے ہیں۔

یہاں اسی بات کو بتلانے کے لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو پیش کیا ہے کہ جو لوگ سنتوں کے متعلق یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ اس کا کرنا سنت ہے اور جب ان کے سامنے کسی بھی کام کے متعلق کہا جاتا ہے مثلاً سونے، کھانے پینے اور اُٹھنے بیٹھنے وغیرہ کے آداب اور سنتوں کو بیان کیا جاتا ہے؛ تو ان پر کبر و غرور کی وجہ سے نامناسب کلمات کہتے ہیں، اور نامناسب باتیں اپنی زبان سے نکالتے ہیں، ایسے لوگوں کے متعلق بڑا اندیشہ رہتا ہے کہ

کہیں یہ چیزیں ان کے حق میں مضر نہ ہوجائیں۔پچھلی مجلس کے اندر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جوآیتیں پیش کی تھیں ان میں ایک آیت یہ بھی تھی ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهٖ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْيُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ جولوگ نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے خلاف کرتے ہیں،ان کوڈرنا چاہیے کہ آپ کے ارشادات اور آپ کے طریقوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے کہیں ان کوکوئی فتنہ لاحق ہوجائے یا دنیا کے اندر کوئی دردناک عذاب ان کوپہنچ جائے۔ دیکھو!اس آدمی نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد پرعمل کرنے سے محض کبروغرور کی وجہ سے انکارکیا؛ تونتیجہ یہ ہوا کہ اس کا ہاتھ بےکار ہوگیا۔

﴿صفیں سیدھی ہونی چاہئیں﴾

عن أبی عبداللہ النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ قال:سمعتُ رسولَ اللہِ ﷺ یقولُ:لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ أَوْلَيُخَالِفَنَّ اللهُ بَيْنَ وُجُوْهِكُمْ. (متفق علیہ)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم لوگ اپنی صفوں کودرست کرو؛ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کے اندراختلاف ڈال دےگا،تمہارے چہروں کوپھیر دےگا۔

چہروں کوپھیر دینے کا کیا مطلب ہے؟ بعضوں نے تواس کواس کے ظاہری معنیٰ ہی پرمحمول کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ایسے آدمی کا چہرہ بجائے سامنے رہنے کے پیچھے کی طرف ہوجائے۔اور بعضوں نے کہا کہ جوصورت انسانی اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطافرمائی ہے اس کے بجائے اس کے چہرہ کی کوئی دوسری صورت بنادی جائے۔اور بعضوں نے اس کومعنوی معنیٰ پرمحمول کیا ہے یعنی اگرتم نے صفوں کی درستگی کا اہتمام نہیں کیا تواس کا دنیوی طورپرایک اثر یہ ہوگا کہ تمہارے دلوں میں آپس میں اختلاف اورعداوت ڈال دی جائےگی۔

﴿آپسی اختلاف مٹانا بہت آسان﴾

علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے جو طریقے ہیں اور شریعت نے جو چیزیں بتلائی ہیں ان پر عمل کرنے کے نتیجے میں آدمی کو آخرت کا اور دین کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے؛ لیکن دنیا کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ نمازوں کے اندر صفوں کے درست کرنے کا اور تمام مقتدیوں کے صف کے اندر بالکل برابر کھڑے رہنے کا دنیوی فائدہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں آپس میں محبت، میل ملاپ اور جوڑ قائم ہوگا اور اگر صفوں کو درست کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا اور آگے پیچھے رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپس میں اختلاف اور عداوت پیدا ہو جائے گی۔

آج دنیا کے اندر آپس کے اتفاق اور اتحاد اور جوڑ پیدا کرنے کے واسطے کیسی کیسی کوششیں کی جاتی ہیں اور بڑی محنتیں کی جارہی ہیں اور اس کے لئے مختلف تنظیمیں قائم کی جارہی ہیں، اس کے لئے سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم کی جاتی ہیں کہ آپس میں جوڑ پیدا کیا جائے، لیکن مسجد میں آنے کے بعد نماز کے لئے جب کھڑے ہوں تو صفوں کی درستگی کا اگر اہتمام کرلیا جائے تو یہ چیز ویسے ہی مفت میں حاصل ہو جائے گی۔ شریعت کے ایک حکم پر عمل کی یہی کتنی بڑی برکت ہے۔

﴿صفیں سیدھی کروانے کا اہتمام﴾

مسلم شریف میں انہیں حضرت نعمان رضی اللہ عنہ سے یہ روایت دوسرے طریق سے آئی ہے، اس میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ہماری صفوں کو اس طرح درست کرتے تھے گویا ان کے ذریعہ سے آپ تیروں کو سیدھا کر رہے ہیں (مسلم شریف حدیث نمبر ۶۶۰) اُس زمانہ میں کمان کے ذریعہ سے تیر چلائے جاتے تھے، اور تیر جب تک سیدھا نہ ہو؛ وہاں تک صحیح نشانہ پر نہیں جاسکتا، تو

تیر جس لکڑی سے بنایا جاتا تھا اس لکڑی کو سیدھا کرنے کا بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا تھا۔ مثلاً آپ کیل کو ٹھوک رہے تھے، ٹھوکتے ٹھوکتے کیل ٹیڑھی ہوگئی تو اس کو سیدھا کرنے کے لئے جس جگہ آپ اس کو رکھیں گے وہ جگہ بھی سیدھی ہونی چاہیے، ٹیڑھی جگہ پر رکھ کر آپ اس کو سیدھا نہیں کر سکتے۔ تو راوی بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہماری صفوں کو اس طرح سیدھا کرتے تھے گویا اس کے ذریعہ سے آپ تیروں کو سیدھا کریں گے یعنی ہماری صفیں ایسی سیدھی ہوتی تھیں کہ اگر اس کے اوپر رکھ کر تیروں کی سیدھ کو معلوم کیا جائے تو وہ آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے۔

﴿حَتّٰی اِذَا رَأیٰ اَنَّا قَدْ عَقَلْنَا عَنْهُ﴾ یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے جب دیکھا کہ ہم لوگ یہ چیز سمجھ گئے ہیں یعنی چند دنوں تک تو آپ روزانہ بڑے اہتمام سے ہماری صفوں کو باقاعدہ درست کرتے رہے۔ ایک چیز جب سکھلائی جاتی ہے تو چند دنوں تک بتایا جاتا ہے پھر لوگ جب سیکھ لیتے ہیں اور خود ہی کرنے لگتے ہیں تو بتلانا چھوڑ دیا جاتا ہے، اسی طرح جب آپ نے دیکھا کہ ہمیں صفوں کی درستگی کا طریقہ آ گیا تو پھر آپ نے باقاعدہ اہتمام سے بتانا چھوڑ دیا، اس لئے کہ ضرورت نہیں رہی اور مقصد حاصل ہو گیا کہ لوگ تعلیم پا چکے تھے، اس کے باوجود آپ دیکھ لیتے تھے کہ صفیں ٹھیک ہیں یا نہیں، زبان سے بھی فرما دیا کرتے تھے ﴿سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ﴾ اپنی صفوں کو درست کیجیے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ آپ باقاعدہ ایک ایک کے پاس جا کر درست کیا کرتے تھے، جب لوگ سیکھ گئے تو آپ نے وہ سلسلہ بند کر دیا صرف زبانی کہنے پر اکتفا فرماتے تھے۔

﴿تمہارے چہروں کو پھیر دے گا﴾

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نماز کے لئے تشریف لائے، آپ مصلےٰ پر کھڑے ہوئے اور قریب تھا کہ نماز شروع کرنے کے لئے اللہ اکبر کہیں کہ اچانک ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کا سینہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں ذرا آگے کو نکلا ہوا ہے، تو آپ ﷺ نے اس وقت نماز شروع کرنا چھوڑ کر فرمایا ﴿یَاعِبَادَاللهِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَکُمْ أَوْلَیُخَالِفَنَّ اللهُ بَیْنَ وُجُوْهِکُمْ﴾ اللہ کے بندو! صفوں کو درست کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو پھیر دے گا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صف کے درست کرنے کی بڑی تاکید فرمائی۔

دیکھو! صفوں کا درست کرنا سنت ہے، لیکن اس کی اتنی تاکید فرمائی اور اس سنت کو چھوڑنے کے نتیجے میں کتنا بڑا نقصان آدمی کو بھگتنا پڑتا ہے وہ اس ارشاد میں بتلایا گیا ہے۔ اس سے نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر عمل کا اہتمام معلوم ہوتا ہے۔

﴿سونے سے پہلے آگ بجھا دیا کرو﴾

عن أبی موسٰی رضی اللہ عنہ قال: اِحْتَرَقَ بَیْتٌ بِالْمَدِیْنَةِ عَلیٰ أَهْلِهِ مِنَ اللَّیْلِ، فَلَمَّا حُدِّثَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِشَأْنِهِمْ، قَالَ: اِنَّ هٰذِهِ النَّارَ عَدُوٌّ لَکُمْ، فَاِذَا نِمْتُمْ فَأَطْفِئُوْهَا عَنْکُمْ.

یہاں نبی کریم ﷺ کی مختلف سنتیں بتلائی جارہی ہیں جو معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں اور اس سے بتلانا یہی چاہتے ہیں کہ یہ سنتیں ایسی ہیں کہ ان پر عمل چھوڑنے کے نتیجہ میں آدمی کو اخروی اور دنیوی دونوں طرح نقصان پہنچتا ہے۔ ویسے تو تمام سنتوں کا حال یہی ہے، لیکن چند سنتیں ایسی ہیں جن کا نقصان کھلم کھلا تھا اس لئے اس کو بتلایا جارہا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں ایک مکان

میں آگ لگ گئی اوراس کی وجہ سے مکان کے لوگ بھی سب جل گئے۔ جب نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو! اصل میں ہوا یہ تھا کہ ایک چراغ تھا جس میں تیل تھا اوراس میں بتی تو ہوتی ہی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چوہا اس کی بتی کو کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اوراس زمانہ کے اندر چراغ کھلا ہوتا تھا اس کے اندر بتی ڈالی جاتی تھی اوراسی سے وہ آگ لگ گئی تھی اس وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا ﴿اِنَّ هٰذِهِ النَّارَ عَدُوٌّ لَكُم﴾ یہ آگ تمہاری دشمن ہے، اس لئے جب تم سونے کے لئے جاؤ تو آگ کو بجھا دیا کرو۔

نبی کریم ﷺ نے صرف دین ہی دین نہیں بتایا بلکہ دنیا میں آدمی کس طرح رہے، اور کس طرح زندگی بسر کرے؛ اس کو بھی بڑے اہتمام سے بتلایا ہے۔ اس زمانہ کے اعتبار سے چراغ کو اگر کھلا چھوڑ دیا جاتا تو یہی خطرہ رہتا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے اس کو بجھا دینے کی خاص تاکید فرمائی۔

﴿معاشرت کے چند آداب﴾

بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اور بھی جن جن چیزوں کی تاکید فرمائی ہے ان میں سے یہ ہے کہ دروازے بند کر دیا کرو، برتنوں کو ڈھانک دیا کرو، اگر ڈھانکنے کے لئے آپ کے پاس ڈھکن نہیں ہے تو بسم اللہ بول کر صرف ایک لکڑی ہی آڑی (عرض میں) رکھ دیا کرو۔ اور دروازہ بسم اللہ بول کر بند کرنا چاہیے، اس لئے کہ آدمی جب بسم اللہ بول کر دروازہ بند کرتا ہے، تو شیطان اس کو کھول نہیں سکتا۔ (بخاری شریف ۶۲۹۵)

﴿جن اور بلاؤں سے بچنے کا آسان طریقہ﴾

گھروں کے اندر خاص کر شریر جنوں کے آنے کی وجہ سے گھر والوں کو دشواریاں اور

پریشانیاں پیش آتی ہیں، اگر اس چیز کا اہتمام کیا جائے تو ان سے حفاظت ہو جائے گی۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی قدرت دے رکھی ہے لیکن آدمی اگر بسم اللہ بول کر دروازہ اور کھڑکی وغیرہ بند کردے؛ تو اس کی طاقت نہیں ہے کہ اس کو کھول سکے۔ اگر بسم اللہ بول کر بند کیا گیا تو دوسرے راستہ سے بھی وہ نہیں آسکتا۔

اسی طرح برتن کے اوپر ڈھکن اگر بسم اللہ بول کر آپ نے ڈھانک دیا، تو حدیث میں آتا ہے کہ سال میں ایک رات ایسی آتی ہے کہ جس میں بلائیں نازل ہوتی ہیں، امراض اور بیماریاں آتی ہیں، اگر کوئی برتن کھلا ہوا ہوتا ہے تو اس میں اس کا اثر آجاتا ہے اور اس کے استعمال کے نتیجہ میں گھر والے ان امراض، پریشانی اور بلاؤں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لہٰذا اگر بسم اللہ بول کر ڈھکن ڈھانک دیا جائے، اور اگر ڈھکن نہ ہو تو بسم اللہ بول کر کم از کم ایک لکڑی ہی آڑی رکھ دی جائے؛ تو وہ بلائیں اس میں نہیں آسکتیں۔ یہ روایت بخاری شریف میں موجود ہے (بخاری شریف، ۲۰۱۴) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو ان چیزوں سے بچانے کے لئے کتنا اہتمام کیا ہے۔

اب دیکھئے! آج کل عام طور پر ہر شخص پریشانی کی شکایت کرتا ہے کہ سحر کا اثر ہو گیا، جن کا اثر ہو گیا۔ خاص طور پر سحر کے معاملہ میں تو ہر ایک دوسرے پر بدگمانیاں کرتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ پریشانیاں اٹھاتا ہے، حالانکہ صبح و شام کی ان دعاؤں کا آدمی اگر اہتمام کرے جو نبی کریم ﷺ نے بتلائی ہیں یعنی رات کو سوتے وقت، صبح کو اٹھتے وقت، کھانے سے پہلے، پینے سے پہلے، استنجاء کے لئے جانے سے پہلے اور نمازوں کے بعد جو پڑھنے کے لئے فرمایا گیا ہے؛ ان کا اگر اہتمام کرلیا جائے تو اس میں حضور ﷺ نے شیطان سے حفاظت کے سارے طریقے بتلا دیے ہیں۔

﴿جن اور جادو سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے﴾

دیکھو! دنیا میں کسی سائنس داں نے آج تک کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں کیا کہ جس کے ذریعہ سے آپ اپنے پاس جن کو آنے سے روک سکیں یا کسی نے آپ پر سحر کرانا چاہا، یا سحر کر دیا تو اس سحر کے اثرات سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ آج تک نہ سائنس نے ایسی کوئی ایجاد کی ہے اور نہ آئندہ کر سکے گی۔ اگر آدمی کو ان چیزوں سے بچنا ہے تو ان سے بچاؤ کے لئے وہی طریقے اختیار کرنے پڑیں گے جو حضور ﷺ نے بتلائے ہیں۔ اور ان دعاؤں کی برکات کا اثر لازمی ہے، آدمی ان چیزوں کا اہتمام کرے تو کبھی یہ چیزیں اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔ خیر! اس کی بڑی تفصیل ہے۔ مَیں تو اس وقت یہ کہنا چاہتا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے ہماری خیر خواہی کے واسطے ان چیزوں کو بھی بتایا ہے۔

﴿گیس سلنڈر لاک (LOCK) کر کے سوئیں﴾

یہاں مکان کا جو مسئلہ آپ کے سامنے بیان کیا گیا کہ مکان کو آگ لگ گئی تو آپ نے فرمایا کہ آگ بجھا کر سویا کرو۔ اس جگہ پر علماء نے لکھا ہے کہ اگر آگ یا ہر وہ چیز جو اس نوع کی ہے کہ اس کے باقی رہنے دینے میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے؛ تو اس کو بجھا دیا جائے، اور اگر ایسی چیز ہے جس کے باقی رہنے دینے میں آگ لگنے کا اندیشہ نہیں ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً اس کے بعد کے زمانہ میں جب کہ ابھی یہ بجلی کے قمقمے اور بلب وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے، اور قندیلوں کی ایجاد ہوگئی تھی، لٹکانے والے فانوس تھے، تو اس میں یہ خطرہ باقی نہیں رہا کہ چوہے اس کو کھینچ کر لے جائیں اور اس کی وجہ سے آگ لگے، ایسی چیز کو اگر جلا ہوا چھوڑ دیا جائے؛ تو اس کی اجازت ہے۔ اسی طرح آج کل بلب اور نائٹ لیمپ

ہیں ان کو اگر جلتا رہنے دیں تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

لیکن اس تعلیم سے یہ بات ضرور معلوم ہوئی کہ ہر وہ چیز جس کے متعلق خطرہ اور اندیشہ ہو تو اس سے اپنے آپ کو بچانے کی تاکید ہے جیسے آج کل گیس کے سلنڈر ہیں، گیس سلنڈر والے تو تاکید کرتے ہی ہیں لیکن اس حدیث سے اس کا حکم صاف معلوم ہوتا ہے کہ گیس سلنڈر میں سے گیس کے لیک ہونے کی وجہ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، تو اس کا لاک (Lock) بند کرنے کا اہتمام ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے چراغ کے بجھانے کی تاکید فرمائی کہ اس کے نتیجہ میں آگ لگ سکتی ہے، گیس سلنڈر میں سے بھی اگر گیس لیک ہوگئی تو وہ گھر والوں کے لئے مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔ اور بھی اس طرح کی چیزیں جن سے غفلت برتنے کی صورت میں نقصان پہنچ سکتا ہو؛ ان تمام کا یہی حکم ہے۔ اس روایت سے یہ تعلیمات معلوم ہوتی ہیں۔

﴿ہدایت اور علم نبوی کی ایک مثال﴾

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنَّ مَثَلَ مَابَعَثَنِی اللهُ بِهِ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ کَمَثَلِ غَیْثٍ أَصَابَ أَرْضًا. فَکَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَیِّبَةٌ، قَبِلَتِ الْمَآءَ، فَأَنْبَتَتِ الْکَلَأَ وَالْعُشْبَ الْکَثِیْرَ، وَکَانَ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَکَتِ الْمَآءَ، فَنَفَعَ اللهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا مِنْهَا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا. وَأَصَابَ طَائِفَةً مِنْهَا اُخْرٰی، اِنَّمَا هِیَ قِیْعَانٌ لَاتُمْسِکُ مَآءً وَلَا تُنْبِتُ کَلَاءً، فَذٰلِکَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِیْ دِیْنِ اللهِ وَنَفَعَهُ بِمَابَعَثَنِی اللهُ بِهِ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ. وَمَثَلُ مَن لَّمْ یَرْفَعْ بِذٰلِکَ رَأْسًا، وَلَمْ یَقْبَلْ هُدَی اللهِ الَّذِیْ أُرْسِلْتُ بِهِ. (متفق علیه)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس ہدایت کو لے کر مجھے بھیجا ہے یعنی وہ راستہ جس پر چل کر آدمی

اپنی دنیا اور آخرت کو سنوار سکتا ہے اس کی مثال اور اس علم کی مثال بارش جیسی ہے۔ اگر کسی علاقہ اور زمین میں بارش برسے تو زمینیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو عمدہ قسم کی زرخیز زمین ہوتی ہے جس کا حال تو یہ ہے کہ بارش کا پانی گرا تو اُس نے اس پانی کو اپنے اندر جذب کر لیا اور قبول کر لیا اور اس کے نتیجہ میں گھاس، سبزہ اور کھیتی باڑی اُگ نکلی اور وہ زمین لہلہا اُٹھی۔

دوسری قسم کی زمین وہ ہے کہ وہ خود تو فائدہ نہیں اٹھا سکتی، البتہ گھڑوں کی شکل میں ہونے کی وجہ سے اس نے پانی کو جانے نہیں دیا اور اپنے اندر روک لیا، اب جو پانی گھڑوں میں رہ گیا اس کی وجہ سے لوگوں کو فائدہ پہنچا، لوگوں نے پیا اور اپنے جانوروں کو بھی پلایا اور اپنے کھیتوں کو بھی سیراب کیا۔

تیسری قسم کی زمین وہ ہے جو بالکل سنگلاخ اور پتھریلی زمین ہے کہ جو نہ خود فائدہ اٹھا سکتی ہے، اور نہ اس میں گھڑے ہیں کہ پانی اندر جمع رہتا ہو، بالکل سنگلاخ چٹیل زمین ہے کہ نہ وہاں پانی رک سکتا ہے اور نہ وہاں گھاس اُگ سکتی ہے۔ تو نہ خود اس زمین نے خود کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ دوسروں کو اس سے کوئی فائدہ پہنچا۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس ہدایت اور جس علم کو لے کر مجھے بھیجا ہے وہ بھی اسی بارش کی طرح ہے۔ مَیں نے ہدایت کی باتیں اپنی امت کو بتلائیں، اور جو علم ان کو دیا، اس علم کے معاملہ میں بعض وہ ہیں جنہوں نے علم کو حاصل کر کے دین کی سمجھ حاصل کی اور میرے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہدایت، علم اور کام کی باتیں جس سے لوگوں کو دنیا اور آخرت کا فائدہ پہنچے، اس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو فائدہ پہنچایا ﴿فَعَلِمَ وَعَلَّمَ﴾ لہٰذا انہوں نے خود بھی سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا، خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا۔

بعض وہ ہیں جو علم سیکھتے ہیں لیکن خود عمل نہیں کرتے، البتہ ان کے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ ایسے ہیں جیسے گھڑے والی زمین کہ اس میں سبزہ تو نہیں نکالیکن دوسروں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

اور تیسرے لوگ وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور علم کی باتیں اور دنیا و آخرت کے فائدے کی چیزیں میرے ذریعہ سے بھیجیں اس کی طرف سر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا یعنی دھیان ہی نہیں دیا، ان کی طرف توجہ بھی نہیں کی اور ان کو قبول نہیں کیا کہ اس سے نہ خود ان کو فائدہ ہوا اور نہ دوسروں کو اس کے ذریعہ سے فائدہ ہوا۔

گویا نبی کریم ﷺ کی سنتیں اور آپ کے طریقوں کا معاملہ تو بارش جیسا ہے کہ اگر کوئی آدمی اس کو حاصل کر لے اور دوسروں کو بھی سکھانے کا اہتمام کرے تو اس سے دوہرا فائدہ اُٹھائے گا، اور اگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تو وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

﴿اور تم میرے ہاتھ سے چھوٹ رہے ہو﴾

عَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَثَلِیْ وَمَثَلُكُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَوْقَدَ نَاراً فَجَعَلَ الْجَنَادِبُ وَالْفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيْهَا، وَهُوَ يَذُبُّهُنَّ عَنْهَا، وَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ، وَأَنْتُمْ تَفَلَّتُوْنَ مِنْ يَدِیْ. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال اس آدمی جیسی ہے کہ جس نے آگ جلائی تو پروانے اور کیڑے مکوڑے اُڑ کر اُس آگ کے اندر گرنا چاہتے ہیں اور وہ ان کو وہاں سے ہٹا رہا ہے۔ گویا اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح پُرکشش بنایا ہے اور دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ نے آدمی کے نفس کی چاہت کی چیزوں کو

پھیلا دیا ہے۔جیسا کہ پہلے بھی روایت آئی تھی ﴿وحُفَّتِ النَّارُ بالشَّهَوَاتِ﴾ (مسلم شریف ۵۰۴۹)
جہنم کو اللہ تعالیٰ نے آدمی کی مَن پسند چیزوں کے ذریعہ سے ڈھانپ دیا ہے۔آدمی اُن مَن پسند چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے ان کی طرف لپکتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ مَیں اس کو حاصل کرر ہا ہوں لیکن اس کے نتیجہ میں وہ جہنم کے اندر گرتا ہے۔حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ پتنگے، کیڑے مکوڑے اور پروانے آگ کی چمک دمک دیکھ کر اس میں گرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ان کو ہٹاتا ہے۔وہ یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ اچھی چیزیں ہیں، حالانکہ جیسے ہی اندر گریں گے؛ ہلاک اور برباد ہو جائیں گے۔

اسی طریقہ سے یہ دنیا کی چمک دمک کو دیکھ کر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کے اندر گرنے کی کوشش کرتے ہیں گویا وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تم کو جہنم سے دور کرنے کی اور نکالنے کی کوشش کرتا ہوں اور تم میرے ہاتھ سے چھوٹے جارہے ہو۔مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایسا حال ہے جیسے کوئی بچہ گرنے جارہا ہو اور اس کو پکڑ لیا جائے لیکن وہ قابو میں نہ آوے اور چھوٹ کر بھاگ جائے اور گر جائے۔نبی کریم ﷺ اپنے ارشادات، اپنی ہدایات اور رہنمائی کے ذریعہ سے ہمیں ان چیزوں سے- جو جہنم میں لے جانے والی ہیں- تاکید کر کے بچارہے ہیں، گویا آپ ﷺ ہمیں پکڑ رہیں ہیں، لیکن ہم ان چیزوں کی خلاف ورزی کر کے اور آپ ﷺ کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو اس ہلاکت کے اندر گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

﴿کھانے کی دو سنتیں﴾

وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَمَرَ بِلَعْقِ الْأَصَابِعِ وَالصَّحْفَةِ وَقَالَ: اِنَّكُمْ لاَ تَدْرُوْنَ فِيْ أَيِّهَا الْبَرَكَةُ. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آدمی جب کھانا کھانے سے فارغ ہوتو انگلیوں کے چاٹ لینے کا اور پلیٹ کے صاف کر لینے کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے۔

ایک تو یہ کہ پلیٹ میں کھانا بچ گیا ہے پھر تو صاف کرنے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ کھانا بچا ہوا ہے تو اس کو اس طرح کر دے کہ اگر کوئی دوسرا آدمی کھانا چاہے تو اسے گھن نہ آئے۔اس کا مطلب یہ لینا کہ پلیٹ میں کھانا بچایا ہی نہ جائے؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کھانا نہیں بچا اور کھا چکے ہیں تو اب پلیٹ میں جو اِدھر اُدھر لگا ہوا ہے؛ اس کو صاف کرلو۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں اس میں سے کون سے دانے میں اور کھانے کے کونسے حصے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت رکھی ہوئی ہے۔

برکت کا حال لاٹری جیسا ہے

برکت کا حال تو لاٹری جیسا ہے۔جو لاٹری نکالنے والے ہوتے ہیں وہ اس امید میں نکالتے ہیں کہ ہمارا نام لگ جائے گا،اس کے لئے خوب پیسے لگاتے ہیں۔اور یہاں اللہ کا رسول جب یہ فرمارہا ہے کہ کھانے کے کون سے حصے اور دانے میں برکت رکھی ہوئی ہے؛ یہ معلوم نہیں،اس لئے جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو چاٹ لو اور برتن کو صاف کرلو۔

کیا انگلیاں اور برتن چاٹنا؛ خلافِ تہذیب ہے؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ روایت خاص طور پر اس لئے لائے ہیں کہ بعض لوگ نعوذ باللہ انگلیاں چاٹنے اور برتن صاف کرنے کو تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں،حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے اندر تہذیب سکھانے کے واسطے آئے تھے۔

دیکھو! بندے کا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ وہی ہے جو ایک غلام کا اپنے آقا سے ہوا کرتا ہے۔ اگر آقا سامنے موجود ہو اور وہ غلام کو کوئی چیز کھانے کے واسطے دے تو آپ اندازہ لگایئے کہ اس دی ہوئی چیز میں سے اگر ذرا سا بھی نیچے گر گیا تو کیا وہ غلام اس کو نیچے گرا ہوا رہنے دے گا؟ نہیں! بلکہ وہ یہ خیال کرے گا کہ جس آقا نے مجھے یہ چیز دی ہے، مَیں اس کے سامنے بیٹھ کر کھا رہا ہوں۔ اس لئے جو گرا ہوا ہوگا؛ اس کو اٹھا کر صاف کئے بغیر ہی کھا جائے گا، صاف کرنے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کرے گا، اس لئے کہ اس کو تو اپنے آقا کی خوشنودی چاہیے۔ جب ہم اللہ کے بندے ہیں اور جو کچھ ہمارے پاس ہے؛ وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے اور اس کی نعمت ہے، اس لئے اس کو ہمیں پورے اہتمام سے استعمال کرنا چاہیے۔ جیسے ایک غلام اپنے آقا کے ساتھ معاملہ کرتا ہے، ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر معاملہ کرنا چاہیے۔ ہم تو بندے ہیں اور وہ خالق و مالک ہے۔ انگلیوں کے چاٹنے اور پلیٹ صاف کرنے کو جو لوگ خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں وہ کبر کی وجہ سے سمجھتے ہیں۔ بات وہی آ گئی جو ابھی دائیں ہاتھ سے کھانے والی گذری کہ کبر کی وجہ سے اگر آدمی کوئی بات خلافِ سنت کہتا ہے؛ تو وہ خود اپنا ہی دنیا و آخرت کا نقصان کرتا ہے۔

﴿پھر بھی ہم ان کے دل دادہ ہیں﴾

آج کوئی سائنس داں اگر یہ اعلان کر دے کہ انگلیاں چاٹنے کی وجہ سے یہ فائدہ ہے کہ کبھی کسی کو قلب کا دورہ نہیں پڑے گا، یا اگر کھا کر انگلیاں چاٹ لے تو کبھی اس کی کڈنی (Kidney) خراب نہیں ہوگی؛ تو مَیں سمجھتا ہوں وہ لوگ جو یوں کہتے ہیں کہ یہ کام تہذیب کے خلاف ہے، وہی لوگ سب سے پہلے انگلیاں چاٹنا شروع کر دیں گے، حالانکہ جس سائنس داں نے یہ تحقیق کی اور اعلان کیا اس کے علم کی حیثیت کیا ہے؟ ان کی تحقیقات کا عالم تو

یہ ہے کہ آج انہوں نے ایک تحقیق کی اور اعلان کیا تو دس سال کے بعد پھر اپنی اس تحقیق سے وہ رجوع کر کے دوسری بات بتلاتے ہیں۔لیکن پھر بھی ہم ان کے دلدادہ ہیں اور ان کی چیزوں پر ہمیں اتنا یقین ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاک رسول ﷺ جن کی اتباع اور پیروی ہمارے لئے سرخ روئی اور عزتوں کا سبب ہے، ان کے معاملہ میں ہمارا یہ حال ہے۔

﴿ہمارا حال اتباعِ سنت میں وہی ہونا چاہیے تھا......﴾

ہمارا حال تو اتباعِ سنت کے معاملہ میں وہ ہونا چاہیے جو حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے، اس زمانہ میں فارس کی حکومت فتح ہو چکی تھی، ایران کا پورا علاقہ مسلمانوں کے ماتحت آچکا تھا اور قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں اس زمانہ کی دو بڑی سلطنتیں اور سپر پاور (Super Power) اور بڑی طاقتیں سمجھی جاتی تھیں، وہ بھی فتح ہو چکی تھیں اور ایرانیوں اور رومیوں کی تہذیب اس زمانہ کی اونچی تہذیب سمجھی جاتی تھی۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ کھانا کھا رہے تھے، کھاتے کھاتے لقمہ نیچے گر گیا تو اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھالیا۔ان کے ساتھ ان کا خادم تھا جو ایرانی النسل تھا اس نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے یوں کہا: آقا! آپ کیا کر رہے ہیں؟ گرا ہوا لقمہ اٹھا کر کھالیا؟ یہاں کے لوگ اس کو عیب سمجھتے ہیں۔اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا ہے وہ ہمیں نوٹ کرنا چاہیے۔فرمایا ﴿أَ أَتْرُکُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ؟﴾ ان بے وقوفوں کے واسطے کیا میں اپنے حبیبِ پاک ﷺ کی سنت چھوڑ دوں گا؟ انہوں نے کوئی خیال نہیں کیا کہ یہ لوگ کیا سمجھیں گے: ؎

لوگ سمجھیں مجھے محرومِ وقار و تمکین ❁ پر وہ نہ سمجھیں میری بزم کے قابل نہ رہا

ہمیں تو اللہ کو اور اس کے رسول کو اچھا دکھلانا ہے، وہ ہمیں اچھا سمجھ لیں؛ بس یہی کافی ہے، پھر دنیا چاہے جو سمجھنا ہو؛ سمجھتی رہے، اس سے ہمیں کیا مطلب ہے۔

اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے؟

دنیا کا حال تو یہ ہے کہ ایک آدمی اچھا سمجھے گا تو دوسرا شخص برا سمجھے گا، اور ان کے اچھا سمجھنے اور نہ سمجھنے سے ہمارا کون سا فائدہ ہو جانے والا ہے؟ آپ کی فیکٹری میں کوئی برکت ہو جائے گی، نفع کی شرح بڑھ جائے گی کہ آج پچاس فیصد نفع ہوتا ہے اور وہ اچھا سمجھیں گے تو سو فیصد ہو جائے گا؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ تو جن کی خود ہی کوئی حیثیت نہ ہو، ان کے اچھا سمجھنے نہ سمجھنے سے ہم اپنے زندگی کے طریقوں کو بدلیں اور نبی کریم ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقوں سے منہ موڑ لیں؛ اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ واقعۃً حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا کہ ان بے وقوفوں کی وجہ سے کیا میں اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے طریقوں کو چھوڑ دوں گا؟ یہ بڑا ہی ایمان افروز اور عبرت آموز جواب ہے۔ کاش! ہماری سمجھ میں آجائے۔

بہر حال! حضور ﷺ نے فرمایا ﴿اَنَّکُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِیْ اَیِّهَا الْبَرَکَة﴾ یہ جملہ کتنا عمدہ ہے "تمہیں معلوم نہیں کہ کون سے دانے میں اور کون سے جزو میں برکت رکھی ہوتی ہے" یہ فرما کر آپ ﷺ نے ہمیں کیسی اچھی تعلیم دے دی۔ اب ہمارا حال یہ ہونا چاہیے کہ کھانے کا کوئی حصہ چھوٹنے نہ پاوے، اور برتن کو برابر صاف کر لیا کریں۔

کھانے کے متعلق دیگر تعلیمات

پھر دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ اگر پلیٹ کو صاف کر لیں گے تو پلیٹ بھی آدمی کو

دعا دیتی ہے ﴿اِذَا وَقَعَتْ لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا﴾ جب کسی کا لقمہ کھاتے ہوئے نیچے گر جائے تو وہ اسے اُٹھالیوے ﴿فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أَذًى﴾ اور نیچے گرنے کی وجہ سے غبار مٹی وغیرہ اگر کچھ لگ گئی ہے تو اس کو صاف کر کے کھالے، اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے ﴿وَلَا يَمْسَحْ يَدَهُ بِالْمِنْدِيلِ حَتّٰى يَلْعَقَ أَصَابِعَهُ﴾ بلکہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آپ ہاتھ دھونے کے بجائے رومال سے پونچھ رہے ہیں یا ہاتھ دھو رہے ہیں تو جب تک کہ انگلیوں کو چاٹ کر صاف نہ کر لیں وہاں تک ہاتھ نہ دھوئیں۔ اس لئے کہ اگر آپ انگلیاں چاٹے بغیر ہاتھ دھوئیں گے تو کھانے کے وہ ذرّات جو انگلیوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، وہ دھلنے میں نکل جائیں گے اور اگر ان میں برکت ہوئی تو اس سے محروم رہ جائیں گے۔

﴿برکت کا ایک مطلب﴾

دیکھو! برکت کا مطلب یہ ہے کہ کھانے کا وہ حصہ جس کے بدن میں پہنچنے کے نتیجے میں پھر کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اب تو ہمیں اپنے جسم کو بیماریوں سے بچانے کے لئے بھی اس کا اہتمام کرنے کی خاص ضرورت ہے۔ اگر یہی نیت کر لیں کہ برکت والا حصہ اندر چلا گیا تو کبھی کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے، تو اس کے نتیجے میں بھی اللہ تعالیٰ بہت ساری بیماریوں سے حفاظت فرما دیں گے۔

خیر! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب تک انگلیاں چاٹ نہ لے وہاں تک اس کو رومال سے نہ پونچھے یا ہاتھ نہ دھوئے ﴿فَإِنَّهُ لَا يَدْرِيْ فِيْ أَيِّ طَعَامِهِ الْبَرَكَةُ﴾ پھر وہی بات آئی کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے وہ معلوم نہیں ہے۔

﴿شیطان نے قسم کھائی ہے﴾

ایک اورروایت میں ہے:﴿اِنَّ الشَّیطَانَ یَحضُرُ أَحَدَکُم عِندَ کُلِّ شَیئٍ مِن شَأنِہٖ﴾ یہ اصل بات آئی کہ شیطان ہماراازلی دشمن ہے، پہلے روز سے اُس نے توقسم کھائی ہے۔جب اس کو ہمارے ابا حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھاتواس حکم کواس نے نہیں مانااوراس کے نتیجے میں ہی وہ مردود بنااوراللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا،تواسی دن سے پوری انسانیت سے اس نے دشمنی کرلی،اوراس نے تواللہ تعالیٰ کے سامنے ہی کہا کہ مَیں ان کو گمراہ کروں گا﴿لَاٰتِیَنَّھُم مِن بَینِ أَیدِیھِم وَمِن خَلفِھِم وَعَن أَیمَانِھِم وَعَن شَمَائِلِھِم﴾ آگے سے، پیچھے سے،دائیں سے،بائیں سے ہرطرف سے مَیں ان کےاوپراٹیک(Attack) اورحملہ کروں گااوراللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کومہلت دی گئی۔بہرحال!شیطان تم میں سے ہرایک کے پاس اس کے ہرکام میں حاضری دیتاہے﴿حَتّٰی یَحضُرَہٗ عِندَطَعَامِہٖ﴾ یہاں تک کہ کھاتے وقت بھی شیطان آتا ہے۔

﴿یہ بسم اللہ کی برکت ہے﴾

دیکھو!شیطان انسان کی ہرایک چیز میں حصہ لگاتاہے۔کھانے میں،پینے میں، سونے میں،مکان کے اندررہنے میں،بیوی کے ساتھ صحبت کرنے تک میں حصہ لگاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جودعائیں سکھائی ہیں،ہردعامیں بسم اللہ ہےاورساتھ میں ایک دعاہے،تو ان دعاؤں کامطلب کیاہے؟جب آدمی استنجاءاورقضائے حاجت کے لئے بیت الخلاء میں جاتاہےتووہاں بھی شیطان آدمی کی شرم گاہ سے کھیلتاہےلیکن اگرآپ بسم اللہ بول کراوریہ دعا ﴿بسم اللہ!أَللّٰھُمَّ اِنِّی أَعُوذُبِکَ مِنَ الخُبُثِ وَالخَبآئِثِ﴾ پڑھ کرگئے؛توبس!اس کے بعد

وہ آدمی کی شرم گاہ دیکھ بھی نہیں پاتا، اس کو کچھ نظر ہی نہیں آتا، اس کے اور آدمی کے درمیان پردہ اور آڑ ڈال دی جاتی ہے، پھر اس کو طاقت نہیں رہتی کہ کچھ کر سکے۔ دیکھئے! یہ بسم اللہ کی برکت ہے۔

پرانے زمانہ کی عورتیں ہر کام میں بسم اللہ کا بڑا اہتمام کرتی تھیں، کباٹ کا دروازہ کھولا تو بسم اللہ، نعمت خانے کا دروازہ کھولا تو بسم اللہ، چائے بنا رہی ہیں تو بسم اللہ، ہر چیز میں اس کا بہت اہتمام کیا کرتی تھیں۔ اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ آج کل یہ سلسلہ بھی ہمارے گھروں سے رخصت ہو گیا ہے۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہے وہ اپنی جگہ پر رہا، آداب بھی سکھلائے جاتے ہیں لیکن عملی طور پر ان چیزوں کے بولنے کا جو اہتمام ہونا چاہیے، وہ اہتمام نہیں رہا۔ اسی لئے جب دعائیں چھوڑی جا رہی ہیں تو اس کے نقصانات ہم بھگت رہے ہیں بہر حال! کھانے میں بھی شیطان حاضر ہوتا ہے، اسی لئے بسم اللہ سکھلائی گئی کہ بسم اللہ بول کر کھاؤ، تاکہ شیطان تمہارے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہو سکے۔

مؤمن کے شیطان کی کافر کے شیطان سے ملاقات

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ مؤمن کے شیطان کے ساتھ کافر کے شیطان کی ملاقات ہوئی، تو دیکھا کہ کافر کا شیطان تو بڑا تازہ اور بڑا مست، بڑا صحت مند اور لباس والا تھا اور مؤمن کا شیطان بہت کمزور، بھوکا پیاسا اور ننگا تھا۔ اس نے کافر کے شیطان سے کہا کہ تو بہت تر و تازہ ہے، لباس پہنے ہوئے ہے اور مَیں تو بھوکا پیاسا ہوں اور ننگا ہوں، یہ مجھے تو موقعہ ہی نہیں دیتا، کھانے بیٹھتا ہے تو بسم اللہ، پانی پیتا ہے تو بسم اللہ، لباس پہنتا ہے تو بسم اللہ، مومن تو ہر چیز میں بسم اللہ بولتا ہے، اور جب وہ بسم اللہ بولتا ہے تو مَیں محروم ہو جاتا ہوں، نہ

کھانے میں میرا حصہ لگتا ہے، نہ پینے میں، نہ لباس میں حصہ لگتا ہے۔ اس لئے مَیں تو منتظر ہی رہتا ہوں کہ یہ بسم اللہ بھول جائے؛ تو میرا کچھ حصہ لگے۔ (المعجم الکبیر ۸۶۹۴)

﴿شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو؟﴾

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ اگر کھانے کے شروع میں آدمی بسم اللہ پڑھنا بھول گیا تو شیطان شریک ہوجاتا ہے، جب درمیان میں یاد آجائے تو حضور ﷺ نے ہم کو بتلایا کہ یوں پڑھ لو ﴿بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ﴾ (مسند احمد، ۱۸۱۹۵) اس کا مطلب ہے کہ اللہ ہی کے نام سے شروع سے لے کر آخر تک۔ حالانکہ بیچ میں ہم بول رہے ہیں؛ لیکن اللہ کے رسول نے یہ طریقہ سکھلادیا کہ شروع سے لے کر آخر تک بول دو؛ تو شیطان نے اب تک جو کھالیا تھا وہ اس کو قے کر کے نکال دینا پڑتا ہے، وہ اس کے پیٹ میں نہیں رہ سکتا۔ حضور ﷺ کی کیا بہترین تعلیم ہے۔

﴿یہ کوئی دانشمندی ہے؟﴾

بہرحال! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شیطان تم میں سے ہر ایک کی ہر چیز میں آنا چاہتا ہے یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی وہ موجود رہتا ہے، اب بسم اللہ پڑھی تو کھانے میں تو شریک نہیں رہے گا، لیکن اگر تم میں سے کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے؛ تو وہ چوٹّا (ابن ماجہ) تو تیار ہی بیٹھا ہے، اور انتظار میں ہے، ویسے تو کھانے میں شریک نہیں ہوسکا لیکن جب لقمہ گرے تو اس کو چھوڑ مت دینا؛ ورنہ وہ کھا جائے گا۔ اس کو تو بھوکا ہی رکھنا ہے، وہ تو ہمارا دشمن ہے، اس کو تو کوئی فائدہ پہنچانا ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس کے اندر اگر کچھ غبار دھول وغیرہ بھی لگی ہو تو اس کو دور کرو اور کھالو اور اس کو شیطان کے لئے مت چھوڑیو، اس لئے کہ شیطان کے

لئے چھوڑو گے تو وہ کھا کر آپ کے ہی مقابلہ کے لئے قوت حاصل کرے گا۔ یہ کوئی دانشمندی کی بات ہے کہ اپنے دشمن کو ہم ہی تقویت پہنچائیں، اس کو ہم جتنا بھی کمزور کر سکتے ہوں؛ اتنا کمزور کرنا چاہیے۔

﴿حشر کے دن کی نفسا نفسی﴾

عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَامَ فِيْنَا رسولُ اللهِ ﷺ بِمَوْعِظَةٍ فَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّكُمْ مَحْشُوْرُوْنَ إِلَى اللهِ تَعَالٰى حُفَاةً عُرَاةً ﴿كَمَا بَدَاْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيْدُهُ وَعْداً عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ﴾ أَلَا! وَإِنَّ أَوَّلَ الْخَلائِقِ يُكْسىٰ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِبْرَاهِيْم علیہ السلام. أَلَا! وَإِنَّهُ سَيُجَآءُ بِرِجَالٍ مِنْ أُمَّتِيْ، فَيُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ، فَأَقُوْلُ: يَارَبِّ أَصْحَابِيْ؛ فَيُقَالُ إِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكَ، فَأَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْداً مَّادُمْتُ فِيْهِمْ﴾ الیٰ قولہٖ ﴿الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ فَيُقَالُ لِيْ: اِنَّهُمْ لَمْ يَزَالُوْا مُرْتَدِّيْنَ عَلٰى أَعْقَابِهِمْ مُنْذُ فَارَقْتَهُمْ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ہمارے درمیان ایک وعظ ارشاد فرمایا، ہم کو نصیحت فرمائی، تقریر کی اور خطبہ دیا۔ اس میں آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم اللہ تعالیٰ کی طرف دوبارہ زندہ کر کے ایسی حالت میں لے جائے جاؤ گے کہ تمہارے پیر ننگے ہوں گے، جسم برہنہ ہوں گے اور جیسا بچہ بغیر ختنہ کے پیدا ہوتا ہے ایسے غیر مختون ہوگے۔ یعنی قیامت کے روز دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو سب کو ایسی حالت میں اُٹھایا جائے گا کہ کسی کے پیر میں جوتا نہیں ہوگا، کھلے پیر اور کھلے بدن، کسی کے جسم پر لباس بھی نہیں ہوگا۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا:

یارسول اللہ! جب برہنہ اور کھلے جسم ہوں گے تو ایک آدمی دوسرے کے ستر کو دیکھے گا؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہوگا (مسلم شریف ۲۸۵۹) مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو حالات درپیش ہوں گے اس کے پیش نظر کسی کو یہ فرصت اور موقعہ ہی کہاں ہوگا کہ دوسرے کی ستر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔

آدمی فرصت کے اوقات میں ایسی حرکتیں کرتا ہے، کوئی مصیبت آپڑی ہو اور جان کے لالے پڑ رہے ہوں تو ایسے وقت میں ایسی چیزوں کی طرف توجہ نہیں جاتی۔ جب لوگ دوبارہ پیدا کر کے اُٹھائے جائیں گے اس وقت برہنہ ہوں گے اس کے باوجود کوئی کسی کے ستر کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کرے گا اور غیر مختون ہوں گے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ ہم نے جس طرح تم کو شروع میں پیدا کیا تھا؛ اسی طرح دوبارہ تم کو پیدا کریں گے، یہ ہم پر ایک وعدہ کے طور پر ضروری ہے اور ہم اس کو کر کے رہیں گے۔

شروع میں جب بچہ ماں کے پیٹ سے دنیا کے اندر آتا ہے تو جوتے پہن کر نہیں آتا، کپڑا پہنا ہوا نہیں آتا، ختنہ کیا ہوا نہیں آتا۔ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو جس ہیئت وحالت میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مردوں کو دوبارہ اسی حالت میں زندہ فرمائیں گے، بس! اتنا ہے کہ بچہ جسمانی اعتبار سے چھوٹا ہوتا ہے اور یہ اپنے قد میں ہوں گے

﴿سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جوڑا عطا کیا جائے گا﴾

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب سب ہی لوگ بغیر لباس کے ہوں گے تو حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک

جوڑا عنایت ہوگا۔اب سوال ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے؟ تو بعضوں نے تو اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ جس وقت نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے اندر ڈالا تھا تو آپ کا لباس اتروا کر ڈالا تھا۔ چونکہ اللہ کے راستہ میں آپ نے یہ تکلیف اُٹھائی تھی اور آدمی اللہ کے راستہ میں جیسا مجاہدہ کرتا ہے اسی کے مناسب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بدلہ عطا کیا جاتا ہے۔ جب انھوں نے اپنے آپ کا برہنہ ہونا منظور کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام لوگوں کے سامنے سب سے پہلے جوڑا عطا کیا جائے گا۔

﴿بدعت کی نحوست، آبِ کوثر سے محرومی﴾

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میری اُمت کے کچھ لوگوں کو لایا جائے گا، چونکہ اس وقت نبی کریم ﷺ اپنے اُمتیوں کو حوضِ کوثر سے پانی پلائیں گے، اس وقت کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس آئیں گے جن پر آپ کے امتی ہونے کی علامت بھی ہوگی یعنی وضو کی وجہ سے چہرے اور ہاتھ، پاؤں پر روشنی ہوگی اور آپ کے پاس وہ پانی پینے کے واسطے آئیں گے اور آپ ان کو پانی پلانے کے لئے آگے بڑھیں گے، اس وقت ان کو بائیں طرف لے جایا جائے گا یعنی وہ لوگ حضور ﷺ کے پاس پہنچیں اور حضور کی طرف سے ان کو پانی پلایا جائے اس سے پہلے ہی فرشتے بیچ میں آڑ ڈال دیں گے اور ان کو پکڑ کر لے جائیں گے، وہاں سے ہٹا دیں گے اور نکال دیں گے کہ یہاں سے ہٹو ﴿فَأَقُوْلُ: یَارَبِّ أَصْحَابِیْ﴾ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس موقعہ پر مَیں اللہ تعالیٰ سے عرض کروں گا کہ یا اللہ! یہ تو میرے امتی ہیں اور میرے لوگ ہیں، کیوں ان کو یہاں سے ہٹایا جا رہا ہے؟ اور کیوں میری طرف سے دیے جانے والے آبِ کوثر سے ان کو محروم رکھا جا رہا ہے؟ اس وقت مجھ سے یہ کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم

نہیں کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا نئی نئی چیزیں ایجاد کیں۔

جو لوگ بدعتیں ایجاد کرتے ہیں اور دین کے اندر نئے طریقے جاری کرتے ہیں ان کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ وہ لوگ بدعت کی نحوست کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں جامِ کوثر سے محروم رکھے جائیں گے۔ (اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْہُ)

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں اس وقت وہی آیت پڑھوں گا اور وہی بات کہوں گا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہی ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ﴾

﴿حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حساب﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باری تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز نصاریٰ کے متعلق سوال کیا جائے گا ﴿أَءَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اے عیسیٰ! کیا آپ نے ان کو حکم دیا تھا اور تعلیم دی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میری اور میری ماں کی پوجا اور عبادت کرو؟ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کو خدا مانتے ہیں، حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ جو تین خدا کے قائل ہیں وہ ان کی پوجا کرتے ہیں اور لوگوں کو یہی بتلاتے ہیں کہ یہی ہمارا دین ہے۔ تو جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے ناواقف ہیں شاید ان کو تو یہی غلط فہمی ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی نے ان کو یہ تعلیم دی ہوگی، جب کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دین میں یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا مانا جائے اور ان کو معبود مانا جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے معاملہ میں بہت باغیرت ہیں۔ اگر کسی نبی کی ذات پر ذرا سا شبہ بھی آرہا ہو تو اس کو فوراً دور کر دیا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں اس کے مختلف نمونے موجود ہیں۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے متعلق ان کے ماننے والوں کی روش اور ان کے اس طرزِ عمل سے شبہ پیدا ہو سکتا تھا اور ممکن ہے کوئی ناواقف یوں

سمجھ بیٹھتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہی ان کو یوں کہا ہوگا؛ لہٰذا حضرت عیسیٰ پر آنے والے اس الزام اور ان کے متعلق پیدا ہونے والی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز برسرِ محشر تمام لوگوں کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ اے عیسیٰ! کیا آپ نے لوگوں کو یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ہماری پوجا اور عبادت کرو؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب میں اپنی براءت پیش کریں گے ﴿سُبْحٰنَکَ مَایَکُوْنُ لِیْ أَنْ أَقُوْلَ مَالَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْعَلِمْتَہٗ تَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِیْ وَلَاأَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِکَ﴾ باری تعالیٰ! تیری ذات تو پاک ہے، بھلامیں ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہوں جسے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے، اور میرے دل میں جو کچھ بھی ہے وہ سب تو بخوبی جانتا ہے، میرے اعمال سے تو بخوبی واقف ہے۔ یہ جواب حضرت عیسیٰ علیہ السلام میدانِ حشر میں اولین وآخرین تمام لوگوں کے سامنے دیں گے، گویا سب کو پتہ چل جائے گا، جو ناواقف تھے وہ بھی سمجھ جائیں گے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات نہیں تھی بلکہ ان لوگوں نے اپنے دین میں ایک چیز گھڑ لی تھی۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام براءت فرمائیں گے اور اس سے پہلے قیامت کے دن پیش آنے والے اس واقعہ کی اطلاع اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اتار کر دنیا میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی براءت پیش کردی۔ اس وقت تو ہوگی ہی؛ لیکن اس سے پہلے ہی قرآن کے ذریعہ سے ان کی براءت کا اعلان کردیا گیا۔

چونکہ نصاریٰ نے اپنے دین میں ایک ایسی چیز بڑھالی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں سے نہیں تھی تو اسی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے ﴿وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ

شَهِيداً مَّا دُمْتُ فِيهِمْ. فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ﴾ اے اللہ! جب تک کہ مَیں ان کے درمیان موجود رہا؛ مَیں ان کے حالات کی نگرانی کرتا رہا اور جب تو نے مجھے اُٹھا لیا تو پھر تو ہی ان کے حالات سے واقف ہے جو انہوں نے کیا۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نصاریٰ کے اس عمل سے اور نصاریٰ نے ان کی تعلیمات میں جو تبدیلی کی اس سے اپنی براءت کا اظہار کر رہے ہیں۔

﴿تعلیماتِ نبوی کو پس پشت ڈالنے والوں کا میدانِ محشر میں کیا حشر ہوگا؟﴾

تو نبی کریم ﷺ بھی اس موقعہ پر عرض کریں گے جب کہ آپ کے ان امتیوں کو (جنہوں نے دین کے اندر نئی باتیں گھڑی تھیں اور ان کو دین کا ایک حصہ قرار دیا جس کو بدعت کہتے ہیں) آپ ﷺ کے پاس آنے نہیں دیا جائے گا، حالانکہ آپ ﷺ تو چاہیں گے کہ ان کو جامِ کوثر پلائیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ وہ آگے بڑھیں گے لیکن فرشتے آ کر ان کو پکڑ کر لے جائیں گے، اس وقت حضور ﷺ عرض کریں گے کہ یہ تو میرے امتی ہیں ان کو کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ آپ کو جواب دیا جائے گا کہ انہوں نے دین میں نئی چیزیں گھڑ لی تھیں، اس لئے ان کو اس سے محروم رکھا جائے گا۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کے بعد یہ لوگ برابر دین کے اندر پیچھے ہٹتے رہے اور آپ کی تعلیمات کو چھوڑ کر نئے طریقے اختیار کرتے رہے۔

بس! یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی سنت کی پیروی اور اتباع اتنا ضروری ہے کہ اگر آپ کے طریقوں کو چھوڑ دیں گے تو قیامت کے روز نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں حوضِ کوثر کا جام نصیب نہیں ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حفاظت فرمائے اور ہمیں سنتوں کا اہتمام نصیب فرمائے
اور نبی کریم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے حوضِ کوثر کا جام بھی ہمیں نصیب فرمائے

﴿بیٹھے بیٹھے بلا وجہ کنکریاں پھینکنا﴾

عن أبی سعید عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ قال: نَهٰی رسولَ اللهِ ﷺ عَنِ الْخَذْفِ. وقَالَ: اِنَّهُ لا یَقْتُلُ الصَّیْدَ وَلا یَنْكَأُ الْعَدُوَّ، وَاِنَّهُ یَفْقَأُ الْعَیْنَ، وَیَکْسِرُ السِّنَّ.

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چھوٹی کنکری پھینک کر مارنے سے منع فرمایا۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بیٹھے بیٹھے فرصت کے موقعہ پر یوں (انگوٹھے پر رکھ کر) کنکری مارتے ہیں۔ اس کو عربی میں ''خَــذْف'' کہتے ہیں۔ تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹھے ہوئے اس طرح کنکری ماری اور اتفاقاً کوئی شخص وہاں سے گذر رہا تھا، اس کی آنکھ میں لگ گئی اور اس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ یا کسی کے دانت کو لگ گئی اور اس کا دانت ٹوٹ گیا۔ اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ شکار کرنے کے کام تو آتی نہیں، اور نہ دُشمن کو مار بھگاتی ہے، بلکہ کسی کی آنکھ پھوڑ دے گی یا دانت توڑ دے گی۔ اس لئے خاص کر آبادی کے اندر حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ کوئی آدمی آبادی سے باہر ہو تو وہاں کوئی اشکال نہیں، لیکن آبادی میں بیٹھے ہوئے اس طرح مارنا کہ پتہ نہیں کون کب گذر جائے؛ اس کی اجازت نہیں ہے۔

﴿عام گزرگاہوں میں کرکٹ وغیرہ کھیل کھیلنا﴾

اسی لئے آبادی کے اندر ایسے کھیل کھیلنا جس میں کسی کو لگ جانے کا احتمال ہو؛ اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ جیسے راستہ میں گلّی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلنا جس کی بال کسی کو

لگ جائے یا اور کوئی چیز آنے جانے والوں کو لگے۔ ویسے بھی راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا کہاں جائز ہے؟ جہاں ایمان کے ستّر سے اوپر شعبے بتلائے گئے ہیں اس میں ایمان کا معمولی درجہ یہ بتلایا گیا ﴿اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ﴾ لوگوں کو تکلیف پہنچانے والی چیز کو راستہ سے دور کرنا۔ کانٹا، پتھر یا کوئی اور چیز پڑی ہوئی ہے جس سے گذرنے والوں کو تکلیف ہو سکتی ہے: اس کو ہٹانا بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ جب کوئی چیز پڑی ہو؛ اس کے ہٹانے کو ایمان کا ایک حصہ قرار دیا گیا تو پھر خود ہماری طرف سے ایسی صورتیں پیدا کرنا جس کی وجہ سے آنے جانے والوں کے لئے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہوں؛ اس کی کہاں اجازت دی جائے گی؟

﴿راستہ میں موٹر گاڑی کھڑی کر دینا﴾

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ اپنی گاڑی کو راستہ میں اس طرح کھڑی کر دینا کہ دوسری گاڑی والوں کو یا آنے جانے والوں کو تکلیف ہو؛ یا پارکنگ اس طرح کر دینا کہ جس کی وجہ سے گذرنے والوں کو تکلیف ہو؛ یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حرام لکھا ہے۔ اس لئے کہ یہ دوسروں کو تکلیف پہنچانا ہے اور کسی کو تکلیف پہنچانا حرام اور ممنوع ہے۔ اسی لئے کوڑا کرکٹ راستہ میں ڈالنا بھی ممنوع ہے۔ یہ سب اسلام کی تعلیمات ہیں۔ ہم نے ان ساری چیزوں کو چھوڑ دیا جس کی وجہ سے اس کی تکلیفیں بھگت رہے ہیں، اور یہی اسلامی تعلیمات غیروں نے اور یوروپ والوں نے اپنا رکھی ہیں؛ تو وہ اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں، اور ان کی ظاہری زندگی پُرسکون ہے، چاہے ایمان کی دولت سے محروم ہونے کے وجہ سے اوپر جا کر بھگتیں گے، لیکن ظاہر میں دنیوی زندگی گذارنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے ہمیں جو اصول بتلائے تھے، وہ انہوں نے اپنائے: تو اس کا فائدہ بھی وہ لوگ محسوس کر رہے ہیں۔

﴿صحابہ کے یہاں آنحضور ﷺ کی تعلیمات کی اہمیت﴾

یہ روایت لا کر اصل قصہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ گذر رہے تھے تو ان کے خاندان کا کوئی بچہ جو اُن کا رشتہ دار تھا وہ اس طرح کنکریاں پھینک رہا تھا۔ انہوں نے اس کو کہا کہ دیکھو! اس طرح کنکری مت پھینکو، نبی کریم ﷺ نے اس طرح کنکری پھینکنے سے منع کیا ہے۔ اور یہی روایت سنائی کہ کنکری سے کوئی شکار تو ہوتا نہیں، کسی کی آنکھ پھوٹ جاتی ہے، کسی کا دانت ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر اس کے پاس سے چلے گئے۔ دوبارہ جب آئے تو دیکھا کہ وہ بچہ اسی میں مشغول ہے تو انہوں نے اس سے کہا کہ اچھا! مَیں نے تم کو نبی کریم ﷺ کا ارشاد سنایا کہ حضور ﷺ نے اس فعل سے منع کیا ہے، اور تمہارے علم میں یہ بات آجانے کے بعد بھی تم یہی کر رہے ہو؟ ﴿لا أُكَلِّمُكَ أَبداً﴾ انہوں نے قسم کھالی کہ زندگی بھر تم سے بات نہیں کروں گا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ نبی کریم ﷺ کی سنتوں اور طریقوں کے بارے میں یہی تھا کہ ذرّہ برابر بھی اس میں کسی کی طرف سے کوئی مخالفت ہو، اس کو وہ برداشت نہیں کرتے تھے کسی کو اگر تنبیہ بھی کر دی گئی تو اس کا حال یہ ہوتا تھا کہ جس بات پر ایک مرتبہ تنبیہ فرمائی تو بس پھر زندگی بھر کے لئے ایسا سبق حاصل کر لیا کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن اس میں وہ کبھی غفلت نہیں کرتے تھے۔

﴿صحابی کا اہتمامِ عمل﴾

ایک صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿لا تَسْئَلْ﴾ سوال مت کرنا۔ اس کے بعد ان کا حال یہ تھا کہ گھوڑے پر سوار ہیں اور کوڑا گیا

یا اُٹھانا بھول گئے تو کسی کو یہ نہیں کہتے تھے کہ مجھے یہ اُٹھا کر دیدو، بلکہ گھوڑے پر سے خود اُترتے اور لے کر پھر دوبارہ سوار ہوتے۔ نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے اوپر عمل کا اتنا زیادہ اہتمام تھا۔

بچوں کی اطاعت شعاری

حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے صاحبزادے (ان کے پہلے شوہر کے بیٹے) چھوٹے تھے۔۳-۴ رسال کی عمر ہوگی لیکن ذرا سمجھ دار تھے، جب اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی شادی ہوئی تو چھوٹے ہونے کی وجہ سے یہ بھی ساتھ میں آئے، اور حضور ﷺ کی تربیت میں رہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا تو پوری پلیٹ میں میرا ہاتھ گھومنے لگا۔ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ اِدھر ہاتھ مارا، اُدھر ہاتھ مارا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے بیٹے! جب کھانا کھاؤ؛ تو بسم اللہ پڑھو، اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ حضرت عمر بن ابوسلمہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کے بعد سے آج تک میرا کھانا اسی طرح ہے۔ حالانکہ وہ بچے تھے۔ (بخاری شریف ۵۳۷۶)

بتلانا یہ ہے کہ صحابہ میں بچہ ہو یا بڑا؛ حضور ﷺ کی دی گئی ہدایت کو وہ پلے باندھ لیتے تھے اور اپنی زندگی میں اسی وقت سے ایسا عملی جامہ پہناتے تھے کہ پھر کبھی اس کو چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ ان کا عام مزاج تھا، اور بھی بہت سارے واقعات ہیں، بہر حال! مَیں تو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ سنت کے خلاف کوئی آدمی کبھی کچھ کرے یا بولے؛ اس کو وہ حضرات برداشت ہی نہیں کرتے تھے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی غیرتِ ایمانی

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے شاگردوں میں ہوتا ہے، ایک مرتبہ انہوں نے یہ حدیث بیان کی کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک درزی نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کی، مَیں بھی ساتھ تھا، کھانے میں روٹی کے ساتھ گوشت کا سالن تھا اور اس کے اندر کدو (لوکی) بھی تھا۔ حضور ﷺ کدو کو پلیٹ میں تلاش کر رہے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں اس میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر آپ کے آگے بڑھاتا رہا اور اس کے بعد سے مجھے بھی کدو بہت مرغوب اور پسند ہوگئی۔ یہ روایت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے سنائی۔ کوئی صاحب مجلس میں بیٹھے تھے، اس حدیث کے سننے کے بعد انہوں نے یہ کہا: مجھے تو کدو پسند نہیں ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ نہ جانتے ہوئے ایسے ہی کوئی یوں کہے، اپنی پسند اور ناپسند بتلائے وہ اپنی جگہ پر الگ بات ہے، لیکن نبی کریم ﷺ کی بات سامنے آنے کے بعد ایسا بولنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ گھر میں گئے تلوار لے کر آئے اور کہا: اپنے اس جملے سے توبہ کر؛ ورنہ ابھی تیرا سر گردن سے الگ کر دوں گا

کہنے کا حاصل ہے کہ یہ حضرات نبی کریم ﷺ کی سنت کے خلاف کسی کی طرف سے کوئی بات کہی جاتی تھی تو اس کو برداشت ہی نہیں کرتے تھے۔

آج کا ہمارا المیہ

آج تو ہمارا معاشرہ، سماج اور ہماری سوسائٹی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ سنتوں سے آگے فرائض اور واجبات کے معاملے میں بھی ان کے جی میں جو آتا ہے وہ زبان سے بولتے رہتے ہیں، اور کوئی انہیں ٹوکنے کے لئے تیار نہیں۔ اور اگر کوئی ان کو کچھ کہے تو وہ سننے کے لئے تیار نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔

﴿حجر اسود کا بوسہ﴾

عن عابس بن ربیعة رضی اللہ عنہ قال: رَأَیتُ عُمَرَبنِ الخَطَّابِ رضی اللہ عنہ یُقَبِّلُ الحَجَرَ-یعنی الأَسوَدَ-وَیَقُولُ: اِنِّی أَعلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ،مَاتَنفَعُ وَلاتَضُرُّ،وَلَولااِنِّی رَأَیتُ رَسُولَ اللہِ ﷺ یُقَبِّلُکَ؛مَاقَبَّلتُکَ.

حضرت عابس بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ حجر اسود کو بوسہ دے رہے تھے اور فرمارہے تھے ﴿اِنِّی أَعلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ مَاتَنفَعُ وَلاتَضُرُّ﴾ چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتوحات کی بہت کثرت ہوئی، بڑے بڑے علاقے فتح ہوئے اور بڑی تعداد میں غیر مسلم اسلام کے اندر داخل ہوئے اور وہ ایسے لوگ تھے جو اسلام لانے سے قبل بت پرستی کے عادی تھے۔تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ وہ لوگ آئیں گے اور حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھ کر کہیں ان کو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے کہ حجر اسود کو جو بوسہ دیا جارہا ہے، یہ اُسی جیسا ہے۔ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

پہلے مَیں یہ عرض کردوں کہ استلام کے بارے میں حدیثِ پاک میں آتا ہے حجر اسود یمین اللہ ہے، اللہ تبارک تعالیٰ کا ہاتھ ہے اور جب کوئی آدمی حجر اسود کا استلام کرتا ہے تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کیا (کنز العمال ۳۴۷۴۴) اسی لئے طواف کی ابتداء اسی سے کی جاتی ہے اور اس کی بڑی فضیلت ہے۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب بہت بھیڑ بھاڑ ہو تو اس وقت دور ہی سے اشارہ کردے یا ہاتھ پہنچتا ہو تو ہاتھ لگا کر اس کو بوسہ دیدے، یا دور سے استلام کرلے، دھکا پیل کر کے اور دوسروں کو تکلیف پہنچا کر بوسہ دینے کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔

خیر! عابس بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوسہ دیتے وقت حجر اسود کو

خطاب کرتے ہوئے یہ جملہ فرمایا: اے حجر اسود! مَیں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے، نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ چونکہ جو لوگ بت پرستی کے عادی تھے ان کے ذہنوں میں تو یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ بت پتھروں ہی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ نقصان وفائدہ پہنچاتے ہیں، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اسی نظریہ کی تردید کے لئے یہ جملہ فرمایا؛ تاکہ وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم حجر اسود کو بوسہ شاید اسی لئے دے رہے ہیں کہ یہ ہم کو کوئی فائدہ پہنچا دے گا، اور اگر بوسہ نہ دیں تو کوئی نقصان پہنچا دے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو خطاب کرتے ہوئے کہا: اگر مَیں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا؛ تو مَیں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔

سنت میں حکمت کی تلاش

بس! یہاں تو یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اگرچہ اس کو بوسہ دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا تھا اور آپ نے اس کے بوسہ دینے کا حکم دیا ہے؛ اس لئے مَیں بوسہ دے رہا ہوں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جتنے بھی سنت طریقے ہیں اور شریعت نے بتلائے ہیں ان کے اندر آدمی کو کوئی فائدہ یا حکمت سمجھ میں آوے یا نہ آوے، بلکہ حکمت سمجھ میں آوے تب بھی حکمت کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے ان پر عمل اسی لئے کرنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا طریقہ ہے۔ لاکھوں حکمتیں ہوں وہ اپنی جگہ پر؛ لیکن ہمیں تو عمل اسی لئے کرنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرنے کو بتلایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے دنیا میں آئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی بتلایا ہے وہ ہمیں کرنا ہے، اسی میں ہماری دنیا کی بھی بھلائی ہے اور آخرت کی بھی بھلائی ہے۔ جو

لوگ سنت طریقوں کے اندر اور نبی کریم ﷺ کے بتلائے ہوئے معمولات کے اندر حکمتیں تلاش کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اس میں کیا فائدہ ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا؛ یہ سب نادانی کی باتیں ہیں۔ آج کل بھی دنیا میں ایسا نہیں ہو رہا ہے کہ جو چیز سمجھ میں آوے، وہی ساری چیزیں کی جاتی ہوں۔

لگن اور عشق کی ضرورت ہے

آج کل تو فیشن کا ایسا رواج ہوگیا ہے کہ جس چیز کی فیشن چل پڑے، چاہے وہ کیسی ہی بے تکی چیز کیوں نہ ہو؛ لیکن لوگ اسی کو کرتے ہیں۔ وہاں کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ اس میں کیا حکمت ہے اور کیا فائدہ ہے۔

دیکھو! اُنگلیاں چاٹنا سنت ہے۔ اس کے متعلق لوگ سوال کرتے ہیں کہ انگلیاں چاٹنے میں کیا فائدہ ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور آج کل کھانے کا ایک طریقہ بوفے والا چل پڑا ہے کہ پلیٹ لے کر کھڑے ہیں اور گھومتے پھرتے جانوروں کی طرح کھا رہے ہیں، اگر یہی چیز پہلے زمانہ میں پُرانے لوگوں کو بتلا دی جاتی تو وہ کہتے کہ جانوروں جیسا کھانے کا یہ کیا طریقہ ہے؟ لیکن آج کل اس کا فیشن ہے اور اسی کو ترقی کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ کوئی آدمی معذور اور مجبور ہو تو بات دوسری ہے، لیکن معذوری و مجبوری نہ ہونے کی صورت میں پھر وہی طریقہ ہمارے لئے تو مناسب ہے جو کتابوں میں آیا ہے اور نبی کریم ﷺ نے بتلایا ہے۔ ہر چیز کے اندر ہمیں سنت کا اہتمام کرنا چاہیے:-

لوگ سمجھیں مجھے محرومِ وقار و تمکیں ❁ پر وہ نہ سمجھیں کہ میری بزم کے قابل نہ رہا

یعنی ہم سنت طریقہ کو اختیار کریں تو پھر لوگ چاہے کچھ بھی کہیں؛ اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے

مَیں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ دیکھو! یہ یوروپین ٹورسٹ ہمارے ملک میں آتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کے بال آدھے کٹے ہوئے ہیں اور آدھے ہیں۔ کانوں کے اندر بالیاں پہن رکھی ہیں، اور گلے کے اندر مالا ڈال رکھی ہے۔ آدھا لباس عورتوں جیسا اور آدھا مردوں جیسا ہوتا ہے۔ مَیں نے خود دہلی میں دیکھا کہ دو آدمی ایسے تھے اور سب دکاندار ان کو دیکھ کر ہنس رہے تھے، لیکن ان کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ مجھے تو ان کے اس انداز کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ یہ ہے لگن، اور یہ ہے اپنے طریقے کے ساتھ عشق؛ کہ ساری دنیا ہنستی ہو تو ہنستی رہے، ہمارا کیا بگاڑ لے گی۔ وہ اپنی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہے؛ ہمارا کیا ہے، ہم جس چیز کو پکڑے ہوئے ہیں، اس کو کسی حال میں بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

کاش! ہم سنتوں کے معاملہ میں ایسے ہو جائیں

لیکن ایک مسلمان ہے کہ نبی کریم ﷺ کا بتلایا ہوا وہ طریقہ کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت کی بھلائی بتلا رکھی ہے؛ لوگوں کے معمولی طعن و تشنیع کی وجہ سے اور لوگوں کے معمولی جملے سن کر اختیار کیا ہوا طریقہ چھوڑ دیتا ہے۔ اس واقعہ سے ہمیں یوں عبرت لینی چاہیے کہ ایسی حرکت جو ہمیں کھلی ہوئی غلط معلوم ہوتی ہے، اس کے باوجود انہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ پورا بازار ان کو دیکھ کر ہنس رہا تھا؛ بلکہ ایسا لگتا تھا کہ ان کا مذاق اُڑا رہا تھا؛ لیکن ان کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے طریقے کے ساتھ اسی نوع کی مضبوطی ہونی چاہیے۔ کاش! ہم سنتوں کے معاملے میں ایسے ہی ہو جائیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا سنت پر عمل

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کھانا کھا رہے تھے، لقمہ گر گیا تو اس کو اُٹھا کر صاف

کر کے کھالیا۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ ایسا کر رہے ہیں؟ یہاں تو اسے بدتمیزی سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے جواب دیا﴿أَأَتْرُکُ سُنَّةَ حَبِیْبِیْ لِهٰؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ؟﴾ ان بے وقوفوں کے واسطے کیا مَیں نبی کریم ﷺ کا طریقہ اور سنت چھوڑ دوں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو طریقہ بتلایا ہے، ہمیں اسی کے مطابق چلنا ہے، جب ہم اس کے مطابق چلیں گے تو جیسے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں، اس طریقہ پر چلنے کے بعد ہم بھی اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جائیں گے ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ﴾ تم اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے گا۔ ہم اگر اللہ تعالیٰ کی محبت چاہتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہی ہے۔

﴿اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں سنتوں کا اہتمام کرنے کی توفیق نصیب فرمائے﴾

وُجُوبُ الْاِنْقِيَادِلِحُكْمِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَمَايَقُوْلُهٗ مَنْ دُعِیَ اِلٰی ذٰلِکَ وَاُمِرَبِمَعْرُوْفٍ اَوْنُهِیَ عَنْ مُنْکرٍ

﴿حکم الٰہی کی تابعداری﴾

﴿اقتباس﴾

جن لوگوں کے سامنے اللہ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کے احکام بیان کیے جائیں، نبی کریم ﷺ کے طریقے پیش کیے جائیں اور ان کے متعلق ان کے دل میں کوئی اعتراض پیدا ہو، یا زبان سے کوئی جملہ ایسا کہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ اس کو ماننے کیلئے اور اس پر عمل کرنے کے لئے وہ پورے طور پر آمادہ نہیں ہے؛ اس آدمی کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے، اور اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کے ایمان میں کمی ہے۔ شانِ عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جائے، اس کو بے چون وچرا تسلیم کرلے۔

اور جہاں شریعت کے کسی حکم کے سلسلے میں بظاہر ہمارا دل ودماغ کوئی اشکال کھڑا کرکے یوں کہے کہ یہ حکم تو بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے، فلاں کام تو ناقابلِ عمل ہے، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کیسے عمل ہوسکتا ہے؟ تو ہمیں یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ ایسا تو بولو ہی مت۔ مؤمن کی زبان سے ایسا تو نکلنا ہی نہیں چاہیے۔ مؤمن کی زبان سے تو ہر حال میں ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ ہی نکلنا چاہیے۔

رجب المرجب ۱۴۱۸ھ ﷽ نومبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰه اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:

فأعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

فَلاَ وَرَبِّكَ لا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْ مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ.

وقال تعالىٰ: أَنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَادُعُوْااِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَاوَأَطَعْنَا وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے ﴿وُجُوْبُ الْاِنْقِيَادِلِحُكْمِ اللّٰهِ تَعَالىٰ وَمَايَقُوْلُهٗ مَنْ دُعِىَ اِلىٰ ذٰلِكَ وَأُمِرَبِمَعْرُوْفٍ أَوْنُهِىَ عَنْ مُنْكَرٍ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جارہا ہے اس کے لئے آدمی کا اپنے سرِ تسلیم خم کردینا اور اس کا ضروری ہونا۔ اور جس کو اللہ کے حکم کے لئے دعوت دی جائے تو اس کی طرف سے کیا جواب ہونا چاہیے۔ اور جس کو کسی بھلی بات کا حکم دیا جائے یا بری بات سے روکا جائے تو وہ جواب میں کیا کہے۔

﴿حضور ﷺ کے فیصلے پر دل میں تنگی محسوس نہ کرے﴾

سب سے پہلے یہاں پر بھی وہی آیت لائے جو اس سے پہلے باب میں لائے تھے ﴿فَلاَ وَرَبِّكَ لا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْ مَاشَجَرَبَيْنَهُمْ﴾ قسم ہے تمہارے پروردگار کی! یہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ وہ آپ کو فیصل اور حَکَم قرار دیں ان باتوں

میں؛ جن میں آپس میں اختلاف، نزاع اور جھگڑے کی شکل پیدا ہو۔ یعنی وہ نبی کریم ﷺ کو اپنا معاملہ حوالہ کریں تا کہ آپ اس کے اندر فیصلہ فرماویں ﴿ثُمَّ لَايَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ﴾ اس کے بعد جب آپ فیصلہ کردیں تو آپ کے فیصلے کے متعلق وہ اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں ﴿وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ اور آپ کے اس فیصلے کو پورا پورا تسلیم کرلیں

اگلے باب میں یہ آیت گزر چکی ہے اور اس پر تفصیلی وضاحت کر چکا ہوں، اس کے شانِ نزول کے سلسلے میں بھی جو باتیں ہیں وہ عرض کر چکا ہوں۔ یہاں تو اس لئے لائے ہیں کہ باب کا جو عنوان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس حکم کو ماننا ضروری ہے۔ اور اگر کسی آدمی کو بھلی بات کے لئے کہا جائے یا بری بات سے روکا جائے یا اللہ کے حکم کی اطاعت کے لئے اس کو دعوت دی جائے تو اس کو جواب میں کیا کہنا چاہیے؟ تو اس آیت میں ﴿وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے آپس کے معاملات کے فیصلے کے واسطے جو بھی حکم صادر ہو اور تمہارے اس نزاع اور جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے جو فیصلہ نبی کریم ﷺ فرمائیں، اس پر آدمی کو سرِ تسلیم خم کردینا چاہیے اور دل سے اس کو مان لینا چاہیے، اگر آدمی دل میں بھی ذرہ برابر تنگی محسوس کرے گا؛ تو وہ مؤمن نہیں ہوگا۔ یہودی اور منافق کا قصہ پہلے گذر چکا ہے کہ انھوں نے اپنا فیصلہ حضور ﷺ کے حوالے کیا تھا۔

﴿جسے شریعت کی طرف دعوت دی جائے؛ تو وہ کیا کہے؟﴾

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ﴾ ایمان والوں کو جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی جائے تا کہ

اللہ کا رسول ان کے درمیان فیصلہ صادر کرے تو اس وقت ان کا جواب یہ ہونا چاہیے: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی بات کو سنا اور دل سے اس کو قبول کرلیا۔

باب قائم کیا تھا: ﴿وَمَا يَقُوْلُهُ مَنْ دُعِيَ اِلٰى ذَالِكَ﴾ اللہ کی اطاعت کے لئے جس آدمی کو دعوت دی جائے اس کی طرف سے جواب کیا ہونا چاہیے؟ تو بتلاتے ہیں کہ اس کی طرف سے جواب یہ ہونا چاہیے کہ وہ آدمی دل سے اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے پاک رسول کے فیصلے کو تسلیم کرلے، اپنے دل میں ذرہ برابر تنگی محسوس نہ کرے، اور زبان سے یوں کہے: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ اللہ کے حکم کو اور اس کے رسول کے حکم کو ہم نے سنا اور ہم اس کے اوپر دل سے راضی ہیں، ہم نے دل سے مان لیا۔ گویا دل کی اندرونی کیفیت بھی یہ ہو کہ دل میں ذرہ برابر تنگی کا احساس نہ ہو، اپنے دل سے اس کو تسلیم کرے اور ساتھ ہی ساتھ زبان سے بھی اس کا اظہار کرنا چاہیے ﴿وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

﴿اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے﴾

اب جن لوگوں کے سامنے اللہ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کے احکام بیان کئے جائیں، نبی کریم ﷺ کے طریقے پیش کئے جائیں اور ان کے متعلق ان کے دل میں کوئی اعتراض پیدا ہو، یا زبان سے کوئی جملہ ایسا کہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ اس کو ماننے کے لئے اور اس پر عمل کرنے کے لئے وہ پورے طور پر آمادہ نہیں ہے؛ اس آدمی کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے، اور اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کے ایمان میں کمی ہے۔

﴿پہلی قوموں کی ہلاکت کے دو سبب﴾

وفیہ من الاحادیث حدیث أبی هريرة المذكورة فی أول الباب قبله وغيره من الاحاديث فيه.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب کے اندر بھی بہت ساری روایتیں ہیں ان میں سب سے پہلی روایت وہ ہے جو اگلے باب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے گذر چکی ہے، اس کا حوالہ دیتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ﴿دَعُوْنِیْ مَاتَرَکْتُکُمْ اِنَّمَا أَھْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَثْرَۃُ سُؤَالِھِمْ﴾ میں جب تک تم کو چھوڑے رکھوں تم بھی مجھے چھوڑے رکھو، یعنی جب تک میں اپنی طرف سے کسی چیز کے متعلق وضاحت نہ کروں اور کوئی تفصیل اپنی طرف سے بیان نہ کروں؛ وہاں تک تم بھی سوالات کرکے مجھ سے اس کی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اس لئے کہ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے کثرتِ سوال نے ہی ہلاک کیا۔ ان کے انبیاء کی طرف سے احکامات دئے جاتے تھے ان کے سلسلے میں وہ مختلف شقیں نکال کر بار بار سوالات کرتے تھے، جس کے نتیجے میں ان پر اور زیادہ سختیاں ہوتی تھیں

﴿وَاخْتِلَافُھُمْ عَلٰی أَنْبِیَآئِھِمْ﴾ اور ان کے انبیاء کی طرف سے جو باتیں ان کو پیش کی گئیں، ان سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ان کو ہلاکت میں پڑنا پڑا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا

﴿فَاِذَا نَھَیْتُکُمْ عَنْ شَیْءٍ فَاجْتَنِبُوْہُ﴾ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اگر کسی چیز سے تم کو روک دوں، تو تم اس سے باز آجاؤ ﴿وَاِذَا أَمَرْتُکُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْہُ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ اور اگر کسی بات کا حکم دوں تو جتنا تم سے ہو سکے اس پر عمل کرو۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس پر آدمی کو عمل کرنا چاہیے۔ جس چیز سے رکنے کے لئے کہا جائے؛ اس سے باز رہنا چاہیے۔

غیر ضروری سوالات منع ہیں

پہلے بتلا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے

تم پر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے۔ اس پر ایک صحابی نے کھڑے ہو کر سوال کیا ﴿أَفِیْ کُلِّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟﴾ اللہ کے رسول! کیا ہر سال؟ آپ ﷺ نے اس کا جواب نہیں دیا۔ پھر آپ نے جب دوبارہ یہ فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر بیت اللہ کا حج فرض کیا، تو پھر ان صحابی نے یہی سوال کیا۔ آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا، اس پر ان صحابی نے تیسری مرتبہ سوال کیا، تو اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر مَیں کہہ دیتا کہ ہاں؛ تو تم پر ہر سال حج کا کرنا ضروری ہو جاتا اور تم اس کو نباہ نہ سکتے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿دَعُوْنِیْ مَاتَرَکْتُکُمْ﴾ جب تک مَیں تم کو چھوڑے رکھوں اور میری طرف سے کسی حکم کے سلسلے میں مزید تفصیلات بیان نہ کی جائیں؛ تم اس سلسلے میں مجھ سے مزید سوالات مت پوچھو، بلکہ اجمالی اور مختصر طور پر جو حکم دیا گیا اس پر اجمالی طور پر عمل کرلو، اسی میں تمہارے لئے فائدہ ہے۔ (نسائی شریف، مناسک الحج، ۲۶۱۹)

﴿شانِ عبدیت کا تقاضہ﴾

جس کو اللہ کی اطاعت کی دعوت دی جائے، کسی بھلی بات کا حکم کیا جائے، بری بات سے روکا جائے تو وہ جواب میں کیا کہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی طرف سے سوالات کھڑے نہ کرے، بلکہ جہاں کسی بات کا حکم کیا جائے فوراً اس پر عمل کے لئے تیار ہو جائے، دل سے تسلیم کرلے، زبان سے ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ کہہ کر اس تسلیم کا اظہار کرے اور عملی جامہ پہنانے کے اندر لگ جائے۔

﴿احکامِ شرع کی علت پوچھنا﴾

آج کل ہمارے معاشرہ میں لوگوں کا ایک مزاج بنا ہوا ہے کہ دین کی کوئی بات کہی

جاتی ہے تو اس کی علت کے متعلق سوالات کرتے ہیں۔ ارے بھائی! غلام کے لئے بس اتنی بات ہی کافی ہے کہ آقا نے حکم دیدیا۔ اگر آپ کا غلام ہو اور آپ اس کو کوئی حکم دیں اور اس کی طرف سے سوال کیا جائے کہ آپ ایسا حکم کیوں دے رہے ہیں اور اس میں کیا حکمت ہے؟ تو نوکر کی طرف سے کئے جانے والے اس سوال کو کیا آپ برداشت کر سکتے ہیں؟ حالانکہ وہ تو ملازم اور نوکر ہے، تھوڑے سے وقت کے لئے کچھ رقم کے عوض اس نے اپنے آپ کو آپ کی خدمت کے لئے پیش کر رکھا ہے، اس سے زیادہ آپ کو اس کے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے، اس کے باوجود اس کی طرف سے ایسا کوئی سوال کیا جائے تو ہم اس کو برداشت نہیں کرتے۔ تو ایک بندہ اپنے رب کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس کی علتوں کے متعلق دریافت کرے اور حکمتیں پوچھے کہ اس میں کیا حکمت ہے؛ یہ کیسے برداشت کیا جائے گا؟ ایسا سوال بندگی کے خلاف ہے۔ شانِ عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جائے، اس کو بے چون و چرا تسلیم کرلے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر برتری کا راز

مشہور تو یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کو فرشتوں کے سامنے ظاہر کیا گیا اور ان کی برتری کو ظاہر کرنے کے لئے فرشتوں سے کچھ سوالات کئے گئے کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ وہ نہیں بتاسکے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو کہا تو انھوں نے بتلایا اور اس طرح ان کی برتری ظاہر ہوئی۔ لیکن حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی برتری کا اصل ظہور ان کی شانِ عبدیت سے ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ اس وقت تین مخلوقات تھیں۔ ایک حضرت آدم، دوسرے فرشتے اور تیسرے شیطان۔ فرشتوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ نے اس کا اظہار کیا: ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ میں روئے زمین پر اپنا ایک نائب اور

خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔ تو باری تعالیٰ کے اس ارادے کے سامنے فرشتوں نے یہ عرض کیا:
﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾
باری تعالیٰ! آپ زمین کے اندر ایسی مخلوق کو اپنا خلیفہ بنائیں گے جو فساد پھیلائے گی اور خون بہائے گی، حالانکہ ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں آپ کی تقدیس بیان کرتے ہیں۔ گویا یہ منصب تو ہمیں ملنا چاہیے۔ باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو تو یوں کہہ کر خاموش کر دیا گیا:
﴿إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ وہ خاموش ہو گئے۔ لیکن ابتداء سے ہی خاموشی نہیں رہی، شروع میں تو انھوں نے باری تعالیٰ کے سامنے اپنی بات کا اظہار کر ہی دیا۔

اور شیطان کو جب سجدہ کرنے کو کہا گیا تو فرشتوں نے حکم مان کر فوراً سجدہ کر دیا لیکن شیطان نے کہا: ﴿خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور ان کو مٹی سے پیدا کیا گویا آگ کو مٹی کے مقابلہ میں بڑائی و سربلندی حاصل ہے، میں بھلا ان کو کیسے سجدہ کروں؟ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانا تو وہ مردود ہوا۔

اور حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ یہ ہوا کہ جب ان کو جنت کے اندر رکھا گیا اور تاکید کی گئی کہ جنت کے اندر رہ کر کھاؤ اور پیو: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ اس درخت کے قریب مت جائیو؛ ورنہ اپنے اوپر زیادتی کرنے والے بن جاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ کو چونکہ دنیا کے اندر بھیجنا منظور تھا، لہٰذا وہ چیز پیش آ کر رہی۔ شیطان نے ورغلایا اور اس درخت کے قریب پہنچ گئے اور اس کو کھا لیا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی کہ ہم نے منع کیا تھا اور تم نے اس کام کا ارتکاب کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کے جواب میں

کچھ نہیں کہا۔ بلکہ روایتوں میں آتا ہے کہ اس درخت کے پھل کو کھا لینے کے بعد حضرت آدم سے اپنی توبہ کے لئے الفاظ کہنے کی بھی جرأت نہیں ہوئی، صرف روتے ہی رہے، چالیس سال تک آنسو بہا کر روتے رہے۔ باری تعالیٰ کی طرف سے توبہ کے کلمات القاء کئے گئے ﴿فَتَلَقّٰی آدَمُ مِن رَّبِّهٖ کَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ﴾ اللہ تبارک وتعالی نے توبہ کے کلمات ان کو سکھائے کہ یوں کہو: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ اے اللہ! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اگر تو نے معاف نہیں کیا اور ہم پر رحم نہیں کیا؛ تو ہم بہت نقصان میں رہیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کے یہ کلمات سکھائے گئے: تب حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کے کلمات بھی اپنی زبان سے ادا کئے، ورنہ کچھ نہیں بولے، کوئی جواب نہیں دیا۔ (فضائل ذکر۔ص۹۶)

﴿حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ﴾

حدیثِ پاک میں ایک قصہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جمع کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے سوال کیا کہ آپ ہی تو وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور فرشتوں کو آپ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا اور جنت کے اندر آپ کو بسایا، اور آپ کو ایک چیز سے منع کیا تھا لیکن آپ نے وہ درخت کھالیا اور جنت سے نکالے گئے اور ہم کو مصیبت میں ڈالا۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے جواب میں کہا: آپ ہی تو وہ موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغامات بندوں تک پہنچانے کے لئے منتخب فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی خصوصی تربیت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے شرفِ ہم کلامی سے آپ کو نوازا۔ اچھا! آپ کو اللہ تعالیٰ نے

توریت دی، اس کے اندر یہ لکھا ہوا نہیں ہے ﴿وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ آدم اپنے رب کے حکم سے ہٹے۔ وہ توریت تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ تو میری پیدائش سے بہت سالوں پہلے لوحِ محفوظ کے اندر لکھی جا چکی تھی۔ جب اس میں یہ بات لکھی جا چکی تھی تو بھلا میں کیسے نہ کرتا؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔

(مسلم شریف، کتاب القدر۔ ۲۶۵۲/۱۵)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دیکھو! حدیث میں یہ جو واقعہ بیان کیا گیا اس میں نبی کریم ﷺ نے یہ چیز اس لئے بیان فرمائی تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضرت آدم سے جو کوتاہی ہوئی اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ جواب تو تھا اور ایسا کرارا جواب تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی خاموش ہو گئے، اور لاجواب ہو گئے، لیکن یہاں معاملہ بندے کا تھا۔ یعنی سوال کرنے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ تو اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام نے بھی برابر کا جواب دیا۔ اور وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال کیا گیا کہ یہ کیا کیا؟ تو خاموش رہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی شانِ عبدیت کا ایسا اظہار کیا کہ توبہ کے کلمات بھی ادا کرنے کی اس وقت تک جرأت نہ ہوئی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ بتائے اور سکھائے نہ گئے۔ جب وہ سکھائے گئے؛ تب بولے۔

﴿ہمارا ایک بڑا روگ﴾

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ یہ جو آج کل عام مزاج بنتا جا رہا ہے کہ شریعت کے احکام جب بیان کئے جاتے ہیں تو لوگ اس کے اندر علت اور حکمت تلاش کرتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ اس کی حکمت کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات مناسب نہیں

ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مطالبہ کیا گیا ہے ﴿فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْ مَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ أَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ﴾ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو حکم دیا گیا ہے اس کے سلسلے میں دل میں ذرہ برابر بھی تنگی کا احساس نہ ہو، اور دل سے آدمی اس کو تسلیم کرلے اور زبان سے اس کا اظہار بھی ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ کہہ کر ہونا چاہیے کہ ہم نے اللہ کے حکم کو سنا اور دل سے مان لیا، جب تک یہ بات نہ ہوگی؛ وہاں تک کمالِ ایمان نصیب نہیں ہوگا۔

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بے چینی اور اشکال﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ: ﴿لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ أَنْفُسِکُمْ أَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ﴾ اِشْتَدَّ ذَالِکَ عَلٰی أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ، فَأَتَوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ ثُمَّ بَرَکُوْا عَلَی الرُّکَبِ، فَقَالُوْا أَیْ رَسُوْلَ اللّٰہِ! کُلِّفْنَا مِنَ الْأَعْمَالِ مَا نُطِیْقُ، اَلصَّلَاۃَ وَالْجِہَادَ وَالصِّیَامَ وَالصَّدَقَۃَ، وَقَدْ أُنْزِلَتْ عَلَیْکَ ھٰذِہِ الْآیَۃُ وَلَا نُطِیْقُھَا. قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: أَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَقُوْلُوْا کَمَا قَالَ أَھْلُ الْکِتَابَیْنِ مِنْ قَبْلِکُمْ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا؟ بَلْ قُوْلُوْا ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا، غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَإِلَیْکَ الْمَصِیْرُ﴾ فَلَمَّا اقْتَرَأَھَا الْقَوْمُ، وَذَلَّتْ بِھَا أَلْسِنَتُھُمْ، أَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ أَثَرِھَا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلَآئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ، وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا، غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَإِلَیْکَ الْمَصِیْرُ﴾ فَلَمَّا فَعَلُوْا ذَالِکَ نَسَخَھَا اللّٰہُ تَعَالٰی؛ فَأَنْزَلَ اللّٰہُ عز وجل ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَھَا، لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِیْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ قَالَ: نَعَمْ ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا إِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾

قَالَ: نَعَمْ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ قَالَ: نَعَمْ ﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ﴾ قَالَ: نَعَمْ. (رواہ مسلم)

جب نبی کریم ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی کہ آسمان اور زمین اور جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین کے اندر ہے وہ سب اللہ ہی کی ملکیت ہے، اللہ ہی سب کا مالک ہے۔ اور مالک ہونے کی وجہ سے وہ جو چاہے حکم صادر کرے۔ اور تمہارے دلوں کے اندر جو چیز ہے اس کا اگر تم اظہار کرو، یا اس کو اپنے دل میں چھپائے رکھو اور زبان سے اس کو ظاہر نہ کرو؛ اللہ تعالیٰ اس کا تم سے حساب لے گا۔

﴿حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم بارگاہِ نبوی میں﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوپر بڑی گراں گذری۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں جو خیالات اور وساوس غیر اختیاری طور پر آتے ہیں، یعنی ان خیالات اور وساوس کے لانے کا آدمی خود قصد اور ارادہ نہیں کرتا؛ ان پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوگی۔ اب ظاہر ہے کہ جو چیز اپنے اختیار میں نہ ہو، اور اس پر بھی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے محاسبہ ہو، تو یہ چیز ایسی ہی ہے جو آدمی کو پریشان کر سکتی ہے۔ صحابہ کرام نے جب اس آیت کو سنا تو بے چین ہو گئے کہ اس پر ہم کیسے عمل کر سکیں گے، یہ تو ہمارے اختیار اور قابو سے باہر کی چیز ہے، اور ان حضرات کو یہ حکم بڑا بھاری معلوم ہوا۔ چنانچہ وہ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گھٹنوں کے بَل، دوزانوں بیٹھے، اور بولے: اے اللہ کے رسول! ہم کو اس سے پہلے ایسے اعمال کا پابند بنایا گیا تھا جو ہمارے بس میں اور طاقت

میں تھے،اس لئے ہم نے ان کی بجا آوری میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی، بلکہ برضاو رغبت ان پرعمل کرتے رہے،لیکن آج یہ آیت جوآپ پرنازل ہوئی اس کو سننے کے بعدتو ہم بے چین ہوگئے،اوراس کاہمارے پاس کوئی حل نہیں ہے۔

﴿ظاہری اور باطنی اعمال کی قسمیں﴾

حالانکہ اس آیت کے اندرغورکروکہ اگر دل کے خیالات،ارادے اور وساوس ہی مراد ہیں؛تووہ بھی دوقسم کے ہیں۔جیسے آدمی کے اعضاء سے سرزد ہونے والےظاہری اعمال بھی دوطرح کے ہوتے ہیں کہ ان میں بعض اعمال وہ ہیں جن کے سرزد ہونے میں آدمی کے ارادے اوراختیارکودخل نہیں۔مثلاً آپ جارہے تھے،غیراختیاری طورپرآپ کے کان میں گانے کی آوازپڑگئی،آپ نے سنانہیں،آپ تواپناراستہ طےکررہے تھےاورکان میں آواز آگئی۔یااچانک آنکھ اٹھی توایک دم غیرمحرم پرپڑگئی اورفوراًآپ نے ہٹالی،لیکن ایک مرتبہ غیراختیاری طورپرپڑگئی۔اوراسی طرح کے دوسرے کام کہ جس میں آدمی کے ارادے اور اختیارکودخل نہ ہو؛تواس پراللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی پکڑاورمواخذہ نہیں ہے۔اوریہی کام اگر کوئی آدمی ارادےاوراختیارسے کرتا،بالقصدانجام دیتا؛تواللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی پکڑہوتی اورمواخذہ ہوتا۔

اسی طرح خیالات اور وساوس جوآدمی کے دل میں آتے ہیں وہ بھی دوطرح کے ہوتے ہیں،ایک تووہ کہ ان کے لانے میں آدمی کے ارادےاورقصدکودخل نہیں،غیراختیاری طورپر،بغیرارادےاورقصدکےازخودآرہے ہیں؛ان کےاوپرتواللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ نہیں ہوگی۔

لیکن خیالات وساوس کی دوسری قسم وہ ہے جن کو آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے دل میں لاتا ہے یعنی خود سوچتا ہے تو جیسے اعضاء کے اندر جو اعمال تھے اور اس میں جو اختیاری اعمال تھے اسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پوچھ تاچھ اور گرفت ہوتی ہے؛ ایسے ہی یہاں پر بھی خیالات اور نظریات میں آدمی کے ارادے اور اختیار کو دخل ہو، اور بالقصد وبالارادہ اس کو اپنے دل میں لاوے اور اس پر غور کرے؛ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پوچھ تاچھ ہوگی اور مواخذہ ہوگا۔

﴿حضور ﷺ کی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تنبیہ اور تعلیم﴾

لیکن بہر حال آیتِ کریمہ کے الفاظ عام تھے اور ظاہری الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں قسم کے خیالات اور وساوس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں پکڑ اور گرفت ہوگی اور نبی کریم ﷺ تو اگر چہ اس کا مطلب سمجھتے تھے لیکن جب تک وحی کی طرف سے اس کی تائید نہ ہو جاوے؛ آپ بھی اس سلسلے میں کچھ فرمانا نہیں چاہتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب اپنا یہ اشکال اور دشواری نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کی کہ اے اللہ کے رسول! اب تک جو اعمال کرنے کے لئے ہم کو کہا گیا، نماز، روزہ، جہاد، صدقہ؛ وہ تو ہمارے اختیار اور طاقت میں تھے، ہم کرتے رہے، اب ایک ایسی چیز کا حکم دیا گیا ہے جو ہماری طاقت سے باہر ہے، اب ہم کیا کریں؟ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم سے پہلے جو اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ گزرے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے جانے والے احکامات کے جواب میں یوں کہا: ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ ہم نے سنا اور ہم نے انکار کیا، کیا تم بھی اس طرح جواب دینا چاہتے ہو؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے، تم ایسا جواب مت دو، بلکہ تم تو جواب میں یوں کہو

﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ اے اللہ! ہم نے آپ کے احکام کو سنا اور دل سے مان لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے سوال کرو ﴿غُفْرَانَکَ رَبَّنَا﴾ اے اللہ! ہم تجھ سے مغفرت کا سوال کرتے ہیں اور ہم ایسی چیز جو ہمارے اختیار میں نہیں، اس کے متعلق تجھ سے یہ طلب کرتے ہیں کہ تو اس پر ہمارا مواخذہ نہ فرمانا اور ہماری پکڑ مت کرنا، اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹ کر آنا ہے۔

﴿مؤمن کا طرز یہی ہونا چاہیے﴾

گویا یہاں اس حدیث کو لانے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھئے! اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آیت نازل ہوئی اور اس آیت کے ظاہری الفاظ سے جو مفہوم اور مطلب سمجھ میں آ رہا تھا اور اس سے جس چیز کا صحابہ کو پابند بنایا جا رہا تھا، بظاہر وہ ایک ایسی چیز تھی جو ان کے اختیار میں نہیں تھی، ان کی طاقت سے باہر کی چیز تھی، اس کے باوجود جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی اس دشواری اور بے چینی کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ ان کی اس بات میں تصدیق یا تائید کرتے؛ یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب ایک بات آئی ہے تو تم ایسے مت بنو جیسے اگلی امت والے بنے تھے، بلکہ تم تو اللہ تعالیٰ کے احکام کے جواب میں یوں کہو: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ البتہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا سوال کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی بات ہوگی تو وہ خود ہی تمہارے اس مغفرت کے سوال کے جواب میں آسانی فرما دیں گے، لیکن تمہاری طرف سے تو یہی جواب ہونا چاہیے۔

بس! باب کا جو عنوان قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جب دعوت دی جائے تو مؤمن کا جواب یہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ جو احکام دیتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جو آدمی کے اختیار اور بس میں ہوں اور اس کی طاقت میں ہو۔ طاقت سے باہر کی چیز کا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا ہی نہیں جاتا۔لیکن اگر کسی کو شریعت کا کوئی حکم بظاہر ایسا معلوم ہو کہ یہ تو ہماری طاقت سے باہر کا ہے؛ تب بھی دل سے اس کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ زبان سے اس کا اظہار کرنا چاہیے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو سنا اور دل سے مانا۔البتہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس سلسلے میں آسانی کا بھی سوال کرے۔

گویا ایسے مواقع پر جہاں شریعت کے کسی حکم کے سلسلے میں بظاہر ہمارا دل ودماغ کوئی اشکال کھڑا کر کے یوں کہے کہ یہ حکم تو بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے،فلاں کام تو نا قابلِ عمل ہے۔جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کیسے عمل ہوسکتا ہے؟ یہاں یہی تعلیم دی جارہی ہے کہ ایسا تو بولو ہی مت۔مؤمن کی زبان سے ایسا تو نکلنا ہی نہیں چاہیے۔مؤمن کی زبان سے تو ہر حال میں ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ ہی نکلنا چاہیے۔

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی تعریف: قرآن کی زبانی﴾

چنانچہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ جواب بتلایا گیا،فوراً صحابہ نے یہی کہا: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا، غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ، وَذَلَّتْ بِهَا أَلْسِنَتُهُمْ﴾ ان کی زبانیں اس کے سامنے منقاد اور تابع ہوگئیں یعنی انہوں نے اپنی زبانوں سے اس کا اقرار کرلیا۔پھر اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ اِلَیْهِ مِن رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ الی آخرہ﴾ اللہ کی طرف سے رسول کی طرف جو کچھ اتارا گیا اس کو رسول نے بھی اور ایمان والوں نے بھی مان لیا اور وہ سب یعنی رسول بھی اور اہلِ ایمان بھی تمام کے تمام ایمان لے آئے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔یہ کہتے ہوئے رسولوں پر ایمان لے آئے کہ ہم ایمان لانے کے معاملہ میں اللہ کے رسولوں

کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ایسانہیں کہ ایک رسول کو مانیں اور دوسرے رسول کا انکار کریں (جیسے یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو مانا لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کا انکار کیا۔اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ اور سب کو مانا لیکن نبی کریم ﷺ کا انکار کیا۔ایسانہیں ہونا چاہیے) بلکہ اس امت کے اہلِ ایمان کا حال یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ پر بھی اور آپ سے پہلے کے تمام انبیاءسب پر ایمان لاتے ہیں،ایمان لانے کے معاملہ میں کسی نبی اور رسول میں فرق نہیں کرتے۔ایمان سب پرلاتے ہیں۔اوراللہ کے حکم کے جواب میں یوں کہنے لگے:اے اللہ! ہم نے تیرے حکم کوسن لیااور دل سے اس پر راضی ہو گئے اے اللہ! ہم تجھ سے تیری مغفرت کا سوال کرتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کرآنا ہے۔ صحابہ کے اس جواب کوقرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔

﴿فرمانبرداری پرآسانی کا حکم﴾

انھوں نے جب یہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ اگلا حکم جس سے بظاہر کچھ ذرا سختی معلوم ہورہی تھی اس کو ختم کردیا اور یہ آیت نازل فرمائی﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ آدمی کو اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کا پابند نہیں بناتا جو اس کی طاقت میں نہ ہو، بلکہ اتنی ہی چیز کا پابند بناتا ہے اور حکم دیتا ہے جو اس کی طاقت کے اندر ہو﴿لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ﴾آدمی جو اپنے ارادے اور اختیار سے کرے گا؛اسی پر اس کوثواب ملے گا،اوراپنے ارادے اوراختیار سے جوگناہ کرے گا اسی پر اس کو عذاب ہوگا۔اور جو غیراختیاری چیزیں ہیں کہ جس میں اس کے ارادے کودخل نہیں ہے اس پر اس کی پکڑ بھی نہیں ہوگی۔صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو وہ جو بے چینی تھی اوراشکال پیدا ہوا تھا اور جب انھوں نے اس کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس آیت میں آسانی کردی گئی۔

﴿ایک علمی اشکال کا حل﴾

ویسے علماء لکھتے ہیں کہ اس آیت میں یہی مطلب تھا لیکن بظاہر اس کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ غیر اختیاری چیز پر بھی اللہ کی طرف سے پکڑ ہے، گویا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ابتلاء اور آزمائش کے لئے اور ان کے ایمان کے امتحان کے لئے اِس کے اُس مطلب کو مبہم رکھا گیا اور آگے والی آیت نے آ کر اُس کو واضح کر دیا۔ اسی لئے وہ اشکال بھی نہیں ہوگا کہ نسخ کا تعلق تو احکام سے ہوا کرتا ہے اور یہ تو خبر سے تعلق رکھنے والی چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایک خبر دی تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خبر دی جاتی ہے وہ چیز تو باقی رہتی ہے اس میں تو بعد میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہاں جو بات کہی گئی تھی وہ اجمالی طور پر کہی گئی تھی، آگے اس کی مزید وضاحت کر دی گئی جس سے صحابۂ کرام کی وہ بے چینی دور ہوگئی، لہٰذا یہ بات بھی نہیں رہے گی کہ نسخ کا تعلق احکام سے ہوتا ہے، اخبار سے نہیں ہوتا۔

﴿آسانی کی دعا﴾

اے ہمارے پروردگار! تو ہماری پکڑ نہ کرنا اگر ہم سے بھول ہو جائے یا ہم نے چوک کی ہو یعنی بھول چوک سے ہم سے کوئی کام ہو گیا ہو تو اس پر ہماری پکڑ مت کرنا۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: جی ہاں۔ ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ یعنی ایسے سخت احکام نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں کے اوپر ڈالے تھے یعنی جن سخت احکام کا ہم سے پہلی امتوں کو پابند کیا گیا تھا ایسے سخت احکام ہم کو نہ دینا۔

اگلی امتوں میں کچھ ایسے احکام تھے جو ذرا سخت تھے، مثلاً کپڑے کو اگر نجاست لگ

جائے تو دھونے سے پاک نہیں ہوتا بلکہ اتنا کپڑا کاٹ دینا ضروری سمجھا جاتا تھا، کاٹ کر اس کو الگ کر کے پھینک دو۔ یہ نہیں کہ پانی سے دھولیا تو پاک ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے آسانی کر دی کہ کپڑے کو اگر ناپاکی لگ جائے تو اس ناپاکی کو پانی سے دھو کر دور کر دیا جائے تو کپڑا پاک ہوگیا۔ اگلی امت کے لوگوں کے لئے یہ حکم سخت تھا، ہمارے لئے آسانی ہے۔

ان لوگوں کے لئے ایک حکم یہ تھا کہ اگر گناہ کا صدور ہو جائے تو توبہ کا طریقہ یہی تھا کہ توبہ کے طور پر وہ اپنے آپ کو ختم کر دیں، قتل کرلیں۔ اب ہمارے لئے آسانی کر دی کہ آدمی زبان سے توبہ کرلے اور دل میں پختہ ارادہ کرلے کہ آئندہ اس کام کا ارتکاب نہیں کروں گا، اور جو کچھ ہوا اس پر ندامت کا اظہار کر دے؛ تو آدمی کی توبہ مکمل ہو جاتی ہے۔ گویا وہ احکام جو ان کے لئے سخت تھے؛ ہم پر نہ ڈال۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ اے ہمارے رب! تو ہم پر ایسے احکام کا بوجھ نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ تو باری تعالیٰ نے فرمایا: جی ہاں۔ ﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ اور ہم سے ہماری کوتاہیوں کو درگذر کیجئے ﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ اور ہمارے گناہوں کو معاف کیجئے ﴿وَارْحَمْنَا﴾ اور ہمارے ساتھ رحمت کا معاملہ کیجئے ﴿أَنْتَ مَوْلَانَا﴾ اے اللہ! آپ تو ہمارے آقا ہیں ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ﴾ اس لئے کافر لوگوں کے مقابلہ میں آپ ہماری مدد کیجئے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: جی ہاں۔

﴿اس روایت کا سبق﴾

اس حدیث کو لا کر یہ تعلیم دی گئی کہ شریعت کے کسی بھی حکم کے متعلق جب کسی مؤمن کو دعوت دی جائے تو اس کا جواب یہی ہونا چاہیے کہ اس حکم کو سن کر فوراً دل سے اس کو

مان لے۔اس کے دل میں اس کے متعلق کوئی ذرہ برابر خرخشہ اور کوئی اشکال پیدا نہ ہو اور زبان سے بھی اس کی اطاعت کا اظہار ان الفاظ میں ہونا چاہیے کہ ہم نے سنا اور اس کو مان لیا، اور ہم دل سے راضی ہو گئے۔کسی بھی بھلی بات کا حکم دیا جائے یا کسی بھی بُری بات سے روکا جائے، ہر موقعہ پر جب وہ شریعت کے حوالہ سے کہی جارہی ہے، کوئی آدمی ہم کو قرآن و حدیث کے حوالہ سے کسی بھلی بات کا حکم کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ قرآن کے حوالہ سے کر رہا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس چیز کا حکم دیا ہے۔یا قرآن کے حوالہ سے کسی بری بات سے ہم کو روک رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس چیز سے منع فرمایا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے آجانے کے بعد پھر ہماری طرف سے اس کے اندر کوئی فی نکالنی نہیں چاہیے، یا زبان سے کوئی اشکال یا اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے؛ بلکہ ہم فوراً اس کو مان لیں اور تسلیم کر لیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اطاعت شعاری

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مزاج اس سلسلے میں یہی تھا۔پہلے بھی قصہ گذر چکا ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اوپر جب تہمت لگائی گئی اور بعد میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سے آیتیں نازل ہوئیں اور اس میں یہ بتلایا گیا کہ اُن پر جو تہمت لگائی گئی تھی؛ وہ جھوٹی تھی، وہ اس تہمت سے پاک ہیں۔اِس تہمت کے لگانے والوں میں حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔اِن کی والدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن ہوتی تھیں اور حضرت مسطح رضی اللہ عنہ مہاجری بھی تھے اور غزوۂ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے۔اور چونکہ وہ غریب تھے اس وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اُن کو خرچہ دیا کرتے تھے۔گویا ان کے نفقہ اور ان کے گذارے کی

ذ مہ داری حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اٹھا رکھی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگائی جانے والی تہمت میں جب انھوں نے حصہ لیا تو اس میں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی انصاف پسندی دیکھیے کہ جب تک حضرت عائشہ کی براءت کے سلسلے میں آیتیں نازل نہیں ہوئی تھی؛ وہاں تک انھوں نے ان کا نفقہ بند نہیں کیا۔ لیکن جب براءت کی آیتیں نازل ہوئیں تب انھوں نے نفقہ بند کردیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ کی پاکی کے سلسلے میں آیتیں نازل ہوگئیں تو اب بات صاف ہوگئی کہ یہ لوگ جھوٹے تھے۔ اور یہ معاملہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ حضرت ابوبکر کی بیٹی ہیں بلکہ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی زوجۂ مطہرہ ہیں، اس نسبت کی وجہ سے خرچہ بند کیا کہ اچھا! اُن کے ساتھ یہ معاملہ کیا؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ اب کبھی ان پر خرچ نہیں کروں گا، اس پر باری تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ﴾ تم میں جو لوگ فضیلت والے اور کشادگی والے ہیں یعنی صاحبِ فضیلت ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ نے مالی طور پر بھی ان کو وسعت سے مالا مال کر رکھا ہے وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں کو اور غریبوں کو اور ہجرت کرنے والوں کو نہیں دیں گے ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا﴾ ان کو چاہیے کہ درگزر سے کام لیں اور معاف کردیں ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَكُمْ﴾ کیا وہ لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کردے؟ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی، اُسی وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: ﴿بَلٰى﴾ کیوں نہیں! مَیں تو اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت کرے۔ اُسی وقت ان کا وہ خرچہ جو بند کردیا تھا؛ پھر شروع

کر دیا، بلکہ پچھلا جو رہ گیا تھا وہ بھی دیا اور آئندہ کے لئے قسم کھائی کہ کبھی بند نہیں کروں گا۔

دیکھئے! ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے قرآن وحدیث کے دلائل سے ہماری غلطی واضح ہو جاتی ہے، اس کے باوجود بھی اس میں تاویلیں کرتے ہیں۔ یہ تاویل والی شان نہیں ہونی چاہیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات جب پڑھتے ہیں تو اس میں یہ بات ہم کو واضح طور پر ملتی ہے کہ جب کوئی حکم آیا، پھر تو بس! اُسی حالت میں اس کو تسلیم کرلیا۔

﴿حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل﴾

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، انھوں نے اپنی بہن کا نکاح ابوالبدّاح بن عاصم نامی صحابی سے کرایا، انھوں نے ایک طلاق رجعی دی تھی، عدت کے اندر رجوع بھی کر سکتے تھے، لیکن رجوع نہیں کیا۔ عدت ختم ہوگئی، نکاح کا معاملہ ختم ہو گیا۔ اب لوگوں کی طرف سے ان کے پاس پیغام آنے لگے تو اِنھوں نے بھی پیغام دیا جنھوں نے طلاق دی تھی اور ان کی بہن بھی دوبارہ انھیں کے نکاح میں جانا چاہتی تھیں اور چونکہ ایک طلاق دی گئی تھی اس لئے عدت کے بعد دوبارہ نکاح بھی ہوسکتا تھا۔ حضرت معقل بن یسار کو غصہ آیا کہ مَیں نے ان کے ساتھ اکرام وتوقیر کا معاملہ کرتے ہوئے اپنی بہن ان کے نکاح میں دی تھی تو انہوں نے طلاق دے دی اور پھر رجوع کر سکتے تھے لیکن رجوع بھی نہیں کیا اور اب پھر پیغام بھیج رہے ہیں۔ لہٰذا قسم کھالی کہ مَیں اپنی بہن کا نکاح ان سے نہیں کراؤں گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا! ان کے سامنے آیت پڑھی، تو اُسی وقت انھوں نے ان صحابی کو بلایا اور اپنی بہن کا نکاح کرا دیا۔ (المستدرک، ۲۶۶۸)

﴿خلاصۂ کلام﴾

حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ مزاج تھا کہ شریعت کا کوئی حکم جب ان کے سامنے بیان کیا جاتا تو وہ اس پر فوری عمل کرلیا کرتے تھے۔آج اگرچہ نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرمانہیں ہیں،لیکن اللہ تعالیٰ کا کلام موجود ہے، نبی کریم ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ بھی ہمارے سامنے ہیں، جب قرآن وحدیث سے کوئی چیز ہمارے سامنے آجائے تو پھر ہمیں اپنے سابق رویہ کے اوپر -جس کا غلط ہونا قرآن وحدیث سے ہمارے سامنے واضح ہوچکا- اصرارنہیں کرنا چاہیے، بلکہ جہاں غلطی واضح ہو؛ اُسی وقت اس کوتسلیم کرلینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ھمیں عمل کی توفیق نصیب فرمائے

اَلنَّھْیُ عَنِ الْبِدَعِ

وَ

مُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ

﴿بدعات سے ممانعت﴾

اقتباس

جونئی بات ایجاد کی جائے اس کو عربی میں بدعت اور مُحدَث کہتے ہیں
لیکن شریعت کی اصطلاح میں جو بدعت کہی جاتی ہے وہ ذرا الگ ہے
نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

﴿مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَاهٰذَامَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَرَدٌّ﴾

جو ہمارے دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کرے جو دین میں نہیں ہے یعنی جس کا
مأخذ اور جس کی کوئی دلیل دین کے اندر موجود نہ ہو؛ تو وہ قابلِ رد ہے۔
ہاں! قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ثبوت ہو، یا حدیثِ پاک میں اس کا کوئی ثبوت ہو،
یا صحابۂ کرام کے اجماع کے اندر اس کا کوئی ثبوت ہو، یا قیاس یعنی وہ دلیلِ عقلی جس کی
بنیاد قرآن وحدیث پر ہو، اس سے کوئی ثبوت ہو
تب تو وہ ایسی بات ہوئی جو نئی نہیں ہے، بلکہ دین کے اندر اس کی اصل اور بنیاد موجود ہے
لیکن جس کا کوئی ثبوت قرآن وسنت میں نہیں ملتا، یا جن کو دلائلِ شرعیہ کہا گیا ہے ان
میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا
تو وہ دین کی اصطلاح میں بدعت اور نئی بات کہلاتی ہے

رجب المرجب ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم نومبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً۔أمابعد.

فأعوذباللہمن الشیطان الرجیم بسم اللہالرحمن الرحیم.

فَمَاذَابَعْدَالْحَقِّ اِلَّاالضَّلَال

وقال تعالیٰ:مَافَرَّطْنَا فِیْ الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ

وقال تعالیٰ:وَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اَلیٰ اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ

﴿بدعت کیا ہے؟﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے ﴿اَلنَّھْیُ عَنِ الْبِدَعِ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ﴾ ''بِدَعٌ'' یہ جمع ہے ''بِدْعَۃٌ'' کی۔اور ''مُحْدَثَاتٌ'' یہ جمع ہے ''مُحْدَثَۃٌ'' کی۔نئی بات جو ایجاد کی جائے اس کو عربی میں بدعت اور مُحدَث کہتے ہیں۔تو عنوان ہوا ''دین کے معاملہ میں بدعتوں اور نئی چیزوں سے ممانعت کا بیان''

بدعت یہ عربی لفظ ہے اور جیسا کہ ابھی بتلایا کہ عربی زبان میں بدعت کا معنٰی نئی بات کے ہیں۔ویسے لغت کے اعتبار سے تو ہر نئی بات کو بدعت کہہ سکتے ہیں لیکن شریعت کی اصطلاح میں جو بدعت کہی جاتی ہے وہ ذرا الگ ہے۔جیسا کہ آگے روایت آتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿مَنْ أَحْدَثَ فِیْ أَمْرِنَاھٰذَامَالَیْسَ مِنْہُ فَھُوَرَدٌّ﴾ جو ہمارے دین میں

کوئی ایسی بات ایجاد کرے جو دین میں نہیں ہے یعنی جس کا مأخذ اور جس کی کوئی دلیل دین کے اندر موجود نہ ہو؛ تو وہ قابلِ رد ہے۔ ہاں! قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ثبوت ہو، یا حدیث پاک میں اس کا کوئی ثبوت ہو، صحابۂ کرام کے اجماع کے اندر اس کا کوئی ثبوت ہو، یا قیاس یعنی وہ دلیلِ عقلی جس کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہو اس سے کوئی ثبوت ہو؛ تب تو وہ ایسی بات ہوئی جو نئی نہیں ہے، بلکہ دین کے اندر اس کی اصل اور بنیاد موجود ہے۔ لیکن اگر آپ کوئی ایسی بات کرلیں جس کا کوئی ثبوت قرآن وسنت میں نہیں ملتا، یا جن کو دلائلِ شرعیہ کہا گیا ہے یعنی نبی کریم ﷺ کا عمل اور آپ کے خلفاءِ راشدین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل اور ائمہ مجتہدین کے اقوال میں اس کا ثبوت نہیں ملتا؛ تو وہ دین کی اصطلاح میں بدعت اور نئی بات کہلاتی ہے۔ اور ایسی چیز سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی ممانعت کو بتلانے کے لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کو قائم کیا ہے اور کچھ آیتیں پیش کی ہیں۔

﴿حق کے علاوہ سب گمراہی ہے﴾

پہلی آیت میں ایک ٹکڑا لائے ہیں ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ﴾ حق کے واضح ہونے کے بعد اب سوائے گمراہی کے اور کیا رہ گیا؟ یعنی نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے قرآنِ پاک نازل کیا اور اللہ کی اس کتاب کو نبی کریم ﷺ نے لوگوں تک پہنچایا اب اس میں جو چیزیں وضاحت طلب تھیں کہ اس کی کچھ تفصیل بیان کی جائے، عملی طور پر اس کا طریقہ امت کو بتلایا جائے، حضور ﷺ کا منصب ہی یہ تھا ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ قرآنِ پاک کے ذریعہ سے آپ کی طرف جو نازل کیا گیا، اللہ تعالیٰ کی جو بات پہنچائی گئی ہے، ان میں جو چیزیں وضاحت طلب ہوں، اور تفصیل کی ضرورت ہو، نبی کریم ﷺ اپنے

عملِ مبارک کے ذریعہ،اپنے ارشادِ پاک کے ذریعہ سے اس کی وضاحت فرمائیں۔ نبی کریم ﷺ جو لے کر آئے اور آپ نے جو چیز امت کے سامنے پیش کی اس کے ذریعہ سے حق واضح ہوگیا،اب اس حق کے واضح ہونے کے بعد اگر کوئی آدمی اپنی طرف سے کوئی چیز پیش کررہا ہے؛تو وہ سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں ہے۔

﴿بدعتی زبانِ حال سے یوں کہنا چاہتا ہے......﴾

حجۃ الوداع کے موقعہ پر میدانِ عرفات میں جمعہ کے دن نبی کریم ﷺ پر یہ آیتِ کریمہ نازل کی گئی ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آج تمہارے لئے مَیں نے دین کو مکمل کردیا اور دین کی نعمت تمہارے لئے تام اور کامل کردی اور تمہارے واسطے اسلام کے دین ہونے پر مَیں راضی اور خوش ہوگیا،اس آیت نے آکر گویا یہ اعلان کردیا کہ جو کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ تک اور آپ کے ذریعہ سے لوگوں تک پہنچانا تھا؛وہ سب آگیا،اور نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل اور اپنے پاک ارشادات کے ذریعہ سے اس کی وضاحت فرمادی،اب اس کے بعد اگر کوئی آدمی اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے تو گویا وہ اپنی زبانِ حال سے یوں کہنا چاہتا ہے کہ دین مکمل نہیں ہوا، بلکہ کچھ رہ گیا تھا اب مَیں لوگوں کے سامنے پیش کررہا ہوں۔ تو جو آدمی دین کے اندر کوئی نئی چیز گھڑتا ہے وہ اپنی زبانِ حال سے دین کی تکمیل سے انکار کرتا ہے،حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل فرمادیا،اسی کو﴿فَمَاذَابَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿مَافَرَّ طْنَافِیْ الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ﴾ اور ہم نے کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں کوئی چیز نہیں چھوڑی،سب چیز اس میں آگئی۔

﴿حق کی کسوٹی؛ کتاب وسنت﴾

﴿وَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ﴾ اے لوگو! اگر کسی بات میں تمہارے درمیان نزاع اور اختلاف ہو جائے کہ یہ معاملہ دین ہے یا نہیں۔ایک فریق کہتا ہے کہ یہ دین ہے اور دوسرا فریق اس کے دین ہونے سے انکار کرتا ہے تو اب ان کے اس جھگڑے کا فیصلہ کس طرح ہو؟ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ﴾ اپنے اس نزاع کو اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش کردو۔قرآن وحدیث جس کی تائید کردے؛ وہ دین ہے۔اور قرآن وحدیث جس کی تردید کردے؛ اس کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہو جائے گا۔ کسی بھی چیز کے ثبوت کے لئے جب تک کہ قرآن وحدیث سے یا قرآن وحدیث سے ثابت شدہ دلائل سے کوئی آدمی اپنی بات واضح نہ کردے؛ وہاں تک شرعی طور پر مستند نہیں کہیں گے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج تو اللہ کے رسول ہمارے درمیان میں موجود نہیں ہیں آپ تو پردہ فرما چکے ہیں پھر کس طرح رسول کے سامنے پیش کریں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ﴿ اَیۡ اَلۡکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ ﴾ اللہ ورسول کے سامنے پیش کرنے سے مراد قرآن وحدیث کے سامنے پیش کرنا ہے کہ اس سے ثبوت مہیا کرو۔

﴿صراطِ مستقیم کی وضاحت﴾

﴿وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡہُ﴾ اے محمد ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے تم لوگ اس کی پیروی کرو اور اس پر چلو ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ﴾ اور اِدھر اُدھر مختلف راستوں پر نہ چلو کہ وہ راستے تم کو اللہ تعالیٰ کے راستہ سے ہٹا دیں گے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک سیدھی لکیر اور خط کھینچا اور اس کے

بعد آڑی ٹیڑھی لائنیں کھینچیں اور فرمایا کہ یہ تو ہے صراطِ مستقیم اور سیدھا راستہ۔ جو اس پر چلے گا وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اور جو آڑے ٹیڑھے خط اور لکیریں تھیں ان کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ وہ گمراہی کی راہیں ہیں جن میں سے ہر ایک پر ایک شیطان بیٹھا ہوا ہے جو آدمی کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے، راہِ راست سے ہٹانے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ (مسند احمد، ۱/۴۶۵)

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا۔

مختصر لفظوں میں دین کی حقیقت

یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دین کی حقیقت کیا ہے؟ مختصر لفظوں میں اگر آپ سمجھنا چاہیں تو دین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی مرضی پر چلنا، اپنی مرضی کو چھوڑ دینا۔ وہ جس طرح کہیں اس طرح کرنے کا نام دین ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے سارے احکام تو اس کی صورتیں ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے وہ بتلایا گیا ہے کہ اس طرح کرو، یہ اللہ و رسول کی مرضی ہے، اس طرح کرو گے تو گویا آپ اس کی مرضی پر چلے ہوئے کہلاؤ گے۔ اصل یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے حوالے کردے، وہ جس طرح کہیں اس کے مطابق چلے، چاہے اپنا جی کچھ بھی چاہتا ہو۔

نماز ممنوع بھی ہے

دیکھو! نماز جیسی اہم عبادت کہ ایمان کے بعد عبادات میں سب سے اونچا درجہ ہے دین کی بنیاد اس کو قرار دیا گیا: ﴿اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ﴾ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے کچھ

اوقات ایسے بھی رکھے کہ جس میں نماز کو ممنوع قرار دیا گیا، جس وقت سورج طلوع ہو رہا ہو تو نماز مت پڑھو، سورج سر کے اوپر ہے اس وقت بھی نماز مت پڑھو، سورج ڈوب رہا ہو اس وقت نماز مت پڑھو۔ ان اوقات میں کوئی آدمی نماز پڑھے گا تو ثواب تو کیا ملتا؛ اُلٹا وہ گنہگار کہلائے گا، اور ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر عذاب ہو۔

اسی طرح روزانہ طلوعِ آفتاب کے بعد اشراق کی نماز پڑھی جاتی ہے لیکن عید کے روز عید کی نماز سے پہلے کوئی نفل نہیں ہے، اُس روز اشراق بھی نہیں پڑھ سکتے۔ ایک مرتبہ عید کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ عید گاہ تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے، آپ نے اس سے کہا: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز نہیں پڑھی، تمہیں اس نماز کے اوپر ثواب نہیں ملے گا، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب دے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ نماز جیسی اونچی چیز بھی اگر ہم اپنی مرضی سے کرنے لگیں گے؛ تو عبادت نہیں کہلائے گی، وہ بھی اُسی طرح اور اُنہیں اوقات میں اور اسی انداز سے ادا کرنا ہے جس انداز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔ اس میں ذرا سا بھی پھیر پھار (ہیر پھیر) کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ چیز قبولیت کا مقام حاصل نہیں کرے گی۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور آپ کی پیروی ہی بنیاد قرار دی گئی ہے۔

﴿مسلمان متبع ہے، نہ کہ مبتدع﴾

اصل میں ایک مسلمان کی شان یہی ہونی چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو مضبوطی سے تھام لے اور اسی کے مطابق چلے۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنائے گئے تو سب سے پہلی تقریر جو انھوں نے کی تھی اس میں فرمایا تھا: ﴿اِنِّیْ مُتَّبِعٌ لَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ﴾ (سبل الھدیٰ والرشاد) مَیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرنے والا ہوں، اپنی طرف سے کوئی

نیا طریقہ اور نیا فریضہ- جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی -ایجاد کرنے والا نہیں ہوں، جو کچھ بتلانا تھا وہ تو نبی کریم ﷺ کے ذریعہ بتلا دیا گیا، اب اس میں کوئی کمی بیشی ہونے والی نہیں ہے

﴿نماز میں آنکھیں بند کرنا﴾

دیکھئے! نماز کے آداب میں سے ہے کہ آدمی اگر قیام کی حالت میں ہو تو اس کی نگاہیں سجدے کی جگہ پر ہونی چاہئیں، رکوع میں ہو تو نگاہیں پاؤں کی پشت پر ہوں۔ نماز میں آنکھیں بند کرنے کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے، آداب کے خلاف ہے، لیکن اگر کوئی آدمی ایسا ہے کہ آنکھیں بند کئے بغیر اس کو خشوع وخضوع حاصل نہیں ہوتا، وساوس اور خیالات سے نجات نہیں ملتی، اپنے آپ کو وساوس اور خیالات سے نجات دلانے کے واسطے، خشوع و خضوع پیدا کرنے کے لئے اگر وہ آنکھیں بند کرے گا تو اس کو اجازت اور گنجائش ہے، لیکن طریقہ پھر بھی وہی ہے کہ آنکھیں کھلی رکھ کر نماز پڑھے۔

نبی کریم ﷺ نے کوئی نماز آنکھیں بند کر کے ادا نہیں فرمائی۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے: ﴿لَمْ يَكُنْ مِنْ هَدْيِهِ ﷺ تَغْمِيْضُ عَيْنَيْهِ فِي الصَّلٰوةِ﴾ آپ ﷺ کا طریقہ نماز میں آنکھیں بند کرنے کا نہیں تھا۔ (زاد المعاد-۱/۲۸۳)

﴿ایک واقعہ﴾

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے تمام اکابر کے شیخ ہیں ان کے ملفوظات میں ایک واقعہ لکھا ہے: ایک بزرگ تھے، جب نماز ادا کیا کرتے تھے تو نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کی غرض سے آنکھیں بند کر لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: باری تعالیٰ! مجھے معلوم ہو جائے کہ میں جو نماز ادا کرتا ہوں؛ اس کا تیری

بارگاہ میں کیا مقام ہے؟ قبول بھی ہے یا نہیں؟ اس کی کیا حیثیت ہے مجھے بتلادی جائے۔ تو کشف کے عالَم میں ان کے اوپر ایک عورت پیش کی گئی جو بڑی حسین وجمیل تھی، اس کے سارے اعضاء بڑے متوازن تھے لیکن اندھی تھی۔ کہا گیا کہ یہ تمہاری نماز کی صورتِ مثالی ہے کہ اس کے پورے جسم میں اور اس کی پوری ساخت میں کوئی کمی نہیں ہے، سارے اعضاء بالکل سڈول اور موزوں ہیں، بس! صرف اندھی ہے۔ دریافت کیا: اندھی کیوں؟ تو جواب ملا: آپ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کا طریقہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنے کا نہیں تھا۔

علماء نے لکھا ہے کہ چاہے آنکھیں کھلی رکھنے کی صورت میں وساوس اور خیالات آتے ہیں جو ہم اپنے اختیار سے تو نہیں لاتے، لیکن چونکہ ایسی نماز نبی کریم ﷺ کے طریقہ کے مطابق ہے، اس لئے اُس نماز سے اچھی ہی کہلائے گی جو آنکھیں بند کر کے پڑھی جائے؛ چاہے اس میں وساوس نہ آئیں۔

اسی کو بدعت کہتے ہیں

مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر چلنے کا نام دین ہے، اپنی مرضی پر چلنے کا نام دین نہیں ہے۔ جس موقعہ پر حضورِ اکرم ﷺ نے جو کچھ بتلایا اس کو ہو بہو کرو؛ تو وہ دین ہے۔ گویا اُس کے خلاف جو کرے گا وہ اپنی طرف سے ایک چیز ایجاد کر رہا ہے اور نئی چیز گھڑ رہا ہے؛ اسی کو بدعت کہا جاتا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی سلسلے میں روایت لاتے ہیں۔

بدعت کی تعریف (Definition) کی وضاحت

عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت: قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَرَدٌّ.

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بدعت کی تعریف بیان کی ہے۔ تعریف کا مطلب وہ نہیں کہ کسی کی خوبی بیان کرنا، بلکہ بدعت کو پہچنوایا ہے کہ بدعت کیا ہے (آپ یہ نہ سمجھیں کہ مَیں بدعت کی تعریف کرر ہا ہوں) یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے گجراتی زبان میں جس کو (વ્યાખ્યા) بولتے ہیں۔ تو اس حدیثِ پاک میں بدعت کی (વ્યાખ્યા) کی گئی ہے یعنی بدعت کیا ہے، بدعت کی وضاحت فرمائی ہے کہ جو آدمی ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرے جو دین میں سے نہیں ہے؛ تو وہ چیز مردود ہے۔

بدعت کی شرعی تعریف (Definition)

معلوم ہوا کہ جو ایجاد دین سمجھ کر کی جائے حالانکہ اس کا ثبوت قرآن وحدیث میں اور خلفاءِ راشدین، صحابہ کے عمل میں موجود نہ ہو، ائمہ کے یہاں بھی اس کا ثبوت نہ ہو؛ تو ایسی چیز کو بدعت کہا جاتا ہے۔ شرعی طور پر بدعت وہی ہے۔

ویسے نبی کریم ﷺ کے زمانہ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کے بعد بہت سی نئی نئی چیزیں دنیا میں ایجاد ہوئیں، جیسے پنکھا، ٹیوب لائٹ، کرسی وغیرہ، یہ سب اس وقت کہاں تھا، اب کوئی کہے کہ مولوی صاحب! یہ بھی بدعت ہے؟ تو جواب دیا جائے گا کہ نہیں، اس لئے اس کو جب آپ اپنے گھر میں استعمال کرتے ہیں تو یہ سمجھ کر نہیں کرتے کہ کوئی عبادت انجام دے رہا ہوں اور اس کے استعمال کرنے پر مجھے ثواب ملے گا۔ یا آپ موٹر کی سواری کرتے ہیں تو کارِ ثواب اور دین سمجھ کر نہیں کرتے، لہٰذا بدعت تو وہ چیز کہلاتی ہے؛ جو دین سمجھ کر کی جائے۔

﴿ایصالِ ثواب زندوں کو بھی کیا جاسکتا ہے﴾

دیکھو! شریعت نے ایک حکم دیا ہے جو مطلق اور عام ہے، شریعت کی طرف سے اس کام کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا، بلکہ جس وقت آپ چاہیں اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔اب آپ اگر اس کام کی انجام دہی کے لئے کوئی وقت مقرر کرلیں؛ تو یہ بدعت ہے۔ مثلاً ایصالِ ثواب کا معاملہ ہے۔کسی کا انتقال ہوجائے اور آپ مرنے والے کو ثواب بخشنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے شریعت میں مختلف طریقے بتلائے گئے ہیں کہ ہر نیکی کا کام جو آپ انجام دیں، اس کا جو ثواب آپ کو ملا ہے وہ کسی بھی مردے کو بخش سکتے ہیں، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے دنیا میں آپ کوئی چیز محنت کرکے کمائیں اور جو پیسہ حاصل ہو، وہ آپ اپنے پاس جمع رکھنے کے بجائے کسی اور کو دے دیں، آپ کے کھاتے میں جمع شدہ کسی دوسرے کے کھاتے میں ٹرانسفر (Transfer) کردیں، تو کہتے ہیں کہ بخشش کردی۔اسی طرح ثواب میں بھی ہے آپ نماز پڑھیں، تسبیح پڑھیں، قرآنِ پاک کی تلاوت کریں، درود شریف پڑھیں، نیکی کے کام میں پیسہ خرچ کریں، کسی غریب و مسکین کو کھانا کھلادیں، کسی ننگے کو کپڑا پہنادیں، یہ سارے نیکی کے کام ہیں، ہر نیکی کے کام پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب ملے گا، اب آپ کو ملا ہوا یہ ثواب آپ کسی کو بھی بخش سکتے ہیں۔علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس کیلئے مردے کی بھی قید نہیں ہے، زندہ لوگوں کو بھی بخش سکتے ہیں یعنی یوں کہہ سکتے ہیں کہ میں نے میرا ثواب فلاں کو دے دیا۔اسی لئے کتابوں میں مردے کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔

جیسے کوئی شخص بیمار ہوجائے اور اس کے اوپر حج فرض ہو لیکن حج کے لئے نہیں جاسکتا ہے، اور اپنی زندگی ہی میں وہ کسی دوسرے کو بھیج دے؛ تو بھیج سکتا ہے۔اور اس حج کا ثواب بھیجنے والے کو ملتا ہے جو زندہ ہے۔تو آخر یہ کیا ہے؟

﴿ایصالِ ثواب کا آسان مطلب﴾

بہر حال! ایصالِ ثواب کا حاصل یہ ہے کہ کسی بھی نیکی کے کام کے انجام دینے کی صورت میں جو ثواب ہمیں ملا؛ ہم اپنا وہ ثواب دوسرے کو دے رہے ہیں، بخش رہے ہیں، دوسرے کے نام ٹرانسفر (Transfer) کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ جو ثواب ہمیں ملا؛ وہ فلاں کو بخش دیجئے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس کو بھی ملے گا اور ہم بھی محروم نہیں رہیں گے۔ دنیا کی چیز کا حال تو یہ ہے کہ دوسرے کو دیں گے تو وہ اسی کے پاس چلی جائے گی، لیکن ایصالِ ثواب کے اندر پڑھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔

﴿ایصالِ ثواب کی اجازت ہے﴾

خیر! میں یہ عرض کررہا تھا کہ شریعت نے ہمیں اس کی اجازت دی کہ مرنے والے کو آپ دعائے مغفرت کرکے یا کچھ نیکی کا کام کرکے ثواب پہنچاسکتے ہیں، اس کے لئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ، کوئی خاص وقت، کوئی ہیئت اور کوئی خاص پوزیشن مقرر نہیں کی کسی بھی طریقہ سے پہنچاسکتے ہیں۔ کھانا کھلا کر بھی ثواب پہنچاسکتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی آدمی یہ طے کرلے کہ مرنے والے کی موت کے تیسرے دن ہی کھانا پکائیں گے اور غریبوں کو کھلائیں گے اور وہی ثواب پہنچائیں گے۔ تو گویا شریعت نے ایک چیز ہمارے لئے (Open) رکھی تھی اور ہم نے اس کو تیسرے دن کے ساتھ مقید کردیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ کھلانے کا کام اپنی جگہ پر نیکی کا ہے، لیکن آپ نے اس کے اندر اتنا جو اضافہ کردیا کہ وہ تیسرے دن ہی ہونا چاہیے، یہ تیسرے دن والی بات آپ نے جو پیش کی، اس کے لئے آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ قرآنِ کریم میں کہیں ہے؟ حدیثِ پاک میں ہے؟ صحابہ کے

عمل سے یہ بات ثابت ہے؟ ائمۂ مجتہدین نے آپ کو بتلایا ہے؟ اگر ہے تو اس کا ثبوت پیش کیجئے، مان لیا جائے گا۔ اور اگر کوئی ثبوت نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی طرف سے ایک چیز بڑھادی۔ لہٰذا اگر یہی کھانا دوسرے روز کھلایا جائے، یا چوتھے روز کھلایا جائے؛ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں ثواب نہیں ہے۔

﴿جہاں شریعت نے ہی قید لگائی﴾

یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے عید کے روز شریعت نے دو رکعات پڑھنے کا ہمیں حکم دیا ہے۔ تو دیکھو! عید کی نماز وہ نماز ہے کہ آپ کو عید کے روز ہی پڑھنی ہے، اس کے علاوہ آپ نہیں پڑھ سکتے۔ شریعت نے اس کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا ہے، اسی دن میں پڑھی جائے گی، اور پڑھنا ضروری ہے، اور اسی دن میں پڑھیں گے تو وہ ثواب ملے گا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ باقاعدہ حدیث میں موجود ہے، کتابوں میں صحابہ اور ائمہ کے عمل کے اندر موجود ہے۔

جمعہ کی نماز خاص جمعہ کے روز ہی پڑھی جاتی ہے۔ آپ جمعہ کے علاوہ کسی اور دن میں اس کو ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان مواقع پر یہ قیدیں حدیثِ پاک میں آئی ہیں۔ اس طرح کی کوئی قید ہے تو سر آنکھوں پر۔ اور اگر کوئی قید نہیں ہے؛ تو پھر قبول نہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو چیز، جو عمل اور جو بات آپ پیش کر رہے ہیں اس میں ذرہ برابر بھی اپنی طرف سے ہونا نہیں چاہیے۔ ہاں! یہ ضروری سمجھے بغیر (کہ اگر نہیں کروں گا تو کوئی گناہ ہوگا) کوئی آدمی ویسے ہی اپنے طور پر اپنی مرضی سے کسی روز کھانا پکالے اور غریبوں کو کھلادے؛ تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اور عام طور پر تو ہم یوں سمجھتے ہیں کہ نیکی حاصل کرنے کے لئے غرباء کو کھلاؤ اور یہاں تو معاملہ برعکس یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ حیثیت لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے۔

﴿میت کے گھر والوں کے لئے کھانا بھیجنا﴾

غزوۂ موتہ جو ے سہ .ھ میں پیش آیا تھا، اس میں کئی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی تھے؛ وہ بھی شہید ہوئے تھے، ان کی شہادت کی جب اطلاع آئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿اِصْنَعُوْا لِأَهْلِ جَعْفَرَ طَعَاماً﴾ (ترمذی شریف۔ کتاب الجنائز۔ ۹۹۸) جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا بنا کر بھیج دو، اس لئے کہ ان کے لئے ایک مشغول کر دینے والی چیز پیش آئی ہے یعنی ان کی موت کی خبر آئی ہے۔ اور موت کی خبر کی وجہ سے وقتی طور پر آدمی حواس باختہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے کھانا کہاں سے بنائے اس کی سوجھ بوجھ بھی رہتی نہیں ہے۔ اسی لئے شریعت کا حکم یہ ہے کہ جس کے یہاں میت ہوگئی ہو؛ اس دن اس کے یہاں رشتہ دار، پڑوسی وغیرہ میں سے کوئی آدمی کھانا بھیج دے کہ اس کی وجہ سے اُن بیچاروں کو کھانا پکانے کی مہلت نہیں ملتی۔

﴿اُلٹی چال﴾

شریعت کا حکم تو وہ ہے جو اوپر گذرا، اور آج کل ہمارے یہاں معاشرے میں اس کے برعکس کیا جاتا ہے کہ جس کے یہاں میت ہو وہ میت کے کفن دفن کا انتظام کرے یا نہ کرے؛ دیگ ضرور چڑھائے، اور سب کو کھانا کھلائے۔

پھر یہ ہے کہ اس کے واسطے جو رقمیں خرچ کی جاتی ہیں وہ مرنے والے کے مال میں سے خرچ کی جاتی ہیں اور اس کے وارثوں کی اجازت نہیں لی جاتی۔ بعض مرتبہ وارثوں میں

نابالغ بچے بھی ہوتے ہیں تو اس کے متعلق علماء نے مسئلہ لکھا ہے کہ نابالغ بچہ اگر اجازت دے تب بھی اس کی اجازت معتبر نہیں ہے، اور اس کا دیا ہوا ہدیہ لینا بھی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس کو اپنے مال میں اس طرح کا تصرف کرنے کا حق ہی نہیں ہے کہ اپنی ملکیت میں سے کوئی چیز نکالے۔ ہاں! اگر کوئی اس کو کچھ دے تو اس کو قبول کر سکتا ہے لیکن وہ کسی کو کچھ دے نہیں سکتا۔ تو کبھی وارثوں میں نابالغ بچے ہوتے ہیں۔ اسی طرح میت کے دوسرے حقوق بھی ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسی بہت سی چیزیں گھڑ لی گئی ہیں؛ جن کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

﴿تیجہ، چالیسہ، برسی وغیرہ﴾

یہاں دیکھئے! ایصالِ ثواب کی اصل تو موجود ہے لیکن یہ کھانا جو موت کے دن کھلایا جاتا ہے؛ اس کی تو کوئی اصل ہی نہیں ہے۔ اور ایصالِ ثواب کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ آپ میت کی طرف سے فقیروں کو کھلائیں لیکن اس کیلئے کوئی دن مقرر کر دیں کہ تیسرا دن، دسواں دن چالیسواں دن یا برسی وغیرہ؛ وقت کی جو تعیین کر دی گئی ہے، یہ بغیر دلیل کے ہے۔ لہٰذا اس تعیین کے بغیر آپ کسی بھی دن کھلائیے، اور اس کے لئے کوئی ڈھنڈھورا (ઢંઢોરા) پیٹنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جتنا اخفاء کے ساتھ یہ عمل کیا جائے گا؛ اتنا ہی اخلاص بھی زیادہ ہوگا، اور اس میں ثواب بھی زیادہ ملے گا اور جس کو ثواب پہنچایا جا رہا ہے اس کو فائدہ بھی زیادہ ہوگا۔

﴿پیسے دے کر قرآن خوانی کروانا﴾

بعض جگہ پر پیسے دے کر قرآن خوانی کرائی جاتی ہے۔ پیسے دے کر جو قرآن پڑھایا جاتا ہے، اس کے بارے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جو آدمی پیسہ لے کر قرآن پڑھتا ہے، خود اس پڑھنے والے کو ہی اس کا ثواب نہیں ملتا۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا پڑھنا

عبادت ہے،اورعبادت اگراللہ کے واسطے کی جائے؛تب ہی اس پرثواب ملتا ہے۔

اگرکوئی شخص یوں کہے کہ مجھے پانچ روپیہ دو،مَیں دورکعات نماز پڑھتا ہوں،تو اندازہ لگائیے کہ جب آپ کے پانچ روپے کے لئے وہ دورکعات نماز پڑھے گاتواس کواس پرثواب ملے گا؟اسی طرح جوآدمی پیسے لے کرقرآن پڑھے گاتواس پڑھنے پراس کوثواب نہیں ملے گا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب پڑھنے والے کوخودثواب نہیں ملاتووہ بخشے گا کیا؟ گجراتی میں کہاوت ہے:(કુવાં માં હોય તો હવાડા માં આવે)یعنی کنویں میں پانی ہوگاتو حوض میں آئے گا۔جب پڑھنے والے کوخودہی کوئی ثواب ملانہیں؛تووہ آخرمیت کوکیا بخشے گا؟ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھاہے کہ اگراس میت کے وارثوں کومعلوم ہوجائے کہ ہم اتنی بڑی رقم خرچ کرکےاس کودے رہے ہیں لیکن اس کوخودہی ثواب نہیں مل رہاہے؛توایک پیسہ بھی نہیں دیں گے۔لیکن لوگ ایسے ہیں کہ جاننے والے جب ان کوبتلاتے ہیں تب بھی ماننے کے لئے تیارنہیں ہیں؛تواب کیا کیا جائے؟خودہی اپنانقصان کررہے ہیں۔اس سے بہترتویہ تھا کہ خودکوجوکچھ بھی آتاہے،سبحان اللہ،الحمدللہ وغیرہ اخلاص کے ساتھ پڑھ کرثواب پہنچادیں، تووہ بھی پہنچ جائے گا۔

﴿بدعت اوررسم میں فرق﴾

ایک چیزمَیں یہ بھی عرض کرناچاہتاتھاکہ ایک توہے بدعت اورایک ہے رسم۔رسم کی بھی کوئی اصل اوردلیل قرآن وحدیث میں موجودنہیں ہوتی،لیکن اس کوکرنے والاجب کرتا ہےتوثواب کاکام سمجھ کرنہیں کرتا۔

اور بدعت کی بھی کوئی دلیل قرآن وحدیث میں اور شریعت میں موجود نہیں ہوتی، لیکن کرنے والا اس کو ثواب اور دین کا کام سمجھ کر کرتا ہے۔

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ شادی کے موقعہ پر عام طور سے جو کیا جاتا ہے جیسے سہرا پہن لیا یا اور جو کچھ بھی ہوتا ہے، تو اس میں کرنے والا بھی سمجھتا ہے کہ مَیں کوئی عبادت انجام نہیں دے رہا ہوں اور وہ دین سمجھ کر نہیں کرتا۔ اگر اس کا ثبوت قرآن وحدیث اور شریعت میں نہیں ہے؛ تو یہ رسم ہے اور یہ بھی غلط ہی ہے۔ اور اگر ثبوت ہے پھر کرتا ہے، مثلاً ولیمہ، تو یہ سنت ہے، رسم نہیں۔ لیکن جس کا ثبوت نہ ہو اور آپ کریں تو وہ رسم ضرور کہلائے گی لیکن وہ بدعت اس لئے نہیں ہے کہ اس کو دین سمجھ کر نہیں کیا جاتا۔ ہاں! اگر اس میں بھی کوئی چیز ایسی ہے کہ جس کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے؛ تو پھر وہ بدعت کہلائے گی۔

اور غمی کے موقعہ پر عام طور سے جو کیا جاتا ہے، وہ دین اور ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے؛ اس لئے اس کو بدعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دونوں چیزیں بغیر اصل اور دلیل کی ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، لیکن کرنے والا پہلی چیز کو ایک رسم ورواج اور لوگوں کی وجہ سے کرتا ہے، اور دوسری چیز کو ثواب سمجھ کر کرتا ہے۔ تو اول رسم ہے اور ثانی بدعت ہے۔ دونوں گناہ ہیں۔ اور بدعت کا گناہ رسم سے بڑھ کر ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے بیان کی ایک جھلک

عَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَا خَطَبَ اِحْمَرَّتْ عَيْنَاهُ وَعَلَا صَوْتُهُ وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ حَتّٰى كَاَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ، يَقُوْلُ: صَبَّحَكُمْ اَوْمَسَّاكُمْ وَيَقُوْلُ: بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ، وَيَقْرَنُ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ؛ السَّبَابَةُ وَالْوُسْطٰى. وَيَقُوْلُ: اَمَّابَعْدُ فَاِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللهِ

وَخَیْرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃ. ثُمَّ یَقُوْلُ: اَنَا اَوْلٰی بِکُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِہٖ، مَنْ تَرَکَ مَالاً فَلِاَھْلِہٖ، وَمَنْ تَرَکَ دَیْنًا اَوْ ضِیَاعًا فَاِلَیَّ وَعَلَیَّ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب خطبہ دیتے تھے اور تقریر فرماتے تھے تو آپ ﷺ کی مبارک آنکھیں سرخ ہوجاتی تھیں اور آواز بلند ہوجاتی تھی اور آپ کا جوش بڑھ جاتا تھا۔ یہ اس لئے کہ سننے والوں کو بھی کلام کی اہمیت معلوم ہو، جیسا موقعہ ہوتا ہے اس کے مطابق آواز اور انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ لوگوں کو کوئی آنے والے لشکر سے ڈرا رہے ہیں، گویا یوں کہنا چاہتے ہیں کہ دیکھو! دشمن کا ایک لشکر آرہا ہے، ہوسکتا ہے کہ صبح کے وقت آکر آپ کو پکڑ لے اور حملہ آور ہوجائے یا شام کے وقت آکر حملہ آور ہوجائے، یعنی اس کے آنے کا وقت بالکل قریب ہے۔

یہ اہلِ عرب کا خاص انداز تھا، اس لئے کہ عرب میں آپس میں قبائلی چپقلشیں رہتی تھیں، ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی، لوٹ مار، حملہ کرنا چلتا رہتا تھا، کہیں اچانک پہنچ گئے اور اس کا مال لوٹ لیا، اس کے بیوی بچوں کو باندی اور غلام بنالیا۔ ہر وقت وہ ایک دوسرے سے خوف محسوس کرتے تھے اور ڈرے سہمے رہتے تھے کہ معلوم نہیں! کون کس پر کب حملہ آور ہوجائے اور جانی مالی نقصان پہنچادے۔ اس لئے اگر کوئی آکر ان کو اطلاع کر دیتا کہ فلاں قبیلہ حملہ آور ہونے والا ہے تو وہ اس کا بڑا احسان مانتے تھے کہ تم نے ہم کو خطرے کے وقت سے پہلے ہی مطلع کر دیا۔

تو گویا نبی کریم ﷺ بھی اپنے لوگوں کو آگاہ کررہے ہیں کہ قیامت آنے والی ہے، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، حساب وکتاب دینا ہے، اگر اعمال ٹھیک نہیں

ہیں تو جہنم میں جانا ہے، اسی کو ﴿كَانَّهٗ مُنْذِرُ جَيْشٍ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ حکم دیا گیا کہ آپ لوگوں کو ہماری دعوت پہنچائیں تو سب سے پہلی مرتبہ لوگوں کو آپ نے جمع کیا، آپ کوہِ صفا پر چڑھے اور قبیلوں کے نام لے لے کر بلایا، چونکہ آپ پہاڑی پر کھڑے تھے لوگ آپ کے سامنے تھے اور پہاڑی کا پچھلا حصہ آپ کی نگاہوں کے سامنے تھا لیکن لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں تھا، لہٰذا لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: اے لوگو بتلاؤ! میں اگر تمھیں یوں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر چھپا ہوا ہے اور وہ تم پر صبح یا شام کو حملہ آور ہونے والا ہے تو تم میری بات مانو گے؟ لوگوں نے عرض کیا: آج تک ہم نے آپ کو جھوٹا نہیں پایا، آپ تو صادق الامین ہیں، آپ کہیں گے تو ہم مانیں گے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنِّیْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَیْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب آنے والا ہے اس سے میں تم کو ڈرا رہا ہوں۔

﴿حضورِ اکرم ﷺ کی بعثت: قیامت کی علامت﴾

پھر آپ نے فرمایا: میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں، آپ نے اپنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو یوں (اشارہ) کر کے فرمایا کہ اتنے قریب بھیجے گئے، یا یہ ہے کہ دونوں میں جتنا فرق ہے؛ میرے بعد قیامت کے آنے میں اتنا ہی فاصلہ ہے۔

اب کوئی کہے کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کو تو چودہ سو سال ہو گئے، فاصلہ ایسا کتنا بڑا ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا؟

تو دیکھو! بات دراصل یہ ہے کہ دونوں کا فرق اس کی باقی مقدار کے معلوم ہونے پر

موقوف ہے۔دنیا جب سے پیدا ہوئی تب سے لے کر آج تک دنیا کی عمر کتنی ہوئی؛ وہ اگر معلوم ہوجائے تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اب آپ ﷺ کی تشریف آوری اور قیامت کے قائم ہونے کے بیچ فاصلہ کتنا ہے؟ اور دنیا کی عمر ہی ہمیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کتنے ہزاروں سال ہے،تو جتنی وہ ہوگی اسی مناسبت سے نبی کریم ﷺ کے دنیا میں تشریف لانے اور قیامت کے قائم ہونے میں فاصلہ سمجھا جائے گا۔اسی لئے اگلے انبیاءِ کرام اپنی امتوں کو جب قیامت سے ڈراتے تھے اور قیامت کی نشانیاں بتلاتے تھے تو اس میں ایک نشانی نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری بھی بتاتے تھے کہ نبی آخرالزماں آنے والے ہیں،اس کے بعد قیامت آئے گی اس سے پہلے نہیں آئے گی۔جیسے آپ ﷺ نے قیامت کی علامتوں میں ایک بات یہ بتائی ہے

ایک اور بات یاد رہے کہ قیامت کی جتنی بھی علامتیں بتلائی گئی ہیں وہ سب کے سب بُری ہی ہوں؛ یہ ضروری نہیں ہے۔اچھی چیزیں بھی قیامت کی علامتوں میں سے ہیں جیسے حضرت مہدی علیہ السلام کا ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول،اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں لہٰذا یہ غلط فہمی نہ ہو۔

حضور ﷺ نے جہاں قیامت کی علامتیں بتلائی ہیں اُن میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے۔تو ایسے ہی اگلے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام حضور ﷺ کی تشریف آوری کو علامتِ قیامت کے طور پر بیان فرماتے تھے۔گویا یہ پہلی علامت ہے جو دنیا میں ظاہر ہوئی،اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْن﴾ مَیں دنیا میں نبی بنا کر بھیجا گیا اور قیامت بھی ساتھ ہی ہے۔یہ دونوں اتنی قریب ہیں کہ بس! اب میرے بعد کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے،مَیں آخری نبی ہوں،اب تو آگے قیامت ہی آنے

والی ہے ﴿وَيَقْرَنُ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ﴾ اور اپنی دونوں انگلیوں (انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی) کو ملاتے تھے۔

﴿بہترین طرزِ زندگی﴾

پھر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بہترین بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور بہترین طرزِ زندگی نبی کریم ﷺ کا بتلایا ہوا طرزِ زندگی ہے۔

دنیا میں زندگی گزارنے کے جتنے بھی طریقے رائج ہیں ان تمام طریقوں میں زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ اگر کوئی ہے تو وہ نبی کریم ﷺ والا طریقہ ہے۔ کوئی آدمی اگر یہ چاہتا ہو کہ وہ بہترین طریقہ سے زندگی گزارے تو حضور اکرم ﷺ والے طریقہ کو اختیار کرے بس! اس سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹ نہیں سکتا۔ دنیا میں آج بہت سارے طریقے رائج ہیں اور نئے نئے طریقے رائج ہوتے جا رہے ہیں، لیکن بہترین طریقہ حضور ﷺ کا ہی ہے۔

اور دیکھئے! یہاں حضور اکرم ﷺ اپنے طریقہ کو بہترین طریقہ بتلا رہے ہیں اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کو پابند کیا گیا تھا کہ آپ لوگوں کو کہیں کہ مَیں اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندگی گذارنے کا جو بہترین طریقہ ہے؛ وہ لوگوں کو بتلاؤں اور لوگوں تک پہنچاؤں۔

﴿بدترین گناہ بدعت کیوں؟﴾

﴿وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا﴾ اور سب سے بری اور بدترین چیز وہ باتیں ہیں جو نئی ایجاد کی جائیں اور ہر وہ بات جو نئی ایجاد کی جائے؛ وہ گمراہی ہے، گویا بدعت کو نبی کریم ﷺ بدترین چیز فرما رہے ہیں۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو یہاں اسی لئے لائے ہیں۔

اور بدعت کو تمام گناہوں میں بدترین چیز کیوں کہا گیا؟ چاہے زنا کاری ہو یا شراب نوشی ہو، اور جتنے بھی گناہ ہیں ان میں سب سے بدتر گناہ بدعت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی گناہ ہیں ان کا معاملہ تو ایسا ہے کہ جب کوئی آدمی ان گناہوں میں سے کسی کا ارتکاب کرتا ہے تو خود بھی یہ سمجھتا ہے کہ مَیں جو کچھ کررہا ہوں وہ گناہ کا کام ہے۔

ایک آدمی شراب پیتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ مَیں شراب پی رہا ہوں؛ یہ گناہ کا کام ہے ایک آدمی چوری کررہا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ مَیں چوری کررہا ہوں؛ یہ گناہ کا کام ہے۔ زنا کرنے والا سمجھتا ہے کہ مَیں زنا کررہا ہوں؛ یہ گناہ کا کام ہے۔ کرنے والا جب یہ سمجھ رہا ہے؛ تو کسی نہ کسی روز اس کو یہ توفیق بھی ہوجائے گی کہ اس کو اپنی ان حرکتوں پر ندامت ہوگی، اور جب وہ توبہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ سے معافی چاہے گا؛ تو معاف ہوجائے گا۔

لیکن ایک آدمی ایسا ہے کہ گناہ کررہا ہے اور یوں سمجھ رہا ہے کہ مَیں جو کررہا ہوں وہ گناہ نہیں ہے؛ بلکہ ثواب کا کام ہے۔ جب وہ اپنے اس عمل کو گناہ ہی نہیں سمجھتا تو آگے توبہ کرنے اور معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بدعت کی نحوست یہی ہے کہ جو آدمی بدعت کرتا ہے وہ دین سمجھ کر کرتا ہے، اس لئے اس کو بدترین گناہ کہا گیا ہے۔ دونوں میں یہی فرق ہے۔ اسی لئے دوسرے گناہوں میں توبہ کی توفیق ہوتی ہے اور بدعت میں توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، اِلّا یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے ہدایت مقدر ہو تو پھر توفیق ہوجاتی ہے۔

شیطان کو بدعت کی کیوں سوجھی؟

شیطان نے بدعت اسی لئے تو رائج کی ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ شیطان نے انسانوں سے گناہ کے کام کرائے، اور اللہ تعالیٰ نے توبہ بھی رکھی ہے، انسانوں نے گناہ

کے کام کر کے توبہ کر لی، تو اس کی ساری محنت کے اوپر پانی پھر گیا۔ اب وہ رونے بیٹھ گیا کہ یہ کیا ہوا؟ مَیں دن بھر محنت کر کے ان کو گناہ میں مبتلا کروں، یہ دن بھر گناہ کرنے کے بعد رات کو سونے سے پہلے توبہ کر کے اپنے کو پاک صاف کر کے سو جاتے ہیں۔ لہٰذا میری تو ساری محنت کے اوپر پانی پھیر دیا، میرا تو ستیاناس ہوگیا۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہیے کہ جس سے یہ توبہ ہی نہ کریں۔ پھر اس نے بدعت ایجاد کروائی تا کہ جب اس کو گناہ ہی نہیں سمجھیں گے، بلکہ دین سمجھ کر کریں گے؛ تو کبھی توبہ نہیں کریں گے (الترغیب والترہیب، ۸۹) اسی لئے بدترین چیز بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

نبی کریم ﷺ کو اہلِ ایمان سے کتنا تعلق ہے؟

پھر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿اَنَا اَوْلیٰ بِکل مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِه﴾ مَیں ہر مؤمن کی جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوں۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ مَیں ہر مؤمن کے حق میں اس کی خیر خواہی اور بھلائی اس کی ذات سے بھی زیادہ سوچتا ہوں۔ ہم اپنی بھلائی اپنے حق میں اتنی نہیں سوچ سکتے جتنی نبی کریم ﷺ نے ہمارے حق میں سوچی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک نادان بچہ ہو جو اپنی بھلائی اپنے حق میں اتنی نہیں سوچتا جتنی اس کے ماں باپ اس کے حق میں سوچتے ہیں، وہ نادان تو آگ کو بھی چمکتی چیز سمجھ کر پکڑنے کی کوشش کرتا ہے، ماں باپ جلدی سے ہاتھ مار کر اس کو وہاں سے دور ہٹاتے ہیں، اور وہ یوں سمجھتا ہے کہ یہ میرا نقصان کر رہے ہیں، میری بدخواہی کر رہے ہیں، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ یہ بدخواہی نہیں بلکہ عین خیر خواہی کر رہے ہیں، اگر اس کو اس طرح نہ ہٹایا جائے گا تو یہ آگ اس کے لئے ہلاکت کا ذریعہ بن جائے گی۔ تو نبی کریم ﷺ بھی ہر مؤمن کی جتنی خیر خواہی کرتے ہیں؛ وہ

مؤمن خود بھی اپنی نہیں کرتا۔ اس لئے آدمی کو چاہیے کہ حضور اکرم ﷺ کی باتوں ہی کو اپنے لئے رہنما اور مشعلِ راہ بنائے۔

﴿امت پر آپ ﷺ کی شفقت کا ایک نمونہ﴾

پھر آگے فرماتے ہیں کہ دیکھو! مَیں جو تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، بلکہ ﴿مَنْ تَرَکَ مَالاً فَلِأَهْلِهِ﴾ کسی کا اگر انتقال ہو جائے اور مال چھوڑ کر کے مرے، تو اس کا مال اس کے وارثوں کا ہے ﴿وَمَنْ تَرَکَ دَيْنًا اَوْ ضِيَاعًا فَاِلَيَّ وَعَلَيَّ﴾ اور اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور اس نے کوئی قرضہ چھوڑا، یا چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے کہ اگر ان کی خبر نہ لی گئی تو وہ ضائع برباد اور ہلاک ہو جائیں گے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا دَین میرے اوپر ہے اور ان بچوں کو میرے پاس لاؤ؛ مَیں ان کو سنبھالوں گا۔ گویا آپ ﷺ دین ہی کی نہیں؛ دنیا کی بھی خیر خواہی سوچتے ہیں۔

﴿مقروض کی نمازِ جنازہ﴾

چنانچہ ابتداءِ اسلام میں جب کہ ابھی فتوحات کی وجہ سے مالِ غنیمت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا تو آپ ﷺ کا معمولِ مبارک یہی تھا کہ اگر کوئی میت لائی جاتی تو آپ سوال فرماتے تھے کہ اس پر کسی کا کوئی قرضہ ہے؟ اگر لوگ کہتے کہ ہاں! ہے، تو آپ ﷺ سوال فرماتے کہ اس نے قرضہ کو ادا کرنے کے لئے کچھ رقم چھوڑی ہے؟ اگر لوگ کہتے کہ ہاں! چھوڑی ہے تب تو آپ نمازِ جنازہ ادا فرماتے تھے۔ اور اگر کہا جاتا کہ نہیں چھوڑی ہے، تو حضور صحابہ کو فرما دیتے تھے کہ تم اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ جس آدمی نے قرضہ چھوڑا ہو، اور قرضہ کی ادائیگی کے لئے رقم نہیں چھوڑی یا کوئی سامان زمین وغیرہ نہیں چھوڑی تو حضور ﷺ

اس کی نمازِ جنازہ اس وقت نہیں پڑھتے۔ صحابہ میں سے کسی کو خیال ہوتا کہ یہ بے چارہ حضور کی دعا سے محروم جا رہا ہے؛ تو وہ ذمہ داری لے لیتا کہ یا رسول اللہ! مَیں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں؛ تو پھر آپ نمازِ جنازہ پڑھاتے۔ یہ تو شروع میں تھا۔

بعد میں جب فتوحات ہوئیں تو پھر اس کے دَیْن کی ذمہ داری خود حضور ﷺ لیتے تھے کہ اس نے دَیْن چھوڑا ہے؟ کہا جاتا کہ ہاں! چھوڑا ہے۔ مال ہے؟ ہاں! ہے، تب تو ٹھیک ہے، اس کے مال میں سے ادا کر دو۔ اور اگر دَیْن نہیں ہے تو مال ورثاء کو دے دو۔ اور اگر دَیْن چھوڑا ہے اور مال نہیں ہے تو حضور ﷺ فرماتے: لاؤ! مَیں اسے ادا کروں گا۔ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے ہیں اور کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں ہے، ان کے گذران کے لئے کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے؛ تو حضور ان کی ذمہ داری لے رہے ہیں۔ یہ حضورِ اکرم ﷺ کی کمالِ شفقت اور کمالِ رحمت ہے کہ آپ اپنے اُمتیوں کے ساتھ جہاں دینی طور پر رحمت و شفقت کا معاملہ فرماتے تھے اور خیر خواہی کرتے تھے؛ وہیں دنیوی طور پر بھی اس مرنے والے کے دَیْن کی ادائیگی اور اس کے ایسے بچوں کی نگرانی اپنے سر لے لیا کرتے تھے جن کی کوئی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ھمیں نبی کریم ﷺ کی سنتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے

--- آمین ---

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً

﴿کسی نیک یا برے عمل کی بنیاد ڈالنا﴾

۱۵؍شعبان ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۶؍دسمبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد.

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے ”مَنْ سَنَّ سُنَّةًحَسَنَةًأَوْسَيِّئَةً“ کوئی آدمی اچھا طریقہ جاری کرے تو اس کے لئے کیا ثواب ہے اور کوئی آدمی بری رسم جاری کرے تو اس کے لئے کیا عذاب ہے؛ وہ بتلانا چاہتے ہیں۔ یعنی کسی نے کوئی ایسا طریقہ جاری کیا جس کی وجہ سے لوگ نیکی کی راہ پر لگ گئے تو اس کے اس عمل کی وجہ سے دوسروں کو جو ہدایت نصیب ہوئی اور نیکی کی راہ پر لگے؛ اس پر اس کو کیا ثواب حاصل ہوگا، اس کے مراتب بلند ہوں گے۔ اور اسی طریقہ سے کسی آدمی نے کوئی برا طریقہ جاری کیا اور اس کے اس عمل کی وجہ سے لوگ برائی میں مبتلا ہو گئے تو اس کے نتیجے میں اس آدمی پر کیا وبال پڑے گا؟ وہ بتلانا چاہتے ہیں۔

﴿ازواج واولاد آنکھوں کی ٹھنڈک﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاهَبْ لَنَامِنْ أَزْوَاجِنَاوَذُرِّيّٰتِنَاقُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَالِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ اس سے پہلے جو آیتیں ہیں ان میں اہل ایمان کے کچھ اوصاف اور خوبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، انہیں خوبیوں اور اوصاف میں سے ایک خوبی اور عمدہ وصف یہ بتلایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار!

ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما اور ہم کو نکوکاروں کا رہنما بنا۔ یہاں آنکھوں کی ٹھنڈک کا مطلب یہ ہے کہ تو ہماری بیویوں اور اولاد کو اپنی اطاعت وفرمانبرداری کی توفیق عطا فرما، تاکہ ان کو اطاعت وفرمانبرداری کی راہ پر لگا ہوا دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اس لئے کہ کسی آدمی کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد اور گھر والوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار دیکھے۔ بخاری شریف کے اندر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی یہی تفسیر منقول ہے۔

(بخاری شریف، کتاب التفسیر، سورۃ الفرقان، حدیث ۶۰۷۴)

آیت کی تفسیر اور عنوان سے مناسبت

ظاہر ہے کہ جب اپنی اولاد کے لئے اور اپنی بیویوں کے واسطے ہدایت مانگ رہے ہیں اور یہ طلب کر رہے ہیں کہ اے اللہ! ان کو اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کی توفیق عطا فرما، تو اس دعا کے ذریعہ سے وہ ان کے واسطے راہِ راست پر لگنے کا ذریعہ بنے۔ اور پھر جب دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی اس بات کی کوشش ضرور کریں گے کہ یہ بیوی اور اولاد راہِ راست کے اوپر لگ جائیں۔ ایک آدمی جب اپنے کسی کام اور مقصد کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دُعا کا اہتمام کرتا ہے، مثلاً تجارت میں برکت وترقی کے لئے دُعا کرتا ہے تو جہاں اس کے لئے دُعا کرے گا؛ وہاں اس کے لئے عملی طور پر کوشش بھی کرے گا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ صرف دُعاؤں پر اکتفاء کرے۔ اگر وہ چیز ایسی ہے جو دُعا کے ساتھ ساتھ عملی کوشش کی بھی طلب گار ہے؛ تو جہاں یہ دُعا کا اہتمام کرے گا وہاں عملی سعی بھی کرے گا۔

اگر کسی کا بیٹا بیمار ہے تو اگر وہ اس کی تندرستی کے واسطے جہاں دُعا کرتا ہے وہاں اس

کے علاج ومعالجہ کا بھی اہتمام کرے گا۔ جب یہ اہلِ ایمان اپنی اولاد اور بیویوں کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں ان کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما یعنی ان کو تو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا، نیکی کی راہ پر چلنے والا اور برائی سے بچنے والا بنا۔ تو جہاں وہ دُعا کریں گے وہاں ان کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ بھی کریں گے؛ تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے بن جائیں۔ گویا وہ اس صورت میں اپنے بعد آنے والی نسلوں کی ہدایت کا اور ان کے راہِ راست پر لگنے کا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے اندر ان کے مشغول ہونے کا ذریعہ بنیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ان کے لئے ہدایت اور راہِ راست پر لگنے کا ذریعہ بنے؛ تو عمل کرنے والوں کو جو ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گا، ان کو بھی ضرور حصہ ملے گا۔ گویا انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ کر کے ایک اچھا طریقہ جاری کیا، ان کو راہِ راست پر لگانے کی کوشش کی۔

﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ اور یہ بھی دُعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم کو نکوکاروں کا سردار بنا۔ یعنی جب ان کی بیویاں اور اولاد اللہ تعالیٰ کی مطیع وفرمانبردار بنیں گی تو ظاہر ہے یہ اہلِ ایمان اپنے گھر والوں کے اور اپنی اولاد کے سرپرست تو ہیں ہی، وہ لوگ ان کی ماتحتی میں ہیں، تو جب وہ نکوکار بنیں گے تو یہ ان نکوکاروں کے سردار بنیں گے۔

باری تعالیٰ کا دوسرا ارشاد نقل کیا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا﴾ ہم نے ان لوگوں کو رہنما اور سردار بنایا تا کہ وہ لوگوں کو ہمارے حکم سے راہِ راست دکھلائیں۔ گویا دوسرے لوگوں کے لئے راہِ راست کا دکھلانا اور ان کو ہدایت کی راہ پر لگانا؛ یہ ایک اچھا طریقہ ہے جو وہ جاری کر رہے ہیں۔

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات

عن أبی عمرو جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنَّا فِی صَدْرِ النَّهَارِ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَجَآءَهُ قَوْمٌ عُرَاةٌ مُجْتَابِی النِّمَارِ أَوِ الْعَبَآءِ، مُتَقَلِّدِی السُّیُوْفِ، عَامَّتُهُمْ مِنْ مُضَرَ، بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ؛ فَتَمَعَّرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لِمَا رَأٰی بِهِمْ مِنَ الْفَاقَةِ، فَدَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ، فَأَمَرَ بِلَالًا فَأَذَّنَ وَأَقَامَ. فَصَلّٰی. ثُمَّ خَطَبَ. فَقَالَ: ﴿یٰأَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ الی اٰخر الاٰیة إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا﴾ والاٰیةُ الْأُخْرٰی الَّتِیْ فِیْ اٰخِرِ الْحَشْرِ ﴿یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِّنْ دِیْنَارِهٖ، مِنْ دِرْهَمِهٖ، مِنْ ثَوْبِهٖ، مِنْ صَاعِ بُرِّهٖ، مِنْ صَاعِ تَمْرِهٖ حَتّٰی قَالَ: ((وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ))، فَجَآءَ رَجُلٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ بِصُرَّةٍ كَادَتْ كَفُّهٗ تَعْجِزُ عَنْهَا، بَلْ قَدْ عَجَزَتْ. ثُمَّ تَتَابَعَ النَّاسُ حَتّٰی رَأَیْتُ كَوْمَیْنِ مِنْ طَعَامٍ وَثِیَابٍ، حَتّٰی رَأَیْتُ وَجْهَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ یَتَهَلَّلُ كَأَنَّهٗ مُذْهَبَةٌ؛ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ سَنَّ فِی الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَیْرِ أَنْ یَّنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَیْءٌ. وَمَنْ سَنَّ فِی الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَیِّئَةً كَانَ عَلَیْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَیْرِ أَنْ یَّنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَیْءٌ)) (رواہ مسلم)

حضرت ابوعمرو جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، قبیلہ بنو بجیلہ سے ان کا تعلق ہے یہ یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ ۱۰ھ کے اندر یہ لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ صحابی بڑے حسین و جمیل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے متعلق فرماتے تھے: ﴿یُوْسُفُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ﴾ اپنے حسن و جمال میں اس امت کے یوسف ہیں۔ ان کے حالات کے اندر لکھا ہے کہ قد و قامت کے اعتبار سے بھی بڑے طویل تھے، اونٹ کی کوہان جتنے اونچے تھے، اور ان کا جوتا ایک ہاتھ جتنا ہوتا تھا۔

یمن کے اندر ایک بت تھا، نبی کریم ﷺ نے ان کو اس کو ختم کرنے کے واسطے کچھ صحابہ کو ان کی ماتحتی میں کر کے خصوصی مہم کے اوپر بھیجا تھا اور ان کو دُعا دی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو ہدایت دے، جس وقت ان کو بھیجا جا رہا تھا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا تھا: ﴿اِنِّی لاَ أَثْبُتُ عَلیٰ الْخَیْلِ﴾ نبی کریم ﷺ نے ان کے سینے کے اوپر ہاتھ مارا اور دُعا فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کبھی گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد گرنے کی نوبت نہیں آئی۔

﴿قابلِ تقلید طرزِ عمل﴾

نبی کریم ﷺ نے ان سے بیعت میں ایک شرط یہ بھی لی تھی: ﴿وَالنُّصْحُ لِکُلِّ مُسْلِمٍ﴾ ہر مسلمان کی بھلائی اور خیر خواہی کا اہتمام کریں گے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر کئے گئے اس عہد و پیمان کا وہ اتنا زیادہ لحاظ کرتے تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک آدمی کو گھوڑا خریدنے کے لئے وکیل بنایا، اس آدمی نے گھوڑے کے مالک کے ساتھ تین سو درہم کے اندر سودا طے کیا اور گھوڑا لے آیا اور مالک کو بھی ساتھ لایا کہ ان کو تین سو درہم چکا دیئے جائیں۔ انہوں نے دیکھا کہ گھوڑا تین سو درہم سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے تو انہوں نے گھوڑے کے مالک سے کہا: تمہارا گھوڑا چار سو درہم کا معلوم ہوتا ہے، چار سو میں دو گے؟ ظاہر ہے جو تین سو میں دے چکا ہو؛ وہ چار سو میں کیوں نہیں دے گا؟ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ پھر ان کو خیال ہوا کہ اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے تو پھر اس سے کہا: چار سو کا نہیں بلکہ پانچ سو کا معلوم ہوتا ہے، پانچ سو میں دینے کے لئے تیار ہو؟ اس نے اس پر بھی رضامندی کا اظہار کیا یہاں تک کہ آٹھ سو درہم اس کو ادا کئے۔ حالانکہ جس آدمی کو گھوڑا خریدنے کے لئے وکیل بنایا

تھا اس نے تو مالک کے ساتھ تین سو میں سودا طے کر لیا تھا اور مالک نے برضا ورغبت اور خوشدلی کے ساتھ اپنا گھوڑا فروخت بھی کر دیا تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر جو عہدو پیمان کیا تھا کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی اور بھلائی چاہیں گے، اس کا اتنا لحاظ تھا کہ اس کے سامنے ان دراہم کی اور دنیوی دولت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ چاہے ہمارے وکیل نے اس کے ساتھ تین سو درہم میں معاملہ کیا ہو لیکن جب مَیں یہ سمجھ رہا ہوں کہ اس کی یہ چیز اس سے زیادہ قیمت کی ہے تو اس کی خیر خواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے مال کے مطابق مجھے قیمت ادا کرنی چاہیے، اس لئے تین سو کے بجائے آٹھ سو درہم ادا کیئے۔

کچھ مفلس حضرات خدمتِ نبوی میں

انہیں صحابی سے یہ روایت منقول ہے کہ ہم دن کے شروع حصہ میں یعنی اشراق کے بعد چاشت سے پہلے نبی کریم ﷺ کی مجلس مبارک میں آپ سے فیض حاصل کرنے کے لئے اور آپ کے ارشادات سننے کے لئے آپ کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوئے کہ وہ سیاہ وسفید دھاریوں والی چادروں کو کاٹ کر اپنے گلے کے اندر پہنے ہوئے تھے۔ ''نِمَارٌ'' ''نَمِرَۃٌ'' کی جمع ہے۔ سیاہ اور سفید لکیر اور دھاری والی چت کبری چادر اور کملی کو ''نَـمِرَۃٌ'' کہا جاتا ہے۔ ﴿مُجْتَابٌ﴾ کا معنیٰ کسی چیز کو کاٹ کر اپنے گلے میں ڈالنا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس چادر بھی اتنی بڑی نہیں تھی کہ وہ اس کو اپنے جسم کے اوپر لپیٹ پاتے، اس لئے اس چادر کے بیچ میں سے سوراخ کر کے اس میں سے سر کو داخل کر کے چاروں طرف سے اس کو پہن رکھا تھا، اور جوں توں بڑی مشکل سے اپنے ستر کو چھپائے ہوئے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ تلواریں لٹکائے ہوئے

تھے۔اس زمانہ میں عام طور پر یہی معمول تھا کہ ہر آدمی اپنے ساتھ تلوار رکھا ہی کرتا تھا جیسے دیہاتوں میں دیکھا ہوگا کہ عام طور پر ہر آدمی کے ہاتھ میں لاٹھی ہوا کرتی ہے۔ یہ ویسے بھی بڑی مفید چیز ہے۔اور ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق قبیلۂ مضر یعنی قریش سے تھا بلکہ سب ہی قبیلۂ مضر سے تعلق رکھنے والے تھے۔ان کی ظاہری حالت کو دیکھ کر یہ پتہ چل رہا تھا کہ وہ بڑی شدید محتاجی کے حالت میں مبتلا ہیں، بڑی شدید احتیاج کا شکار ہیں۔ان کی یہ حالت دیکھ کر نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا۔اور بدلا بایں معنیٰ کہ ان کے اس شدید احتیاج کے باوجود کسی اہلِ وسعت و اہلِ ثروت نے ان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

محتاج کی حاجت روائی فرض کفایہ ہے

اس لئے کہ معاشرے اور سماج کے اندر کوئی شخص محتاج اور ضرورت مند ہے تو اس سماج میں جو لوگ اہلِ ثروت اور اہلِ وسعت ہیں ان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف توجہ کریں۔ چنانچہ اگر کوئی آدمی بھوکا ہے اور بھوک کی وجہ سے وہ بالکل قریب المرگ اور ہلاکت کے قریب ہے تو اس صورت میں فرضِ کفایہ کے طور پر پورے سماج کی ذمہ داری ہے کہ اس کی بھوک کو دور کر کے اس کو ہلاکت سے بچائیں، اگر کسی ایک نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی، یہاں تک کہ وہ بھوک کی وجہ سے مر گیا تو پورا سماج گنہگار ہوگا۔اسی کو فرضِ کفایہ کہتے ہیں۔فرضِ کفایہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کام ہونا چاہیے، چاہے سب مل کر کریں یا کوئی ایک آدمی کرے۔اگر کسی نے بھی نہیں کیا تو سب گنہگار ہوں گے اور اگر کسی ایک نے بھی کر لیا یا سب نے کیا تو سب کی ذمہ داری پوری ہو جائے گی۔

نفس احتیاج کوئی بری چیز نہیں ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے اپنے لئے مسکنت کو پسند فرمایا تھا لیکن ان کی اس شدتِ احتیاج کی جو کیفیت تھی اس سے آپ نے اندازہ لگایا کہ ان کی اس شدتِ احتیاج کے باوجود ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے، اس وجہ سے نبی کریم ﷺ کو ناگواری ہوئی۔ اور اس ناگواری کا ظہور نبی کریم ﷺ کے چہرۂ اقدس کے اوپر نمودار ہوا کہ آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

آپ ﷺ نے تعاون کی اپیل کی

راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے گھر میں تشریف لے گئے اور پھر باہر آئے۔ ممکن ہے کہ گھر میں اس لئے گئے ہوں کہ گھر میں کوئی چیز ایسی موجود ہو جس سے ان کی ضرورت پوری ہو جائے۔ بہر حال! جب واپس باہر تشریف لائے تو دن کا شروع حصہ تھا جیسا کہ اوپر بتلایا کہ چاشت کا وقت تھا، اس درمیان ظہر کا وقت آ ہی گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا۔ چنانچہ ظہر کے شروع وقت ہی میں انہوں نے اذان بھی دی اور جب لوگ آ گئے تو اقامت ہوئی۔ جب اذان و اقامت کا تذکرہ ہے تو نفل نماز تو مراد ہو نہیں سکتی، لامحالہ فرض نماز مراد ہے، اور وہ ظہر کی نماز تھی جو آپ نے لوگوں کو پڑھائی۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں میں ایک تقریر فرمائی اور خطبہ دیا، گویا لوگوں کو ان آنے والوں کی ضرورت کو پورا کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ آپ نے اس خطبہ اور تقریر میں ایک تو وہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی جو سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے۔ جس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو عمومی خطاب کے ذریعہ سے کہا گیا ہے کہ اے لوگو! ڈرو اپنے اس پروردگار سے جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ یعنی حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا

اور انہیں کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔ اور انہیں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے بہت سارے مرد اور عورتوں کو پیدا کر کے روئے زمین کے اوپر پھیلا دیا۔ اور تم ڈرو اس اللہ سے جس کا تم واسطہ دیا کرتے ہو یعنی آپس میں جب ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے اور اپنا کام نکلوانا ہوتا ہے تو تم اللہ کے نام کو استعمال کرتے ہو۔ لوگوں کو اللہ کا واسطہ دے کر اپنا کام نکلواتے ہو۔ تو جس اللہ کا واسطہ دے کر اور جس کا نام استعمال کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہو، اس اللہ سے ڈرو اور اس کے احکام کا خیال رکھو۔ اور آپس کی جو رشتہ داریاں ہیں ان کا بھی خیال رکھو، اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔

آپ ﷺ کا اس آیت کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ جو اس وقت آئے ہوئے ہیں اور شدید حاجت کے اندر مبتلا ہیں، وہ بھی تو تمہارے بھائی ہیں، بایں معنیٰ کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، تو ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اگرچہ اب یہ اخوت دور کی سہی، لیکن اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی ضرورتوں کی طرف توجہ کرو۔

اور دوسری آیت تلاوت فرمائی جو سورۂ حشر کے آخیر میں ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر آدمی دیکھ لے کہ وہ آئندہ کل کے واسطے کیا بھیج رہا ہے۔ یعنی دنیا میں رہ کر ہی آدمی کو یہ بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ میں اپنی دنیا کی زندگی میں آخرت کی زندگی کے واسطے کیا تیاری کر رہا ہوں اور آخرت کے واسطے کیا بھیج رہا ہوں۔ ہر آدمی کو اس کی طرف خصوصی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو دنیا کی زندگی عطا ہی اس لئے فرمائی ہے کہ وہ یہاں آ کر آخرت کی تیاری کرے۔ دنیا کی زندگی خود مقصود نہیں ہے۔

﴿ایک مثال﴾

جیسے ایک آدمی ہے جس کو حج کا سفر درپیش ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہاں مجھے خرچ کی ضرورت پڑے گی۔ اور یہاں حکومت مجھے کرنسی کے طور پر جو رقم دے رہی ہے وہ میرے لئے کافی نہیں ہے، تو وہ جانے سے پہلے ہی اس کا انتظام کرتا ہے۔ تاکہ وہاں جانے کے بعد اس کے مصارف میں کسی قسم کی کوئی تنگی نہ ہو۔ جب دنیا کے اندر ایسا ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک جانا ہوتا ہے تو اس سفر کے لئے آدمی پہلے ہی سے تیاری کرتا ہے اور اس کے مصارف اور وہاں ہونے والے خرچ کا وہ اپنے طور پر انتظام کرتا ہے، اسی طرح جب دنیا سے آخرت کے سفر پر جانا ہے اور وہاں ہمیشہ رہنا ہے تو وہاں پر بھی جو چیز کام آنے والی ہے اس کے واسطے دنیا میں رہتے ہوئے آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ تمنا و توقع رکھنا اور یہ اُمید کرنا کہ میرے مرجانے کے بعد میرے بعد والے کچھ کرلیں گے:-

ع ایں خیال است و محال است و جنوں

جب آپ خود اپنے لئے اپنی تیاری کے طور پر کچھ کرنے کے روادار نہیں ہیں، اور اس کی طرف جب کچھ توجہ نہیں کررہے ہیں؛ تو پھر دوسروں سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟

﴿بعد والوں کے بھروسے پر نہ رہو﴾

مَیں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ ایک باپ کا انتقال ہوا اور بیٹے کے واسطے دس لاکھ روپے چھوڑ کر مرا۔ اب اسی بیٹے سے اگر کہا جائے کہ کسی جگہ مسجد یا مدرسہ بن رہا ہے یا کوئی نیکی کا کام ہو رہا ہے اور ذمہ دار اس سے کہیں کہ تمہارے ابا کا انتقال ہوگیا، ان کے ایصالِ ثواب کے لئے دس ہزار روپے دے دو۔ تو جواب میں وہ کہے گا کہ دس ہزار روپے مانگتے ہو؟

بہت بڑی رقم ہے۔ حالانکہ دس ہزار اس کو اپنی کمائی میں سے نہیں دینا ہے۔ اس کا باپ دس لاکھ کما کر اس کے واسطے چھوڑ گیا ہے؛ اسی میں سے دینا ہے۔ تو جو باپ کی کمائی ہے، اس میں سے بھی وہ دینے کے لئے روادار نہیں ہے؛ تو پھر اپنی کمائی میں سے وہ کیا اور کتنا دے گا؟ اس سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟ بہر حال! اگر اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی ہے اور وہ کچھ کر رہے ہیں تو اس آدمی کے لئے سعادت اور خوش بختی کی بات ہے۔ لیکن آدمی کو اپنے طور پر اپنے لئے کوشش کر لینا چاہیے۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے اس آیت کو پیش فرما کر لوگوں کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی طرف متوجہ کیا کہ لوگو! خرچ کرو، یہ جو کچھ بھی خرچ کرو گے؛ وہ سب تم آگے بھیج رہے ہو۔

﴿دوسرے کے مال سے محبت﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: کہ تم میں سے کون ہے جس کو دوسرے کا مال اپنے مال کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے؟ صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایسا تو کون ہوگا؟ ہر ایک کو اپنا مال محبوب ہوتا ہے، دوسرے کا نہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنا تو وہی ہے جو تم اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے آگے بھیج چکے ہو، اور مرتے وقت جو اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ گے، وہ تمہارا نہیں ہے، وہ تو دوسروں کا ہے۔ (بخاری شریف، کتاب الرقاق، حدیث ۶۴۴۲)

اور عام طور پر آدمی اس کو اپنا سمجھ کر اس سے محبت کرتا رہتا ہے، اسی کی طرف حضور ﷺ نے متوجہ کیا: ﴿وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ ہر آدمی دیکھ لے کہ کل کے واسطے یعنی آخرت کے واسطے اس نے کیا بھیجا۔ گویا اس آیت کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ صحابۂ کرام کو خرچ کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

﴿جس میں جتنی طاقت ہو......﴾

﴿تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِّنْ دِيْنَارِهٖ، مِنْ دِرْهَمِهٖ، مِنْ ثَوْبِهٖ﴾ یہاں ”تَصَدَّقَ“ ماضی کا صیغہ ہے، لیکن شراح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد امر ہے ﴿لِيَتَصَدَّقَ رَجُلٌ﴾ نبی کریم ﷺ چونکہ تقریر فرما رہے ہیں اور صحابہ کرام کو خرچ کرنے کے لئے ترغیب دے رہے ہیں تو آپ فرما رہے ہیں کہ دیکھو! ہر آدمی دینار میں سے، درہم میں سے، کپڑے میں سے، گیہوں کے صاع میں سے اور کھجور کے صاع میں سے خرچ کرے، یہاں تک کہ کوئی آدمی اگر آدھی کھجور بھی اللہ کے راستہ میں خرچ کرے گا تو وہ اس کے لئے کارآمد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کی جو حیثیت ہو، ہر ایک کو اسی حیثیت کے مطابق نبی کریم ﷺ تلقین فرما رہے ہیں اور متوجہ فرما رہے ہیں۔ کسی میں اگر دینار خرچ کرنے کی طاقت ہے تو وہ خرچ کرے۔ دینار سونے کا سکہ ہوا کرتا تھا۔ کسی میں اگر درہم خرچ کرنے کی طاقت ہے تو وہ اس کو خرچ کرے۔ درہم چاندی کا سکہ ہوتا تھا جو دینار سے کچھ کم ہوتا تھا۔

بعض مرتبہ لوگ سوچتے ہیں کہ ہمارے پاس خرچ کرنے کے لئے روپے پیسے تو ہیں نہیں۔ تو فرمایا کہ روپے ہونے ضروری نہیں ہیں، اگر آپ کے پاس سامان اور کپڑا ہے تو اس کو بھی اللہ کے راستہ میں دے سکتے ہو۔ اور کپڑا نہیں ہے بلکہ غلہ ہے۔ جیسے زراعت پیشہ آدمی ہے، کسان ہے، اس کے پاس تو عموماً نقد پیسہ ہوتا نہیں، لیکن گھر میں غلہ موجود ہوتا ہے، تو گیہوں کھجور جو بھی ہو؛ اس کو صدقہ کے طور پر خرچ کرے۔

یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ﴾ آدھی کھجور بھی ہو تو اس کو بھی اللہ کے راستہ میں دینے میں کوئی باک اور عار محسوس نہ کرے، یہ نہ سوچے کہ آدھی کھجور

کیا دوں۔اس لئے کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ ''ذرّہ'' کس کو کہتے ہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ کھڑکی کے سوراخ میں سے سورج کی روشنی مکان کے اندر آرہی ہو، اس روشنی میں اُڑتے ہوئے جو اجزاء نظر آتے ہیں؛ ان میں سے ایک کو ذرّہ کہتے ہیں۔اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ پیلے رنگ کی چھوٹی چیونٹی ہوتی ہے اس کو ذرّہ کہتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی اتنی بھی نیکی کرے گا تو اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں پائے گا اور اس کا ثواب اس کو ملے گا۔نیکی کے کام میں آدمی کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنی چھوٹی سی نیکی کیا کروں؟

﴿ذرّہ اور ٹکڑا﴾

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرتبہ ایک سائل آیا اور سوال کیا۔ان کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا تھا جو انہوں نے اس کو دے دیا۔بعض سائل ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو لینے میں تأمل کرتے ہیں، تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ارے! تو اس کو قبول کرنے میں تأمل کر رہا ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو یہ قانون ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ ایک ذرّہ کے برابر نیکی کا بھی بدلہ ملے گا۔اور مَیں روٹی کا اتنا بڑا ٹکڑا تجھے دے رہا ہوں، اور تو اس کو قبول کرنے میں تأمل کر رہا ہے۔ (تفسیر الدر المنثور۔۶/۶۴۹)

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کے پاس کھجور ہو تو وہ بھی اللہ کے راستہ میں دے۔ بہر حال! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس تقریر اور وعظ کے ذریعہ سے لوگوں کو خرچ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ظاہر ہے کہ متوجہ کرنے والے اور ترغیب دینے والے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور جن کو ترغیب دی جا رہی ہے وہ صحابہ کرام ہوں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق؛ تو پھر کیا پوچھنا۔

ایک نے پہل کی اور پھر......

راوی کہتے ہیں کہ آپ کی اس تقریر کوسن کر انصار میں سے ایک آدمی پیسوں کا توڑا یعنی تھیلی لے کر آیا اور وہ اتنی وزنی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ہاتھ اس تھیلی کو اُٹھانے سے عاجز ہے۔ یعنی قریب ہے کہ تھک جاوے، بلکہ نبی کریم ﷺ کے قریب پہنچتے پہنچتے تو یوں سمجھو کہ وہ اس تھیلی کو نیچے رکھ چکا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تھیلی اتنی وزنی تھی اور اس میں اتنے پیسے بھرے ہوئے تھے۔ اور انھوں نے وہ تھیلی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی۔ بس! سب سے پہلے لانے والے یہ صحابی تھے۔ اس کے بعد تو لوگوں کا ایک تانتا لگ گیا اور ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کو دیکھ کر دوسرے بھی گئے اور پھر جس کے پاس جو بھی تھا؛ وہ لے آیا۔ راوی کہتے ہیں کہ لوگوں نے اتنا سب لا کر دیا کہ مَیں نے کپڑوں کے اور کھانے کے دو ڈھیر دیکھے۔ اور مَیں نے نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھا کہ وہ ایسا چمک رہا ہے گویا کہ سورج کی طرح ایک دم چمکدار اور روشن ہے۔

جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا

چونکہ وہ صحابی جو سب سے پہلے تھیلی لے کر آئے تھے اور ان کو دیکھنے کے بعد لوگوں کے اندر بھی یہ جذبہ پیدا ہوا تھا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس آدمی نے اسلام کے اندر کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کو اپنے کیے کا تو ثواب ملے گا ہی، اس کے بعد اس اچھے طریقہ کے اوپر جتنے لوگ بھی عمل کریں گے؛ ان سب کا ثواب اس کو بھی ملے گا۔ لیکن اس کو ان سب کا جو ثواب ملے گا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے ثواب میں کوئی کمی آئے گی، بلکہ کرنے والوں کو ان کے عمل کرنے کا ثواب ملے گا اور اس کے لئے ذریعہ یہ بنا؛ تو سبب ہونے کی حیثیت سے اس کو بھی ثواب ملے گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ کسی بھی نیکی کے کام کی ابتداء کرنے میں آدمی کو تأمل نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جہاں مجمع ہو اور کسی عمل کے لئے لوگوں کو کہا جائے، تو جو سب سے پہلے سبقت کرے گا اور پھر اس کے نتیجہ میں دوسرے لوگوں کو یہ توفیق نصیب ہوگی تو بعد والے سب لوگوں کے اجر میں اوّل آدمی بھی شریک رہے گا، اور ان کرنے والوں کو تو ان کے عمل کا ثواب اور اجر ملے گا ہی، ان کے ثواب میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔ ایسا نہ سمجھا جائے کہ ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ آدمی کو تو اپنے عمل ہی کا ثواب ملا کرتا ہے۔ یہاں بھی جو اس کو مل رہا ہے، ایک تو اس نے خود عمل کیا اس کا ثواب ملا، اور بعد میں دوسرے لوگوں نے جو عمل کیا، یہ ان کے لئے ذریعہ بنا، لہٰذا بحیثیت ذریعہ اور سبب کے اس کو ثواب ملے گا اور ان عمل کرنے والوں کو اپنے عمل کا ثواب ملے گا۔

﴿یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے﴾

اب اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تو سبب ہوا اور پھر وہ خود عامل ہوئے، عامل اور سبب کا ثواب برابر کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ اشکال نہیں ہونا چاہیے، اس لئے کہ کسی بھی عمل پر ثواب دینا؛ یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے اختیار کی بات ہے، ثواب اللہ تعالیٰ دیتے ہیں، کوئی بھی عمل اپنی ذات کے اعتبار سے ایسا نہیں کہ اس پر ثواب ملنا ہی چاہیے، اللہ تبارک وتعالیٰ جو دے ﴿ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ اگر اللہ تعالیٰ نے ان عمل کرنے والوں کو عمل کی بنیاد پر جو ثواب دیا اور اس کو سبب ہونے کی بنیاد پر اتنا ہی ثواب دے دیا؛ تو اس میں اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئی، تو پھر کسی دوسرے کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی چیز تھی اس نے اپنے بندے کو دی، دینے والا اپنے خزانے کا مالک ہے، جس کو دینا چاہتا

ہے، جتنا دینا چاہتا ہے؛ دیتا ہے۔اب دوسروں کو اس پر کیوں اشکال ہوتا ہے؟ دوسرے کے پیٹ میں کا ہے کو درد ہوتا ہے کہ اس کو اتنا ثواب کیوں ملا؟

﴿جس نے کوئی برا طریقہ جاری کیا﴾

﴿وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً﴾ اور کسی نے کوئی برا طریقہ جاری کیا مثلاً کسی برادری میں کوئی بھی اپنے بیٹے کی شادی میں بینڈ باجا لایا ہی نہیں تھا، یہ پہلا آدمی ہے جو اپنے بیٹے کی شادی میں بینڈ باجا لایا، اس کے دیکھا دیکھی دوسروں کو بھی یہ سوجھی کہ فلاں صاحب بینڈ باجا لائے تھے تو اب ہم بھی اپنے یہاں کی شادی میں بینڈ باجا لائیں گے۔

اسی طرح آج تک کبھی کسی نے شادی میں ویڈیو کیسیٹ کیا ہی نہیں تھا، یہ صاحب پہلے ہیں جنہوں نے اپنی برادری میں یہ ہمت کی اور اپنے آپ کو یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم بڑا عمدہ کارنامہ انجام دے رہے ہیں، اس کے بعد اس کی برادری میں یہ سلسلہ چل پڑا، آج تک تو کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اب دوسرے لوگ بھی ایسا کرنے لگے۔تو جس نے یہ کام کیا اس کو تو اپنے کام کا گناہ ہوگا ہی، لیکن جتنا گناہ اُن کو ہوا، اس اول کو بھی سبب ہونے کی وجہ سے اتنا ہی گناہ ہوتا رہے گا۔

﴿معاشرہ میں برائی کی پہل کرنے والے متوجہ ہوں﴾

بہت سی برادریوں کے اندر یا بعض خاندانوں کے اندر ایسا ہوتا ہے کہ ایک برائی وہاں نہیں کی جاتی، لیکن اسی خاندان کے اندر کوئی سر پھرا ایسا ہوتا ہے جو یوں سمجھتا ہے کہ مجھے کون کہنے والا ہے؟ مَیں تو ایسا کر کے رہوں گا، اور اپنے سر کے بل بوتے پر ایسی کوئی حرکت کرتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں جو بندھ لگا ہوا تھا، برادری میں ایسا کام کرنے کے معاملہ میں

جو رکاوٹ تھی؛ وہ رکاوٹ ختم ہو جاتی ہے، اور اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی یہ غلط حرکت سوجھتی ہے۔ تو یاد رکھئے! وہ آدمی جو اپنے زعم میں یوں سمجھتا ہے اور اپنے زعم میں خوش ہے کہ مَیں نے بہت بہادری کا کام کیا ہے اور آج مجھے کہنے والا کون ہے۔ چاہے کوئی کہے یا نہ کہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کا اس کو جواب دینا ہے، اور اس کے بعد جنہوں نے یہ حرکتیں کی ہیں؛ وہاں ان سب کا گناہ بھی اس کو بھگتنا ہے۔

﴿اسلاف کی فضیلت اخلاف پر﴾

دیکھو! نیکی کے معاملہ میں بھی یہ فرمایا اور برائی کے معاملہ میں بھی یہ فرمایا۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ کے اجر وثواب کا کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ ﷺ قیامت تک آنے والی پوری اُمت کے لئے سبب اور ذریعہ بنے ہیں، اسی لئے پوری اُمت کے اعمال نبی کریم ﷺ کے عمل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور پھر آپ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے دین کی یہ امانت آپ ﷺ سے حاصل کر کے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی محنت کی، لہٰذا قیامت تک جتنی نسلوں تک یہ دین پہنچے گا؛ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ان سب کے اعمال کے ثواب میں برابر کا حصہ ملے گا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلاف کو یعنی گذرے ہوئے لوگوں کو بعد والوں پر کیا فضیلت حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ بعد والوں کے ثواب کے اندر اسلاف کا حصہ تو ہے ہی، اور اگلے والوں کے ثواب میں بعد والوں کو حصہ نہیں ہے۔ اس سے اسلاف کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

﴿ہابیل اور قابیل کا قصہ﴾

عن بن مسعود رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ قال: لَيْسَ مِنْ نَفْسٍ تُقْتَلُ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلٰى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا، لِاَنَّهُ كَانَ أَوَّلَ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میں جب کوئی آدمی ظلم کے طور پر ناحق قتل کیا جاتا ہے؛ تو اس پر جو گناہ اس قتل کرنے والے کو ہوتا ہے، اس گناہ کے اندر حضرت آدم علیہ السلام کا وہ بیٹا (جس نے سب سے پہلے دنیا کے اندر اس قتل کے سلسلے کو جاری کیا) بھی اتنا ہی گنہگار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حضرت حوا کے ساتھ جب دنیا میں اُتارا تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ انسانوں کی نسل قیامت تک کے لئے دنیا میں چلے اور روئے زمین پر پھیلے۔ حالانکہ حضرت حوا کو حضرت آدم ہی کی پسلی سے پیدا کیا گیا لیکن ان کو حضرت آدم کی زوجہ اور بیوی بنایا گیا، پھر حضرت آدم اور حضرت حوا کے آپس کے ملاپ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر یہ نظام بنایا تھا کہ ہر مرتبہ کے حمل سے دو بچے پیدا ہوتے تھے، ان میں سے ایک لڑکا ہوتا اور ایک لڑکی ہوتی۔ ایک مرتبہ کے حمل سے پیدا ہونے والا لڑکا اور لڑکی تو آپس میں نکاح نہیں کر سکتے تھے، لیکن دوسری مرتبہ کے حمل سے جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے، تو پہلے کے لڑکے اور دوسرے کی لڑکی کا نکاح کیا جا سکتا تھا اور پہلے کی لڑکی اور دوسرے کے لڑکے کا نکاح کیا جا سکتا تھا۔ جیسا آج کل دودھ کی رشتہ داریاں ہوتی ہیں۔ ویسے بھائی بہن تو نکاح نہیں کر سکتے، لیکن چچازاد بھائی بہن ہوں تو ان کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے، اسی طرح وہاں حمل کے بدل جانے کی وجہ سے اس زمانہ کے اعتبار سے ضرورت کے پیشِ نظر اس کو دودھ ہی کی رشتہ داری کا حکم دیا گیا تھا۔ تو حضرت آدم کو حضرت حوا سے ایک بطن سے جو دو بچے پیدا ہوئے تھے ان میں سے لڑکے کا نام قابیل تھا اور اس کے ساتھ اس کی بہن تھی، دوسرے پیٹ سے جو پیدا ہوئے اس لڑکے کا نام ہابیل تھا اور اس کے ساتھ اس کی ایک بہن تھی۔ لہٰذا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دئے گئے اس حکم کے مطابق مسئلہ یہ تھا کہ قابیل کی بہن کا نکاح ہابیل کے ساتھ اور ہابیل کی بہن کا نکاح قابیل کے ساتھ کیا جائے۔ اب قابیل کی بہن حسین تھی اور ہابیل کی بہن اتنی زیادہ حسین نہیں تھی، لہٰذا قابیل یہ چاہتا تھا کہ ہابیل کے نکاح میں وہ نہ دی جائے اور اسی بنیاد پر اس نے اس سے اختلاف کیا، اور جب وہ کامیاب نہیں ہوا تو اس نے اپنا مقصد پورا کرنے کے واسطے ہابیل کا قتل کر دیا۔ یہ سب سے پہلا ناحق، ظالمانہ بلاقصور قتل ہے جو دنیا کے اندر وجود میں آیا۔ روئے زمین پر بلاوجہ اور ناحق قتل کا طریقہ جاری کرنے والا حضرت آدم علیہ السلام کا بیٹا قابیل ہے جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا۔

تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ غلط طریقہ اس کے ہاتھوں جاری ہوا، لہٰذا اب قیامت تک جتنے بھی ناحق قتل دنیا کے اندر ہوں گے، ان ناحق قتل کرنے والے ہر قاتل کو اپنے مقتول کو قتل کرنے کا گناہ تو ہوگا ہی، لیکن اتنا ہی گناہ قابیل کو بھی ہوگا۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حضرت آدم کا وہ پہلا بیٹا جس نے قتل کو دنیا میں جاری کیا، اس پر اس قتل کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ ﴿لِاَنَّہٗ کَانَ اَوَّلَ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ﴾ اس لئے کہ دنیا کے اندر قتل کی اس برائی اور جرم کو شروع کرنے والا وہی قابیل ہے۔

بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ آدمی کو یہ فکر کرنی چاہیے کہ وہ لوگوں کے لئے برائی کا ذریعہ نہ بنے، بلکہ بھلائی کا ذریعہ بنے۔ اس کا خاص اہتمام ہو۔ اور اگر اتنی طاقت نہیں ہے کہ بھلائی کا ذریعہ بنے تو کم سے کم اتنی کوشش تو آدمی کرے ہی کہ وہ برائی کا ذریعہ بننے سے اپنے آپ کو بچالے۔ ”طاقتِ نیکی نہ داری بد مکن“

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

اَلدَّلَالَةُ عَلٰی خَیْرٍ وَالدُّعَآءُ اِلٰی ھُدیً أَوْ ضَلَالَةٍ

﴿بھلائی کی طرف رہنمائی﴾

﴾ اقتباس ﴿

بھلائی اور نیکی کے راستہ کی طرف لوگوں کو دعوت دینا؛ ایک ایسا کام ہے جس کیلئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود نبی کریم ﷺ کو حکم دیا اور اس کا آپ کو بھی پابند بنایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کے لئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہو؛ تو ظاہر ہے کہ وہ کام آپ کی امت کو بھی کرنا ہی ہے

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی ایک اچھی بات کے لئے لوگوں کو دعوت دے رہا ہے، لیکن اس کے لئے جو انداز اور طریقہ کار اختیار کرتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے بجائے اس کے کہ لوگ اس چیز کی طرف آویں؛ اس سے دور بھاگتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف جو دعوت دینے والا ہے اس کو اس بات کی بھی تاکید کی گئی کہ دعوت کے لئے جو طریقہ اور انداز اختیار کیا جائے وہ بھی ایسا ہونا چاہیے جو سوجھ بوجھ اور دانائی پر مبنی ہو

اور جس آدمی کو بلایا جارہا ہے اس کی ذہنیت اور اس کے خیالات اور ماحول اور اس کے حالات کو سامنے رکھ کر ایسا طریقہ اختیار کرے کہ وہ آپ کی طرف مائل ہو ایسا نہ ہو کہ آپ کی بات سن کر وہ آپ سے بھاگنے کی کوشش کرے

اسی کو ''**حکمت**'' کہا گیا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِيْنُهُ وَ نَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰه اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد.

أعوذباللّٰہمن الشيطان الرجيم بسم اللّٰہالرحمن الرحيم: ﴿أُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ﴾

وقال اللّٰہتعالیٰ: ﴿أُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾

وقال تعالیٰ: ﴿وَتَعَاوَنُوْاعَلَى الْبِرِّوَالتَّقْوٰى﴾

وقال تعالیٰ: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾

﴿دین کی دعوت دینے کا حکم﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے ﴿الدَّلالَةُعَلٰى خَيْرٍوالدعاءُ الٰى هدىً أوضلالةٍ﴾ بھلائی اور نیکی کے کام کی طرف رہنمائی کرنا اور ہدایت یا گمراہی کی طرف کسی کو دعوت دینا۔کوئی آدمی لوگوں کو ہدایت اور نیکی کے راستہ کی دعوت دے؛اس کے کیا فضائل ہیں اوراس پراس کوکیا اجروثواب ملتا ہے۔اوراگرکوئی آدمی گمراہی اور ضلالت کی طرف لوگوں کودعوت دے؛تواس پرکیا عذاب وعقاب ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآنِ پاک کی آیتوں کے کچھ اجزاء پیش کئے ہیں ﴿أُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ﴾ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کوخطاب فرماتے ہوئے ارشادفرمایا: اے نبی! آپ اپنے رب کی وحدانیت اوراپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو دعوت

دیجیے۔ گویا بھلائی اور نیکی کا راستہ اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا؛ ایک ایسا کام ہے جس کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود نبی کریم ﷺ کو حکم دیا اور اس کا آپ کو بھی پابند بنایا۔ معلوم ہوا کہ جس چیز کے لئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہو؛ تو ظاہر ہے کہ وہ کام آپ کی امت کو بھی کرنا ہی ہے۔

﴿داعی کے لئے سوجھ بوجھ اور دانائی ضروری ہے﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ اے نبی! آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو بلائیے اور دانائی وخوش اسلوبی کے ساتھ اور اچھے طریقہ سے نصیحت کرتے ہوئے دعوت دیجیے۔ گویا یہاں ایک مزید چیز کو شامل کرلیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف لوگوں کو جو دعوت دی جائے گی اس کے لئے ایک خاص انداز ہونا چاہیے اور اس انداز کے واسطے آدمی کو سوجھ بوجھ اور دانائی سے کام لینا چاہیے اور اس کے لئے لوگوں کو بھلے طریقہ سے نصیحت کرنی چاہیے۔

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی ایک اچھی بات کے لئے لوگوں کو دعوت دے رہا ہے، لیکن اس کے لئے جو انداز اور طریقۂ کار اختیار کرتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے بجائے اس کے کہ لوگ اس چیز کی طرف آویں؛ اس سے دور بھاگتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف جو دعوت دینے والا ہے اس کو اس بات کی بھی تاکید کی گئی کہ دعوت کے لئے جو طریقہ اور انداز اختیار کیا جائے وہ بھی ایسا ہونا چاہیے جو سوجھ بوجھ اور دانائی پر مبنی ہو۔ اور جس آدمی کو بلایا جارہا ہے اس کی ذہنیت اور اس کے خیالات اور ماحول اور اس کے حالات کو سامنے رکھ کر ایسا طریقہ اختیار کرے کہ وہ آپ کی طرف مائل ہو اور

آپ کی دعوت پر لبیک کہہ دے، ایسا نہ ہو کہ آپ کی بات سن کر آپ سے بھاگنے کی کوشش کرے۔ اسی لئے ﴿بِالْحِكْمَةِ﴾ فرمایا۔ گویا جو لوگ دعوت کا کام کرتے ہیں ان کے لئے بنیادی چیز ''حکمت'' ہے۔ لہٰذا اس کام کو انہیں خطوط اور طریقوں پر کرنا چاہیے جو نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار فرمائے۔

﴿نبی کریم ﷺ کا حکیمانہ انداز﴾

ایک مرتبہ ایک نوجوان آیا اور اس نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دیجیے۔ جب اس نے یہ بات کہی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کا یہ سوال سن کر طیش میں آ گئے اور ان کے چہروں کے رنگ بدل گئے۔ نبی کریم ﷺ نے اس نوجوان کو اپنے قریب بلایا اور کہا: اچھا! یہ بتلا کہ تو جس چیز کی اجازت مجھ سے طلب کر رہا ہے؛ کیا یہ کام تو اپنی ماں کے ساتھ کرنا پسند کرتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے پھر پوچھا: اپنی بیٹی کے ساتھ، اپنی بہن کے ساتھ، اپنی خالہ کے ساتھ، اپنی پھوپھی کے ساتھ؟ نبی کریم ﷺ نے یہ سب سوالات کئے۔ اس نے ہر ایک کا جواب نفی میں دیا کہ مَیں اس کو پسند نہیں کرتا۔ تو پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تو جس کے ساتھ یہ حرکت کرے گا وہ بھی تو کسی کی بہن ہوگی، کسی کی خالہ ہوگی، کسی کی پھوپھی ہوگی، کسی کی بیٹی ہوگی، کسی کی ماں ہوگی۔ کیا وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے؟ جب تم اپنے لئے اس چیز کو پسند نہیں کرتے تو کیا ان کے لئے پسند کرو گے؟ جب اس نے یہ جواب سنا تو فوراً عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے لئے دعا کیجیے کہ میرے دل میں سے اللہ تعالیٰ اس خیال کو نکال دے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور اس کے لئے دعا کی۔ (مسند الامام أحمد، ۲۵۶/۵)

دیکھئے! اگر مَیں اور آپ ہوتے تو اس پر آگ بگولہ ہو جاتے اور غصہ ہو جاتے کہ ''کیا بول رہا ہے؟ ایک حرام کام کی اجازت طلب کر رہا ہے'' لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کیلئے وہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا، بلکہ بڑی محبت سے اس کام کی قباحت اور برائی اس نوجوان کے ذہن میں بٹھائی اور جب وہ اس کو سمجھ گیا تو پھر وہ آپ ہی آپ اس بات کا اقرار کرنے لگا کہ ہاں! یہ کام کرنے جیسا نہیں ہے۔ اسی کو بتلایا گیا: ﴿اُدۡعُ اِلیٰ سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ﴾ اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی، سوجھ بوجھ کے ساتھ اور بھلی نصیحت کے ساتھ لوگوں کو دعوت دو۔

﴿وَتَعَاوَنُوۡا عَلیٰ الۡبِرِّ وَالتَّقۡویٰ﴾ نیکی اور اللہ سے ڈرنے کے کاموں میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرو، ایک دوسرے کو قوت پہنچاؤ۔

﴿ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے......﴾

﴿وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّةٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلیٰ الۡخَیۡرِ﴾ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی دعوت دے، بھلائی کی طرف بلاوے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔ گویا ہر معاشرہ اور سماج میں، ہر علاقہ اور بستی میں ایک گروہ اور جماعت ایسی ہونی چاہیے، تاکہ اس کی وجہ سے اس معاشرے میں نیکی اور بھلائی کو فروغ ملے اچھائی پھلے پھولے اور برائی کے راستے بند ہوں، برائیوں سے لوگوں کو نفرت پیدا ہو۔ اگر کچھ لوگ یہ کام کرتے رہیں تو اس کے نتیجے میں اس معاشرے میں کبھی بھی کسی برائی کو پنپنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ اور بھلائیاں؛ جن کی طرف سے لوگ غفلت برت رہے ہیں یا کوتاہیاں کر رہے ہیں؛ اس کی طرف لوگوں کی رغبت ہوگی اور اس کا شوق پیدا ہوگا۔

ان ساری آیتوں میں قدرِ مشترک بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاوے ﴿الدَّلالَةُ عَلیٰ خَیْرٍ﴾ نیکی کے کاموں کی طرف لوگوں کو دعوت دے۔اور آخری آیت کے اندر ایک مزید چیز ہے ﴿وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ بری باتوں سے روکے۔

﴿دعوت الیٰ الخیر کی فضیلت﴾

اس سلسلہ میں روایتیں پیش فرماتے ہیں:-

عن أبی مسعود عقبۃ بن عمرو الانصاری البدری رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ دَلَّ عَلیٰ خَیْرٍ؛ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ.

حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو انصاری بدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ان کو بدری کیوں کہا گیا،اس کی دو وجہیں بتلائی گئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے،اور دوسری وجہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر جہاں پیش آیا تھا وہاں قیام پذیر تھے۔لیکن راجح قول جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ہیں اس لئے بدری کہا جاتا ہے۔اگرچہ محدثین کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ ان کو بدری غزوۂ بدر میں شرکت کی وجہ سے نہیں بلکہ مقامِ بدر میں اقامت اختیار کرنے کی وجہ سے کہا جاتا ہے

وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی کسی نیکی کے کام کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرے،نیکی کا راستہ بتلائے،اس کی دعوت دے تو جو لوگ اس نیکی کے کام کو کریں گے اور اس پر ان کو جتنا ثواب ملے گا،اللہ تعالیٰ اس رہنمائی کرنے والے کو بھی اتنا ہی ثواب عطا فرمائیں گے۔

﴿روایتِ بالا کا شانِ ورود﴾

یہ روایت ایک دوسرے طریق سے بھی آئی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد فرمانے کی وجہ بھی بتلائی ہے۔اس روایت کا شانِ ورود ذکر کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے آکر آپ ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری سواری کا جانور ہلاک ہو گیا اور اب مَیں اپنا سفر آگے جاری رکھنے سے قاصر ہوں، آپ مجھے سواری دیجیے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس سواری کا کوئی جانور نہیں ہے۔ حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں ایک ایسا آدمی بتلاتا ہوں جو اس کو سواری کا جانور دے گا۔اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی کسی نیکی کے کام کی طرف رہنمائی اور دلالت کرے، کسی بھلے کام کا راستہ بتلائے؛ تو کرنے والے کو جو ثواب ملے گا وہی اس راستہ بتلانے والے کو بھی ملے گا۔ (ترمذی شریف، کتاب العلم، حدیث ۲۶۷۱)

اسی کو بعض دوسری روایتوں میں ان الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے: ﴿الدَّالُّ عَلیٰ الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ﴾ نیکی کے کام کی طرف دلالت کرنے والا اس کام کے کرنے والے کی طرح ہے۔ گویا دونوں کو برابر کا ثواب ملے گا۔ (المعجم الکبیر، ۱۷/ ۲۲۸)

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ثواب کی مقدار میں برابری بتلائی جا رہی ہے، یا نفسِ ثواب میں شرکت بتلائی جا رہی ہے؟ تو بہت سے حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ جس طرح کرنے والا ثواب پاتا ہے؛ اِس کو بھی ملے گا۔نفسِ ثواب میں دونوں کو شریک بتلایا گیا ہے، مقدار کے اعتبار سے نہیں۔ ظاہر ہے کہ کرنے والے کو زیادہ ثواب ملے گا اور اس کی بھی اس میں شرکت رہے گی۔

لیکن علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ دیکھو! کسی بھی نیکی کے کام پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ثواب کا دیا جانا؛ یہ اس کا فضل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اگر اس بتلانے والے کو بھی اتنا ہی ثواب دیں جتنا کرنے والے کو دیتے ہیں؛ تو اس میں کونسی کمی کی بات ہے۔ ثواب تو اللہ تعالیٰ کے دینے سے ملتا ہے ﴿ذَالِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ وہ اپنی مرضی سے جس کو جتنا دے۔ اس میں کوئی اعتراض کی بات تو ہے نہیں۔ اور چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اتنا ہی ثواب بتلانے والے کو ملتا ہے، اس لئے علامہ قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

بہرحال! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو عنوان قائم کیا تھا ﴿الدَّلَالَۃُ عَلیٰ خَیۡرٍ﴾ نیکی کا راستہ بتلانے پر کیا ثواب ملتا ہے، اس کو بتلایا کہ نیکی کا کام کرنے والے کو عمل پر جو ثواب ملے گا؛ اتنا ہی بتلانے والے کو بھی ملے گا۔ اب اگر آپ کے بتلانے کی وجہ سے ایک آدمی نے کیا تو اتنا ثواب، اور اگر دو آدمیوں نے کیا، چار نے کیا، دس نے کیا، آپ کے بتلانے کی وجہ سے اس عملِ خیر کو جتنے بھی انجام دیں گے؛ اتنا ہی آپ کے ثواب کے اندر اضافہ ہوتا رہے گا۔ راستہ بتلانے والے اور خیر کی طرف دلالت کرنے والے کی محنت کے اوپر موقوف ہے۔ لہٰذا ہم اگر زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کر سکتے ہیں تو پھر ہم کوتاہی کیوں کریں۔

ایک آدمی دنیوی اعتبار سے اگر زیادہ کمانے پر قادر ہے، زیادہ منفعت حاصل کر سکتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیوی اعتبار سے اس منافعہ میں کمی کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر سکتا ہو؛ کرے۔ اس معاملہ میں ہم اپنے آپ کو حرکت میں رکھتے ہیں اور اس کی کوشش کرتے ہیں؛ تو پھر اُمورِ

اخروی میں بھی ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ہماری ذات سے کسی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے؛ تاکہ اس کے اجر وثواب میں ہمیں حصہ ملے۔

﴿اگلے باب اور اس باب میں فرق﴾

دیکھو! اگلا باب گذرا تھا﴿مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً﴾ جس نے اچھا طریقہ یا برا طریقہ جاری کیا۔ اور یہاں ہے﴿الدَّلَالَةُ عَلٰى خَيْرٍ﴾ نیکی کے کام کا راستہ بتلانا۔ ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اُس باب کا خلاصہ ہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ دعوت بھی دے کہ یہ کرو، جیسے کہ مَیں نے مثال بھی دی تھی کہ اگر کسی سماج میں کوئی برائی کا کام نہیں ہو رہا ہے اور کسی نے پہلی مرتبہ وہ کام کیا، اگرچہ وہ لوگوں کو کہتا نہیں ہے کہ آپ بھی ایسا کیجیے، لیکن اس کو اس طرح کرتا ہوا دیکھ کر دوسروں نے کیا؛ تو اس کو بھی دوسروں کے برابر گناہ ہوگا۔ یا اگر نیکی کا کام ہے تو ثواب ملے گا۔ وہاں تو ''سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً'' یا ''سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً'' ہے کہ اچھا یا برا طریقہ جاری کیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ طریقہ جاری کرتے وقت چاہے اس نے لوگوں کو دعوت نہ دی ہو، بلکہ خود ایک کام کرلیا اور اس کو وہ کام کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے لوگ اس راہ پر پڑ گئے؛ تو اس کو بھی ان کے ثواب میں شریک کیا جائے گا۔ جبکہ یہاں اِس باب میں ایک چیز مزید آئی کہ ایک اچھا طریقہ پہلے سے چلا آرہا تھا، اس نے جاری نہیں کیا، لیکن اس اچھے کام کی لوگوں کو دعوت دے رہا ہے اور آمادہ کررہا ہے، تو اس صورت میں جتنے بھی لوگ اس کے دعوت دینے کے نتیجے میں اس کام کو کریں گے، ان کو جتنا بھی ثواب ملے گا؛ اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔

﴿اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَنْ دَعَااِلیٰ هُدیً كَانَ لَهٗ مِنَ الْأَجْرِمِثْلُ أُجُوْرِمَنْ تبعَهٗ، لايَنْقُصُ ذٰلِکَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئاً. وَمَنْ دَعَااِلیٰ ضَلالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْاِ ثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهٗ. لايَنْقُصُ ذٰلِکَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئاً. (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کسی بھلائی کے راستہ کی طرف لوگوں کو دعوت دے گا تو اس کے نتیجے میں جتنے بھی لوگ اس راستہ پر چلیں گے ان کو جتنا ثواب ملے گا؛ اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔ اب اس کو جو ثواب مل رہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کرنے والے ہیں ان کے ثواب میں سے کٹوتی اور کمی کر کے اس کو دیا جائے گا۔ بلکہ کرنے والوں کو تو عمل کا ثواب ملے گا، مزید برآں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بتلانے والے کو انہیں کے برابر ثواب ملے گا، اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ دَعَـااِلیٰ ضَلالَةٍ﴾ اوپر کی روایت میں صرف ایک بات تھی کہ جس نے کسی بھلائی کی طرف دعوت دی، اس میں برائی والی بات نہیں تھی، اس روایت میں دونوں چیزوں کو جمع کر لیا ہے۔ چنانچہ دوسرا جزو یہ ہے کوئی آدمی لوگوں کو گناہ کے کام کی یا گمراہی کی دعوت دے اور اس کے دعوت دینے اور برائی کا راستہ بتلانے کے نتیجے میں جتنے بھی لوگ اس برائی کو اختیار کریں گے اور عملی طور پر اس برائی میں مبتلا ہوں گے؛ تو ان کو جتنا گناہ ہوگا، ان کے گناہوں کے برابر اس بتلانے والے کو بھی گناہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی ہو جائے گی، بلکہ ان کو تو اپنے فعل کا اتنا ہی گناہ ملے گا۔

دیکھو! اس دعوت دینے میں تو براہِ راست لوگوں کو بلایا۔ اور اچھا یا برا طریقہ جاری

کرنے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ طریقہ جاری کرنے والا موجود بھی رہا ہو۔اگلے باب میں گذرا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا بیٹا قابیل جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت تک جتنے بھی ناحق قتل وجود میں آئیں گے، ان سارے قتلوں کا گناہ اس کو ہوگا۔تو دیکھئے! بعد میں جتنے بھی لوگ قتل کر رہے ہیں ان لوگوں کو اس نے دعوت نہیں دی کہ تم قتل کرو، البتہ یہ برا طریقہ اس نے جاری کیا تھا۔

دونوں باب کے عنوان میں تھوڑا سا جو فرق ہے؛ میں وہ بتلانا چاہتا ہوں۔اِس باب میں اس بات کا بیان ہے کہ دعوت دینے کے نتیجے میں لوگ کریں گے۔اور طریقہ جاری کر کے چلا گیا اور اب دوسرے لوگ اس طریقے پر چل رہے ہیں، اگلے باب میں اُس کا بیان تھا۔

مدینہ منورہ میں اخیر میں وفات پانے والے صحابی

عن أبی العباس سهل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ یَوْمَ خَیْبَرَ لَأُعْطِیَنَّ الرَّایَةَ غَداً رَجُلاً یَفْتَحُ اللّٰهُ عَلیٰ یَدَیْهِ، یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ. فَبَاتَ النَّاسُ یَدُوْکُوْنَ لَیْلَتَهُمْ أَیُّهُمْ یُعْطَاهَا. فَلَمَّا أَصْبَحَ النَّاسُ غَدَوْا عَلیٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، کُلُّهُمْ یَرْجُوْ أَنْ یُّعْطَاهَا، فقال: أَیْنَ عَلِیُّ بْنُ أَبِیْ طَالِبٍ؟ فَقِیْلَ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هُوَ یَشْتَکِیْ عَیْنَیْهِ. قَالَ: فَأَرْسِلُوْا اِلَیْهِ، فَأُتِیَ بِهٖ فَبَصَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْ عَیْنَیْهِ وَدَعَالَهٗ، فَبَرَأَ حَتّٰی کَأَنْ لَّمْ یَکُنْ بِهٖ وَجَعٌ فَأَعْطَاهُ الرَّایَةَ. فَقَالَ عَلِیٌّ رضی اللہ عنہ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أُقَاتِلُهُمْ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مِثْلَنَا؟ فَقَالَ: اُنْفُذْ عَلیٰ رِسْلِکَ حَتّٰی تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ، وَأَخْبِرْهُمْ بِمَا یَجِبُ عَلَیْهِمْ مِنْ حَقِّ اللّٰهِ تَعَالیٰ فِیْهِ، فَوَاللّٰهِ لَأَنْ یَّهْدِیَ اللّٰهُ بِکَ رَجُلاً وَاحِداً خَیْرٌ لَّکَ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ. (متفق علیه)

حضرت ابوالعباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ انصار میں سے ہیں۔ مدینہ منورہ میں اخیر میں انتقال کرنے والے صحابی ایک قول کے مطابق یہی ہیں، ایک قول کے مطابق ۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سب سے اخیر میں مدینہ منورہ میں انتقال کرنے والے ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق حضرت سہل بن سعد ساعدی ہیں۔ ان کا اصل نام حزن تھا، حزن عربی زبان میں سخت زمین کو کہتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بدل کر سہل رکھ دیا۔ سہل نرم زمین کو کہتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم برے نام بدل دیا کرتے تھے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ بھی تھی کہ اگر کسی کا کوئی نام ایسا ہوتا کہ جس کا مطلب و ترجمہ اچھا نہیں ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کو بدل دیا کرتے تھے اور ایسا نام تجویز فرماتے تھے جو اچھا ہو۔ اس کو مشورہ دیتے تھے کہ اپنا نام بدل دو۔

حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ جو اکابرِ تابعین میں ہیں اور بہت سے حضرات نے تو ان کو افضل التابعین کہا ہے، ان کا بڑا اونچا مقام ہے۔ ان کے والد مسیّب صحابی ہیں اور ان کے دادا بھی صحابی ہیں۔ حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دادا سے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا: حزن۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سہل کر دو۔ لیکن چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کے طور پر نہیں فرمایا تھا بلکہ مشورہ کے طور پر فرمایا تھا، اس لئے انہوں نے کہا: نہیں! میرا جو نام رکھا گیا ہے مَیں تو اسی پر باقی رہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر ٹھیک ہے۔ حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں ہمارے خاندان میں مزاج کی سختی برابر رہی، اس لئے کہ حزن سخت زمین کو کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنا نام نہیں بدلا اس کا یہ اثر رہا۔

اسی لئے ہر آدمی کے نام میں اس کے نام کا اثر ضرور ہوتا ہے۔عربی میں کہا جاتا ہے ﴿لِکُلِّ مُسَمًّی حَظٌّ مِنْ اِسْمِهٖ﴾ ہر مسمّٰی کو اس کے نام میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ملا کرتا ہے۔ اسی لئے نام بھی اچھے تجویز کرنے چاہئیں،اور اس میں بھی انبیاء کرام،اکابر کے ناموں سے آدمی کو برکت حاصل کرنی چاہیے۔

﴿کریکیٹروں اور ایکٹروں کے نام رکھنے کا شوق﴾

آج کل ایک مزاج یہ بھی بن گیا ہے کہ نام رکھنے میں دیکھتے ہیں کہ یہ نام کس کریکیٹر کا ہے یا سنیما میں کام کرنے والے ہیرو یا ہیروئن کا ہے۔اب ظاہر ہے کہ نام رکھتے وقت ہی آپ کے ذہن میں یہ بات تھی تو اس کے اثرات تو آئیں گے ہی۔اس لئے ان چیزوں سے بچنا چاہیے،کم سے کم اتنا اہتمام تو ہم کریں،اس میں کوئی زیادہ محنت تو نہیں کرنی پڑتی،نام رکھنے کا معاملہ ہے،اللہ کے نیک بندوں کو سامنے رکھ کر رکھو۔آج کل یہ مزاج بنتا جا رہا ہے اور جب اس کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں تو پھر زندگی بھر روتے رہتے ہیں۔

﴿بارگاہِ نبوی سے اعلیٰ ترین سرٹیفکٹ﴾

نبی کریم ﷺ نے جنگِ خیبر کے موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ میں آئندہ کل جھنڈا ایک ایسے آدمی کو دوں گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر اس قلعہ کو فتح کرے گا۔دوسری روایت میں تفصیل ہے کہ دو چار روز سے اس قلعہ کو فتح کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ایک رات نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: آئندہ کل صبح میں ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں جھنڈا دوں گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں یہ قلعہ فتح کریں گے پھر اس آدمی کی شان اور اس کا وصف یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے،اور اللہ اور

اس کا رسول اس سے محبت رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہر صحابی کی کیفیت اور شان یہی تھی لیکن یہاں خصوصیت سے یہ بات ارشاد فرمائی گئی۔

اب نتیجہ تو صبح کو ظاہر ہونے والا تھا کہ جھنڈا کس کو ملے گا۔ لیکن راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کو سننے کے بعد رات بھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسی چرچوں میں رہے کہ کس کے نام کی لاٹری نکلتی ہے، کس کی قسمت جاگتی ہے، جھنڈا کل کس کو ملے گا؟

دیکھو! ہر ایک کی تمنا تھی اور یہ تمنا اس لئے نہیں تھی کہ جھنڈا دیا جا رہا ہے اور سردار بنایا جا رہا ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس میں ایک خاص بات ارشاد فرمائی تھی ﴿یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ﴾ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ تو اس جھنڈے کا اس کے ہاتھ میں دیا جانا؛ یہ ایک خاص وصف کی علامت بن گیا تھا جس کی تمنا ہر مومن کرتا ہے۔ اس لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے یہ بات رات بھر موضوعِ بحث بنی رہی کہ کون ہے جس کو یہ شرف ملے گا؟ جب صبح ہوئی تو سب حضور ﷺ کے سامنے آنے لگے۔

﴿حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام لاٹری لگی﴾

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے صحابہ بھی سامنے آ رہے تھے۔ اور ایسے موقعہ پر ہر آدمی چاہتا ہے اور سر اونچا کرتا ہے، تا کہ مجھے دیکھیں اور میرا نمبر لگ جائے، لہٰذا بڑے بڑے صحابہ بھی حضور کے سامنے اس تمنا اور امید میں آ رہے ہیں کہ شاید مجھے بلا لیں اور میری قسمت کھلے۔

خیر! جن کو دیا جانا تھا وہ وہاں موجود نہیں تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: علی کہاں ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیمار تھے، ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی، اس لئے وہ وہاں موجود نہیں تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پوچھا کہ علی کہاں ہیں؟ تو بتلایا گیا کہ یارسول اللہ! ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے، آشوبِ چشم کی شکایت ہے اس لئے وہ یہیں نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو بلاؤ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا، سب سے پہلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیماری کا علاج کیا، آپ نے ان کی دونوں آنکھوں میں اپنا لعابِ مبارک ڈالا اور ان کے لئے شفا کی دعا فرمائی چنانچہ اسی وقت ان کی آنکھیں اچھی ہو گئیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی درد ہی نہ ہو۔ بلکہ دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ اس کے بعد زندگی بھر کبھی ان کی آنکھوں میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ درد گیا تو ایسا گیا کہ پھر دوبارہ لوٹ کر نہیں آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت تھی۔

(شرح مواہب اللدنیۃ۔ ۲/۷)

اسلام میں قتل وقتال بذاتِ خود مقصود نہیں ہے

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جھنڈا دیا۔ جب جھنڈا ہاتھ میں ملا تو چونکہ حضرت علی بہادر اور شجاع آدمی تھے اس لئے انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں لوگوں سے قتال کروں اور لڑوں یہاں تک کہ وہ ہمارے جیسے ہو جائیں یعنی جیسے ہم مسلمان ہیں وہ بھی اسلام لا کر مسلمان ہو جائیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ آپ آگے بڑھیے اور جب ان کے صحن یعنی آبادی کے کنارے (جس کو گجراتی میں پادر (પાદર) کہتے ہیں) پہنچ جائیں تو لڑائی میں عجلت سے کام نہ لینا۔ اگرچہ خیبر کے لوگ وہ تھے جن کو اسلام کی دعوت پہلے سے پہنچ چکی تھی اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اس بات کا پابند کیا کہ پہلے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کریں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام میں جہاد اور قتل وقتال بذاتِ خود مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ کے بندے ہدایت پر اور سیدھے راستہ پر

آجائیں، اور جولوگ اس میں رُکاوٹ اور روڑا بنتے ہیں؛ ان ہی کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ ان کو پہلے اسلام کی دعوت دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو بتلایا جائے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کیا کیا حقوق ہیں جو بندوں پر واجب ہوتے ہیں۔ اگر تمہاری اس دعوت کے نتیجے میں اس کو تسلیم کرلیں، اسلام لے آئیں، حقوق اللہ کی ادائیگی کے لئے آمادہ اور راضی ہوجائیں؛ تو پھر لڑائی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

﴿کسی بندے کو ہدایت کا راستہ بتانے کی فضیلت﴾

﴿فَوَاللّٰہِ لَأَنْ یَّھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلاً وَاحِداً خَیْرٌ لَّکَ مِنْ حُمُرِ النِّعَمِ﴾ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ کسی کو راہِ راست دکھلائے اور کسی راہ بھٹکے ہوئے آدمی کو راستہ مل جائے، اگر ایک شخص کو بھی ہدایت مل جاتی ہے تو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے عرب میں اونٹ بڑا قیمتی مال سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ ان کا پیشہ ہی مویشی پالنا تھا اور مویشی میں سب سے اونچا مال اونٹ اور اونٹوں میں بھی سرخ اونٹ بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت کے مقابلہ میں یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

اس حدیث کے ذریعہ سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی کو دنیوی دولت حاصل کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی ذات سے اللہ تبارک وتعالیٰ لوگوں کو راہِ راست پر لائے۔ چاہے کافر اسلام قبول کرے، چاہے ایک مسلمان جو راستہ سے بھٹکا ہوا ہے، بدعملی میں مبتلا ہے، آپ کے سمجھانے اور فہمائش کے نتیجے میں وہ اپنی بدعملی چھوڑ دے۔ یا تو اس کی پوری زندگی بدعملی میں گذر رہی ہے اور آپ کے سمجھانے کی وجہ سے اس کی زندگی میں انقلاب آگیا اور اس نے اپنے حالات کو درست کرلیا۔ یا کسی

ایک آدھ برائی میں مبتلا ہے جیسے شراب نوشی یا مخدرات اور نشہ آور اشیاء کا استعمال کرتا ہے، سنیمابینی میں، زنا کاری میں یا ٹی وی دیکھنے میں یا کسی بھی برائی میں مبتلا ہو، اور اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ہدایت دیں۔

ہدایت عام ہے۔ چاہے ہدایت کفر سے اسلام کی طرف ہو، یا بدعملی سے نیک عملی کی طرف ہو۔ اس میں بھی پوری بدعملی سے نیک عملی میں آیا ہو، یا کسی ایک چیز میں۔ بہرحال! آپ کے سمجھانے اور فہمائش سے اور آپ کی کوششوں کے نتیجے میں اس نے کوئی برائی چھوڑ دی اور بھلائی کے راستہ پر آ گیا؛ تو یہ تمہارے لئے بڑی سے بڑی دولت کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے ہمیں اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿ہماری بھی کوشش ہونی چاہیے……﴾

ہمارے معاشرے میں، ہمارے دوستوں کے حلقوں میں بہت سے احباب ایسے ہوتے ہیں کہ جو کسی برائی میں مبتلا ہوتے ہیں اور ہمیں اس کا علم ہوتا ہے کہ اس میں فلاں چیز ہے، تو ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنی اس برائی کو چھوڑ کر اس کے مقابلہ میں جو بھلائی ہے اس کو اختیار کر لے، یہ دوستی کا حق ہے۔ اگر ہماری کوشش کے نتیجے میں بھلائی پر آ گیا تو پھر موت تک وہ نیکی کرتا رہے گا اور اس کو جتنا ثواب ملے گا اس میں ہمارا بھی حصہ ہو جائے گا ﴿لَأَنْ يَّهْدِيَ اللهُ بِكَ رَجُلاً وَاحِداً﴾ والی فضیلت کے ہم بھی مستحق ہو جائیں گے۔ اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کافر کو مسلمان بنایا جائے، اگر یہ کام ہو جائے تو بہت اونچا کام ہے، نور علیٰ نور۔ لیکن اگر کوئی شخص چھوٹی سی برائی میں مبتلا تھا اور اس پر آپ نے محنت کی جس کے نتیجہ میں وہ برائی سے بھلائی کی طرف آ گیا؛ تب بھی ان شاء اللہ یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ اس حکم میں عموم ہے جس میں ساری محنتیں داخل ہیں۔

﴿عملی نمونہ﴾

وعن أنس رضی اللہ عنہ أَنَّ فَتىً مِّنْ أَسْلَمَ قَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! اِنِّيْ أُرِيْدُالْغزْوَوَلَيْسَ مَعِيْ مَا أَتَجَهَّزُبِهٖ؟قَالَ: اِئْتِ فُلانًافَاِنَّهٗ قَدْكَانَ تَجَهَّزَ،فَمَرِضَ.فَأَتَاهُ فَقَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يُقْرِؤُكَ السَّلامَ وَيَقُوْلُ: أَعْطِنِي الَّذِيْ تَجَهَّزْتَ بِهٖ.فَقَالَ: يَافُلانَةُ!أَعْطِيْهِ الَّذِيْ تَجَهَّزْتُ بِهٖ وَلَاتَحْبِسِيْ مِنْهُ شَيْئًا،فَوَاللهِ لَاتَحْبِسِيْنَ مِنْهُ شَيْئًافَيُبَارَكَ لَكِ فِيْهِ. (رواہ مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قبیلۂ اسلم کے ایک نوجوان نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں جہادوغزوہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں لیکن غزوہ میں شریک ہونے کے لئے جس سازوسامان کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے سواری کے لئے گھوڑا، لڑائی کے واسطے ہتھیار، بچاؤ کے لئے زرہ اور ضرورت کا جو بھی سامان ہوتا ہے؛ وہ میرے پاس موجود نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حالات کے سازگار نہ ہونے کی وجہ سے باوجود خواہش وتمنا کے مَیں جہاد میں شرکت پر قادر نہیں ہوں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اس نوجوان سے فرمایا: ایسا کرو کہ فلاں آدمی کے گھر چلے جاؤ، اس آدمی نے لڑائی وجہاد میں شرکت کے واسطے تیاری مکمل کر لی تھی، لیکن وہ بیمار ہو گیا جس کی وجہ سے شریکِ سفر نہیں ہوسکتا۔ اب اس نے جو سامان تیار کر رکھا ہے اس کے پاس جا کر مطالبہ کرو کہ جو تیاری تم نے کر رکھی ہے وہ میرے حوالے کر دو تا کہ مَیں شریک ہوجاؤں۔

﴿صحابی کی فراخ دلی﴾

چنانچہ وہ نوجوان نبی کریم ﷺ کے بتلانے پر اس آدمی کے پاس گیا اور ان صحابی سے یوں کہا کہ نبی کریم ﷺ نے تم کو سلام کہا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ تم نے جہاد میں جانے کے

لئے جو تیاری کی تھی وہ میرے حوالے کردو۔ چنانچہ جب حضور کا پیغام پہنچا تو ان صحابی نے اپنی بیوی سے کہا کہ میرے سفر کے واسطے جو سامان تیار کیا تھا وہ ان کو دے دینا، اور کوئی چیز اس میں سے روکنا مت۔ چونکہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ ایک آدھ چیز اس میں سے روک کر رکھ لیتی ہیں، یہ سوچ کر کہ ہمارے شوہر کی ضرورت کی یہ چیز تیار کی تھی ان کو تو اس کی عادت تھی، لیکن دوسروں کو اس کی کیا ضرورت پیش آئے گی، ان کو تو چل جائے گا۔ ایسا سوچنا مت۔ اس لئے ان صحابی نے خاص طور پر تاکید کی کہ میرے لئے جو سامان تیار کیا تھا اس میں سے کوئی چیز روک کر مت رکھیو، اس لئے کہ حضور ﷺ کے اس فرمانے کے بعد اگر کوئی چیز روک لو گی تو اس میں برکت نہیں ہوگی۔ اگر ایسا سوچ کر ایک آدھ چیز بھی تم نے روک لی تو اس میں کچھ برکت ہونے والی نہیں ہے، اور وہ تمہارے کام کی بھی نہیں رہے گی۔ تو ایک تو یہ ہوگا کہ وہ ادھر گئی بھی نہیں اس لئے ثواب سے بھی محرومی رہی، اور تمہارے کام بھی نہیں آئی۔ یہ تو ایسا ہی ہوگیا:۔

نہ خُدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ❁ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

آپ ضرورت مند کی رہنمائی کردیں

یہاں تو اس روایت کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ ان صحابی کو جنگ میں کام آئے ایسا سامان نبی کریم ﷺ کے پاس موجود نہیں تھا لیکن آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ فلاں صاحب نے تیاری کر رکھی تھی اور وہ بیماری کی وجہ سے جا نہیں پائے ہیں، ان کے پاس سب سازو سامان موجود ہے، تو آپ ﷺ نے رہنمائی فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ضرورتمند اپنی ضرورت لے کر آپ کے پاس آیا لیکن آپ کے پاس اس کی ضرورت پوری کرنے کی استطاعت نہیں ہے، اور آپ کے علم میں ہے کہ فلاں صاحب اس کی یہ ضرورت پوری

کردیں گے، لہٰذا آپ نے رہنمائی کردی کہ فلاں صاحب کے پاس جاؤ۔ اب وہ وہاں گیا اور ضرورت پوری ہوگئی تو اس صورت میں ان دینے والوں کو جتنا ثواب ملے گا اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔ چونکہ اس نے وہاں کا راستہ بتلایا تھا اور یہ ذریعہ بنا تھا۔ اس لئے کہ یہ اگر نہ کہتا تو وہ وہاں نہ جاتا اور وہ آدمی اس کی ضرورت پوری نہ کرتا۔

مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے

اسی لئے حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کسی کو مال عطا فرمایا ہوا اور وہ نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، اور ایک دوسرا آدمی ہے جس کے پاس مال نہیں ہے لیکن اس مال والے کو نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہوا دیکھ کر اس کے دل میں واقعۃً یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی نیکی کے کاموں میں اسی طرح خرچ کرتا جس طرح یہ کر رہا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اس نیت کی وجہ سے اتنا ہی ثواب عطا فرمائیں گے جتنا اس خرچ کرنے والے کو دیا کرتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ﴿نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۸۵/۶)﴾ مومن کی نیت اس کے عمل سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ نیت میں تو نفس نیت ہی کی وجہ سے ثواب ملا، لیکن عمل کے اندر تو ہوسکتا ہے کہ عملی طور پر اس کام کو انجام دینے میں ہم سے کوئی کوتاہی سرزد ہوجائے۔ نیت کے اندر تو کوئی کوتاہی نہیں ہوگی اگر اخلاص کے ساتھ ہے۔

روزہ افطار کرانے کی فضیلت

اسی لئے حدیث میں یہ بھی آتا ہے: ﴿مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ﴾ اگر کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو روزہ دار کو جو ثواب ملے گا اتنا ہی ثواب افطار کرانے والے کو ملے گا۔ (ترمذی شریف۔ کتاب الصوم۔ حدیث نمبر۔۷۰۸) رمضان کا مہینہ آرہا ہے، اس لئے اس بات کا بھی اہتمام

کرنا چاہیے، خاص طور پر غرباء جو مستطیع نہیں ہیں (ویسے تو ہر روزہ دار کو آپ افطار کرائیں گے تو یہ ثواب ملے گا لیکن) ایسے لوگوں کے واسطے اگر انتظام کریں گے تو دوہرا ثواب ملے گا اب اس افطار کرانے کے واسطے ضروری نہیں ہے کہ آپ لمبا چوڑا دستر خوان ہی سجائیں بلکہ آپ نے روزہ دار کو فالودہ کھلا دیا، شربت پلا دیا، یا ایک کھجور ہی کھلا دی؛ تب بھی یہ ثواب مل جائے گا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب جو قائم کیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی نیکی کے کام کی طرف اگر کسی کی رہنمائی کی جائے اور چاہے آپ نے وہ کام نہیں کیا، دوسرے نے وہ کام کرلیا، تو اس کو جتنا ثواب ملے گا؛ اللہ تبارک وتعالیٰ بتلانے والے کو بھی اتنا ہی ثواب عطا فرمائیں گے۔ اس لئے ہمیں اس کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور اس چیز میں ہمیں کوتاہی اور سستی کبھی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق نصیب فرمائے۔

دُعاء

اے اللہ! ہمیں نیکی کے کاموں کے لئے ذریعہ بنا اور اس کی دعوت دینے والا بنا، اور جو لوگ برائی کی دعوت دیتے ہیں اے اللہ! دانستہ یا نادانستہ اس گروہ میں شریک ہونے سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! آنے والے ماہِ مبارک کو کما حقہ وصول کرنے کی توفیق نصیب فرما۔ اس کی برکات سے ہمیں اور اہل وعیال واہل خاندان اور سب متعلقین کو مالا مال فرما۔ اے اللہ! اس کی قدردانی ہمیں نصیب فرما، اس کے لئے پہلے سے تیاری کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! تیرے نیک بندوں نے جس طرح اس کو وصول کیا؛ اسی طریقہ سے وصول کرنے کا اہتمام کرنے کی توفیق عطا فرما۔

التَّعَاوُنُ عَلیٰ الْبِرِّ وَالتَّقْویٰ

﴿نیکی اور تقویٰ میں مدد وتعاون﴾

شعبان ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم دسمبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

آپسی تعاون کی بنیاد کیا؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا عنوان قائم کیا ہے ’’اَلتَّعَاوُنُ عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی‘‘ نیکی اور گناہ سے بچنے کے معاملے میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ (تعاون) کا معنٰی ہے آپس میں ایک دوسرے کو تقویت پہنچانا۔ کسی کام کو انجام دینے کے معاملے میں مدد کرنا۔

شریعت کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ نیکی و بھلائی دنیا کے اندر پھیلے اور اس کو ترقی ہو اور بدی و بُرائی ختم ہو اس کی جڑ کٹے۔ اس لئے شریعت نے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے تعاون کا حکم دیا ہے۔ دنیوی اعتبار سے تعاون کی بنیاد کچھ اور ہوا کرتی ہے، جیسے فلاں آدمی ہمارے خاندان کا ہے اس لئے اس کا تعاون کرو، چاہے وہ بھلائی کا کام کررہا ہے تب بھی، اور اگر ہم سمجھ رہے ہیں کہ وہ بُرائی میں ہے اور غلط ہے تب بھی؛ اس کا تعاون کرتے ہیں، اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اس کو سپورٹ (Support) کرتے ہیں اسی کو شریعت کی اصطلاح میں عصبیت اور گروہ بندی کہتے ہیں کہ فلاں ہمارے خاندان کا ہے

ہماری برادری اور جماعت کا ہے، ہماری پارٹی کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی کوئی بھی دنیوی بنیاد کے اوپر آپ اس کو سپورٹ (Support) کررہے ہیں، چاہے وہ حق پر ہو یا باطل پر ہو، چاہے جو کام وہ کررہا ہے وہ صحیح ہو یا غلط ہو۔ ویسے صحیح اور درست کام ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن غلط کام کے اندر محض اس بنیاد پر آپ اس کا ساتھ دیں کہ اس کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق ہے؛ تو اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ شریعت تو یہ حکم دیتی ہے کہ نیکی اور بھلائی کا کام جہاں کہیں بھی ہورہا ہے، جس کسی کے ہاتھ سے ہورہا ہے، آپ کا کوئی تعلق والا کررہا ہے یا کوئی غیر کررہا ہے؛ آپ اس کا ساتھ دیں اور تعاون کریں۔

ایک مسلمان کو مسلمان ہونے کے ناطے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس بات کا مکلّف کیا گیا ہے کہ ہم دنیا کے اندر نیکی اور بھلائی کو فروغ دیں اور برائی اور گناہ کے کاموں کو ختم کریں۔ لہٰذا جو آدمی اس مشن کو لے کر چل رہا ہو، ہماری طرف سے دستِ تعاون دراز ہونا چاہیے، اس کے تعاون میں ہماری طرف سے جو کچھ بھی ہوسکتا ہو؛ ہم اپنی طرف سے دریغ نہ کریں۔ وہ کون ہے؛ اس کی طرف نظر نہ کریں۔ بلکہ وہ کس کے کام کو لے کر چل رہا ہے؛ اس کو دیکھیں۔ شریعت نے تعاون اور عدمِ تعاون کی بنیاد اسی پر رکھی ہے۔ اور اس کو علامہ نوویؒ یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ نیکی کے کاموں میں، اور گناہ سے بچنے کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ، نافرمانی وسرکشی کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد مت کرو۔ اگر کوئی گناہ کا کام کررہا ہے، چاہے وہ آپ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔ بیٹا ہو، بھائی ہو، آپ کے خاندان

کا آدمی ہو، آپ کی برادری کا اور پارٹی کا ہو، آپ کے وطن کا ہو، اگر وہ برا کام لے کر چل رہا ہے تو آپ اس کا تعاون نہ کیجیے۔ ایک مومن ہونے کے ناطے آپ کا فرضِ منصبی ہے کہ اس کا تعاون نہ کریں۔ ہاں! اگر آپ اس کا تعاون کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس کو اس برائی سے روکیں۔

﴿اپنے مومن بھائی کی ہر حال میں مدد کرو﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿أُنْصُرْ أَخَاکَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوْماً﴾ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! ﴿أَنْصُرُہٗ مَظْلُوْماً، فَکَیْفَ أَنْصُرُہٗ ظَالِماً؟﴾ اگر وہ مظلوم ہے تو میں اس کی مدد کروں گا، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہے تو میں اس کی کیسے مدد کروں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روکو۔ وہ ظلم کر کے اپنے آپ پر زیادتی کر رہا ہے، اپنا نقصان کر رہا ہے، آپ اس کو ظلم کرنے سے باز رکھیں گے؛ تو یہ اس کی مدد ہوئی۔ گویا آپ نے اس کی بھلائی چاہی اور اس کو ظلم کرنے سے روک کر دنیوی فائدہ بھی پہنچایا اور اُخروی فائدہ بھی پہنچایا۔

تو شریعت نے تعاون کی اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی بنیاد نیکی اور بھلائی پر رکھی ہے۔ لہٰذا نیکی اور بھلائی کا کام جو کوئی بھی لے کر اُٹھے اس کا تعاون کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی برائی کر رہا ہے، تو اس کا آپ تعاون نہ کریں۔

﴿حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا بے مثال طرزِ عمل﴾

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری زمانہ میں کچھ لوگوں نے

افواہیں پھیلا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک ماحول تیار کیا تھا، چنانچہ باغیوں کی ایک جماعت سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارد گرد جمع ہوگئی اور آپ کا محاصرہ کر لیا اور آپ کو یہاں تک مجبور کیا کہ آپ مسجدِ نبوی تک بھی نہیں آسکتے تھے، مسجد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے، انہوں نے ان باغیوں کو وہاں سے دور کرنے کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اجازت چاہی، باغی لوگ اس طرح محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ ان کے ساتھ قتال کئے بغیر ان کو وہاں سے ہٹانا مشکل تھا۔ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امیر تھے اس لئے صحابہ نے آپ سے اجازت طلب کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مَیں اپنی خاطر کسی مسلمان کا خون بہانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اب امیر کی طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے صحابہ کرام کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ مسجد نبوی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی امام بھی تھے، خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے زمانہ میں یہی سلسلہ رہا اور ان کے بعد بھی ایک مدت تک یہی رہا کہ جو حاکمِ وقت ہوتا تھا وہی مسجد کا امام بھی ہوتا تھا۔

امامت کا مفہوم

امامت کا لفظ دو چیزوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ امامتِ کبریٰ اور امامتِ صغریٰ۔ پورے ملک کی حکومت کو امامتِ کبریٰ کہتے ہیں اور مسجد کی امامت کو امامتِ صغریٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں امامت کے سلسلے میں دونوں چیزیں جڑی ہوتی تھیں، جو حاکم ہوتا تھا وہی مسجد کے اندر امام بھی ہوتا تھا۔ مسجد کی امامت کا منصب بہت اونچا ہے۔

خیر! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امام بھی تھے، اب باغیوں نے چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا

محاصرہ کر رکھا تھا اور اس کی وجہ سے آپ مسجد میں تشریف نہیں لا سکتے تھے تو امامت بھی نہیں کرا پا رہے تھے۔ اور باغیوں کا جو سرغنہ تھا وہی مسجدِ نبوی کے اندر نماز پڑھاتا تھا۔ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں مسئلہ پوچھا کہ آپ تو آ نہیں پاتے اور یہ نماز پڑھاتا ہے، اب کیا کریں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا، میں وہ نقل کرنا چاہتا ہوں آپ نے فرمایا کہ نماز ایک بہترین عمل ہے اور یہ لوگ جو نماز پڑھ رہے ہیں یہ ایک اچھا کام کر رہے ہیں، لہٰذا اس میں ان کا ساتھ دیجیے۔ اور جو کام غلط کر رہے ہیں اس میں ان کا ساتھ نہ دیجیے۔ دیکھو! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ کا کتنا زیادہ اہتمام کیا۔

﴿سورۂ عصر، ترجمہ اور مختصر تفسیر﴾

﴿وَالْعَصْرِ. اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ. اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ. وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ اس سورت میں باری تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھائی (عصر) کہتے ہیں زمانہ کو۔ زمانہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کا زمانہ اور بعد میں بھی قیامت تک کا پورا زمانہ ہے۔ گویا پوری تاریخِ انسانی کی قسم کھائی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو جو پیدا کیا اور ان کے جو حالات ہیں ان میں اگر آدمی غور کرے تو اس سے وہ حقیقت جو آگے بیان کی جارہی ہے بالکل واضح، صاف اور کھل کر سامنے آسکتی ہے کہ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ﴾ انسان بڑے خسارے میں ہے۔

اگر انسان اپنی ان صلاحیتوں کو جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے اور قوت و وقت کی شکل میں جو دولت و سرمایہ اس کو عطا کیا ہے اس کو اگر وہ یوں ہی ضائع کرتا ہے

تو وہ بڑے خسارے میں ہے۔ ہاں! جو اس کو وصول کرتا ہے وہ البتہ خسارے میں نہیں ہے۔ اس کو آگے بیان کیا گیا ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ کئے تو گویا ایمان لا کر اور نیک اعمال کر کے انہوں نے اپنے آپ کو درست کر لیا ﴿وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ. وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ﴾ آپس میں حق اور بھلی بات کی ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں۔ یہاں اسی نسبت پر اس سورۃ کو پیش کیا ہے۔ تواصی کا معنیٰ کسی کو بڑی تاکید کے ساتھ کوئی کام کرنے کے لئے کہنا۔ وصیت خاص طور پر اس نصیحت کو کہا جاتا ہے جو کوئی شخص اپنے آخری وقت میں موت کے قریب اپنے متعلقین کو کیا کرتا ہے مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی اہم بات ہے جو اخیر وقت میں جاتے جاتے بڑی تاکید کے ساتھ کہہ رہا ہے۔ تواصی کا لفظ ہر اس بات کے لئے بولا جاتا ہے جو کوئی آدمی کسی کو بڑی تاکید اور اہمیت کے ساتھ پیش کر رہا ہو۔ تو معنیٰ یہ ہوئے کہ وہ آپس میں تلقین وتاکید کرتے ہیں حق کی اور آپس میں ایک دوسرے کو تلقین وتاکید کرتے ہیں صبر کی۔ نیکی کے کاموں میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا؛ یہ حق کی تاکید کرنے میں داخل ہے، اس نسبت سے یہاں لائے ہیں۔

﴿امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد﴾

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سورت کے سلسلہ میں ایک بات ارشاد فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اس چھوٹی سی سورت کے اندر غور وفکر کرنے کے معاملہ میں بڑی غفلت برت رہے ہیں۔ اگر آدمی اس سورت کے اوپر غور وفکر کرے اور سوچے تو وہ اپنی زندگی کے اوقات کو کارآمد بنا سکتا ہے۔ اور اگر اس کی طرف سے غفلت برتے تو اللہ تعالیٰ نے وقت کی شکل میں جو دولت اور سرمایہ عطا فرمایا ہے اس کو یوں ہی ضائع کر دے گا۔ اکثر لوگ اس

معاملے میں غفلت برتتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے اس سرمایہ سے پورے طور پر فائدہ نہیں اُٹھاتے، اس لئے گھاٹے اور نقصان میں رہتے ہیں۔

جہاد کا سامان فراہم کر دینا

عن أبی عبدالرحمن زیدبن حارث الجهنی رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ جَهَّزَ غَازِ يًافِيُ سَبِيُلِ اللهِ فَقَدُغَزٰى. وَمَنُ خَلَفَ غَازِيًافِيُ أَهُلِهٖ بِخَيُرٍ فَقَدُغَزٰى.

حضرت ابو عبدالرحمٰن زید بن حارث جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے جا رہا ہے اس کو کوئی آدمی سامان تیار کر کے دے یعنی جہاد کے لئے جو جا رہا ہے اس کے پاس جہاد کا سامان نہیں ہے، تلوار، ہتھیار اور جن چیزوں کی جہاد میں ضرورت پیش آتی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہے، دوسرا آدمی صاحبِ حیثیت اور صاحبِ ثروت ہے وہ اس کی مدد کرتا ہے اور اس کے لئے جہاد کا سامان تیار کر دیتا ہے، تو خود اس نے بھی غزوہ میں شرکت کی۔ گویا کسی کو جہاد کا سامان تیار کر کے دینا ایسا ہی ہے جیسا خود جہاد کے اندر شرکت کرنا۔ نیکی کے کام میں اس نے مدد کی اور تعاون کیا اس لئے یہ بشارت ہے۔

﴿وَمَنُ خَلَفَ غَازِيًافِيُ أَهُلِهٖ بِخَيُرٍ فَقَدُغَزٰى﴾ اور جو آدمی کسی غازی اور اللہ کے راستے میں نکلنے والے کے گھر والوں کی بھلائی کے ساتھ خبر گیری کرے، اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا جہاد میں شرکت کرنے والے غازی کو ملتا ہے۔ خلف کا حقیقی ترجمہ ہے اس کی جانشینی کرنا۔ یعنی صاحبِ خانہ موجود تھا تو اپنے گھر کی ضروریات پوری کرتا رہتا تھا کہ بازار جا کر ضروریات لاتا تھا یا اور کوئی ضروریات ہوتی تھی اس کو پورا کرتا تھا، اب اس کی عدم

موجودگی میں گھر والوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا وہ اہتمام کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر نیکی کے کام کے اندر یہی قاعدہ ہے کہ کوئی آدمی کسی بھی بھلائی کے کام کے اندر لگا ہوا ہو، اور اس میں مشغول ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بعض ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہے، اور کوئی دوسرا آدمی اس کا تعاون اور مدد کرتا ہے؛ تو بڑی فضیلتوں کو حاصل کرتا ہے۔

مثلاً ایک آدمی جو پڑھنے پڑھانے میں لگا ہوا ہے اور اس وجہ سے وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، اب کوئی آدمی اس کا تعاون کر کے اس کی ضرورتیں پوری کر رہا ہے اسی طرح کوئی آدمی ہے جو تبلیغ میں لگا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، اب کوئی دوسرا اس میں اس کا تعاون کر رہا ہے، تو اس عمل میں لگنے والے کو جتنا ثواب ملے گا؛ اتنا ہی اس مدد کرنے والے کو بھی ملے گا۔ ہر کارِ خیر میں یہ قاعدہ جاری ہو سکتا ہے

ایک بھائی دین کا کام کرے اور دوسرا کاروبار

عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ بَعَثَ بَعْثًا اِلیٰ بَنِیْ لَحْیَانَ مِنْ ھُذَیْلٍ فَقَالَ: لِیَنْبَعِثْ مِنْ کُلِّ رَجُلَیْنِ أَحَدُھُمَا وَالْأَجْرُ بَیْنَھُمَا. (رواہ مسلم)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک لشکر قبیلۂ ہذیل کی ایک شاخ بنو لحیان کی طرف بھیجا۔ بنو لحیان نے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کے بھیجے ہوئے بعض صحابہ کرام جو ایک دستہ کی شکل میں گئے تھے ان کو قتل کرنے میں بھی انہوں نے حصہ لیا تھا۔ ان کے ساتھ جہاد کرنے کے واسطے اور ان کے شر کو دفع کرنے کے واسطے نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک لشکر تیار کیا۔ اس موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

دو آدمیوں کے درمیان ایک آدمی تیار ہو جائے یعنی گھر میں دو آدمی ہیں تو ایک آدمی گھر کے کام کاج کے لئے رہے اور دوسرا جہاد کے لئے جاوے۔ثواب دونوں کو ملے گا۔اس لئے کہ جو گھر پر رہ رہا ہے، وہ گھر کی ضروریات کی تکمیل کر رہا ہے، کاروبار کو سنبھال رہا ہے۔اگر یہ نہ ہوتا تو کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔اس معنٰی کر یہ بھی اُس جانے والے کی مدد کر رہا ہے،لہٰذا جانے والے کو جتنا ثواب ملے گا؛ اتنا ہی ثواب اس کو بھی ملے گا۔یہی قاعدہ ہر کارِ خیر میں آپ جاری کر سکتے ہیں۔کسی بھی نیکی کے کام کے لئے کوئی آدمی اپنے آپ کو فارغ کر لے اور اس کی ضروریات کی تکمیل کیلئے دوسرا تعاون کرے۔

﴿دوطرفہ سلپنگ پارٹنرشپ (Sleeping Partner ship)﴾

مثلاً ایک کاروبار ہے اور دو بھائی ہیں،اب ان دو میں سے ایک نے کاروبار کو سنبھال لیا،دوسرے کو تعلیم کے لئے یا تبلیغ کے لئے فارغ کر دیا۔یا اور کسی کارِ خیر کے لئے فارغ کر دیا۔لوگوں کی خدمت کے لئے ضرورت تھی تو اس کو کہا: تم اس میں لگے رہو؛ کاروبار کو مَیں سنبھال رہا ہوں۔تو اس صورت میں اس خدمت کے نتیجے میں اس کو جتنا بھی ثواب ملے گا؛ وہ سارے ثواب میں اس کے ساتھ یہ بھی شریک رہے گا۔یوں سمجھئے کہ آپ نے اس کو اپنے کاروبار میں سلپنگ پارٹنر (Sleeping Partner) بنایا ہے،تو اس نے اپنے ثواب میں آپ کو سلپنگ پارٹنر (Sleeping Partner) بنایا ہے۔سیدھی بات ہے جیسے وہ کام کر رہا ہے تو اس کو جو ثواب مل رہا ہے،اس میں آپ اس کے پارٹنر ہیں۔اور آپ کاروبار سنبھال رہے ہیں اور اس میں جو منافعہ ہو رہا ہے؛ اس میں وہ آپ کا پارٹنر ہے۔اب کون بڑا بدلہ دے رہا ہے؛ یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔

﴿کون کسے کھلاتا ہے؟﴾

آج کل یہ معاملہ ایسا ہو چکا ہے کہ کوئی آدمی کسی دینی کام میں لگا ہوا ہو، تو اس کے گھر کے وہ افراد جو کاروبار کو سنبھالے ہوئے ہیں، اس پر احسان بھی بہت جتلاتے ہیں اور ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں، منہ بھی چڑھاتے ہیں کہ یہ تو کچھ مدد نہیں کرتا۔ حالانکہ ان کو اِس کا احسان ماننا چاہیے کہ یہ کاروبار کو سنبھال کر اُس پر جتنا احسان کر رہے ہیں، اس سے زیادہ وہ اُس کام میں لگ کر اِن پر احسان کر رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ جو ثواب کما رہا ہے یہ لوگ تو کما نہیں سکتے، اور اس کا کام وہ کر رہے ہیں تو اِس کے ثواب میں وہ بھی پورے پورے شریک ہو رہے ہیں۔ یہ بڑی اونچی چیز ہے، اور اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

دیکھئے! نبی کریم ﷺ کی تعلیمات ایسی ہیں کہ ہماری عقلیں ان کو نہیں سمجھ سکتیں۔ مثلاً ایک گھر میں کوئی بچہ ہے، یا کوئی بیمار ہے، کمزور ہے، یا کوئی بوڑھا ہے، اور وہ بچہ ہونے کی وجہ سے یا بیمار و کمزور ہونے کی وجہ سے یا بوڑھاپے کی وجہ سے کمانے سے قاصر ہے، دوسرا کما رہا ہے اور اس کو کھلا رہا ہے۔ تو ظاہر میں تو ہم یوں سمجھ رہے ہیں کہ کمانے والا جو محنت مزدوری کر کے اس کی ضرورتیں پوری کر رہا ہے؛ وہ اس کو کھلا رہا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے: ﴿اِنَّكُمْ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَآئِكُمْ﴾ تم کو روزی ملتی ہے تمہارے کمزوروں کی وجہ سے۔ تو حضور اکرم ﷺ ہم کو یوں فرما رہے ہیں کہ تم اس کو نہیں کھلا رہے ہو بلکہ وہ تم کو کھلا رہا ہے، اگر یہ یقین پیدا ہو جائے تو پھر گھروں میں آپس کی نااتفاقیاں، ناچاقیاں، لڑائی جھگڑے جو عورتوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں؛ وہ سب ختم ہو جائیں۔ ہمارے یہاں معاشرے میں ایسا ہوتا ہے کہ دو بھائی ہیں، ایک زیادہ کام کرتا ہے تو اس کی بیوی اس کے

پیچھے لگی رہے گی اور یہ بھی تھوڑے دنوں کے بعد وہی بات شروع کر دیتا ہے۔ ہمارے سماج و معاشرے کے خاندانوں میں اکثر جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

حضرت شیخ کے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ

آپ بیتی میں حضرت شیخؒ نے لکھا ہے: حضرت کے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ جو حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے بڑے بھائی ہوتے ہیں، ان کا کتب خانہ "کتب خانہ یحیوی" کے نام سے آج بھی ہے، حضرت مولانا طلحہ صاحب کے یہاں جاتے ہیں تو راستہ میں پڑتا ہے۔ وہ مولانا یحییٰ صاحب کا قائم کیا ہوا کتب خانہ ہے۔ حضرت کتابیں چھپواتے تھے اور فروخت کرتے تھے اور دوسرے بھی کام کرتے تھے، تھوڑا سا وقت اس میں بھی لگاتے تھے، حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ کی عادت یہ تھی کہ کہیں سے آڈر آیا تو کتابوں کا پیکیٹ بھی بنا رہے ہیں اور قرآنِ پاک کی تلاوت بھی کر رہے ہیں اور حساب کتاب کے لئے ایک منشی صاحب کو رکھ رکھا تھا۔ مولانا الیاس صاحبؒ اس زمانے میں پڑھتے تھے، وہ وہیں کتب خانہ ہی میں کتاب لے کر بیٹھتے تھے اور کبھی ایسے ہی بیٹھتے تھے۔ اب مولانا یحییٰ صاحب پیکیٹ باندھ رہے ہیں لیکن مولانا الیاس صاحب اس میں کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں، یہ سب کام مولانا یحییٰ صاحب خود ہی نمٹاتے تھے۔ ایک مرتبہ منشی جی کی زبان سے نکل گیا: مولوی الیاس دیکھتے ہو کہ بڑے بھائی کام کر رہے ہیں، کبھی تو ایک آدھ پیکیٹ باندھنے میں حصہ لے لو۔ یہ جملہ جب مولانا یحییٰ صاحب نے سنا تو غصہ ہو گئے، اور اتنا غصہ ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی اتنا غصہ نہیں ہوئے تھے اور بہت سخت تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: آئندہ کبھی ایسا جملہ تمہاری زبان سے نہیں نکلنا چاہیے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں کوئی ان کے لئے کر رہا ہوں، بلکہ میں تو یوں

سمجھتا ہوں کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے روزی دے رہے ہیں۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنَّکُمْ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَآئِکُمْ﴾

آج اگر یہ بات ہمارے ذہنوں میں آجائے تو ہمارے معاشرے میں جتنے بھی جھگڑے ہوتے ہیں اس میں سے آدھے پونے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ یہ پارٹنرشپ والی ایک چیز یادر ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو سلیپنگ پارٹنر (Sleeping Partner) بنارہے ہیں۔

﴿نابالغ کو حج کرانے پر والدین کو بھی ثواب﴾

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ لَقِیَ رَکْبًا بِالرَّوْحَآءِ، فَقَالَ: مَنِ الْقَوْمُ؟ قَالُوْا: اَلْمُسْلِمُوْنَ. فَقَالُوْا: مَنْ أَنْتَ؟ قَالَ: رَسُوْلُ اللهِ. فَرَفَعَتْ اِلَیْهِ امْرَأَۃٌ صَبِیًّا، فَقَالَتْ: أَلِهٰذَا حَجٌّ؟ قَالَ: نَعَمْ وَلَکِ أَجْرٌ. (رواہ مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (یہ حجۃ الوداع ہی کا واقعہ ہے) نبی کریم ﷺ حج میں تشریف لے جا رہے تھے، مقامِ روحاء میں ایک قافلہ آپ سے ملا۔ حضور نے ان قافلے والوں سے پوچھا: ﴿مَنِ الْقَوْمُ؟﴾ تم کون لوگ ہو؟ یعنی تمہارا کونسے قبیلے سے تعلق ہے؟ یا تم کون لوگ ہو؟ مسلمان ہو یا مشرک ہو؟ انہوں نے کہا: ﴿اَلْمُسْلِمُوْنَ﴾ ہم تو مسلمان ہیں۔ وہ حضور ﷺ کو نہیں جانتے تھے اس لئے انہوں نے پوچھا: ﴿مَنْ أَنْتَ؟﴾ آپ کون ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے جواب دیا ﴿رسولُ اللہ﴾ میں اللہ کا رسول ہوں۔ وہ قافلہ بھی حج کے لئے جا رہا تھا، جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ نبی کریم ﷺ ہیں تو اس قافلہ میں سے ایک عورت نکلی، جس کے پاس چھوٹا دودھ پیتا بچہ تھا۔ اس بچے کو اس عورت نے ہاتھ میں اُٹھا کر

نبی کریم ﷺ کی طرف بڑھایا اور پوچھا: ﴿أَلِهٰـذَا حَـجٌّ﴾ اے اللہ کے رسول! کیا اس کا بھی حج ہے؟ یعنی اس بچہ کا حج ہوسکتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿نَـعَمْ وَلَکِ أَجْرٌ﴾ ہاں! اس کا بھی حج ہوسکتا ہے اور اس کو حج کراؤ گی اور اپنے ساتھ حج کے افعال میں اس کو شریک رکھو گی، طواف کروگی تو اپنے ساتھ اُٹھا کر کروگی، سعی کروگی تو اپنے ساتھ اُٹھا کر کروگی؛ تو اس صورت میں تم کو بھی اس کے حج کے اندر ثواب ملے گا۔ گویا نیکی کے کام میں حصہ لیا۔

﴿نابالغ کا حج معتبر ہے؟﴾

چھوٹے بچوں کا بھی حج ہوجاتا ہے اگرچہ فرض ادا نہیں ہوتا۔ بچپن میں کیا ہوا حج نفل ہوتا ہے، بالغ ہوجانے کے بعد اللہ تعالیٰ استطاعت دے تو پھر وہ حج فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ باقی اتنا ضرور ہے کہ بچپن میں کیا ہوا حج معتبر ہوجاتا ہے، اور اس کی بنیاد پر آپ اس کو حاجی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا حاجی ہے کہ اس کا فریضہ ابھی ادا نہیں ہوا، وہ نفل کا درجہ رکھتا ہے جیسے چھوٹے بچے نماز پڑھتے ہیں اور سات سال، دس سال کی عمر میں نماز کا حکم بھی دیا گیا ہے تو نمازی ضرور کہلائیں گے، لیکن ان پر ابھی فرض نہیں ہے۔

یہاں تو یہ روایت اس لئے لائے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اس عورت کو جواب میں فرمایا: ﴿نَـعَمْ وَلَکِ أَجْرٌ﴾ ہاں! اس کا بھی حج ہے یعنی افعال میں تم اس کو اپنے ساتھ شریک کرلوگی تو اس کا بھی حج ہوجائے گا اور تم کو بھی اس کی وجہ سے ثواب ملے گا۔

﴿خزانچی کو بھی چند شرائط کے ساتھ صدقہ کا ثواب ملتا ہے﴾

عن أبی موسیٰ الأشعری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ انـه قال: اَلْخَازِنُ الْمُسْلِمُ الْأَمِیْنُ الَّذِیْ یُنْفِذُ مَا أُمِرَ بِهٖ، فَیُعْطِیْهِ کَامِلاً مُوَفَّرًا طَیِّبَةً بِهٖ نَفْسُهُ، فَیَدْفَعُهُ اِلَی الَّذِیْ أُمِرَ لَهٗ بِهٖ أَحَدُ الْمُتَصَدِّقِیْنَ

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ خزانچی جو مسلمان ہے، امانت دار بھی ہے، اس کو سیٹھ اور مالک کی طرف سے جو حکم دیا جاتا ہے اس کو خوش دلی سے پورا کرتا ہے تو وہ بھی صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو مالک اور سیٹھ کی طرف سے مال کا نگران بنایا جاتا ہے، تو مالک کی طرف سے دیئے جانے والے آرڈر واحکام ہوتے ہیں کہ بھئی! یہاں اتنا دینا ہے لیکن وہ پورا نہیں دیتا، کچھ نہ کچھ تو اس میں گڑبڑ، کوتاہی اور کمی کر دیتا ہے۔ مثلاً کوئی مانگنے والا آیا تو مالک نے کہا کہ اس کو سو دے دو، تو وہ سو کے بجائے پچاس دیتا ہے، یا مدرسے کی طرف سے کوئی لینے کے واسطے آیا تو مالک نے کہا کہ اس کو پانچ سو روپے دے دو، تو وہ خازن بجائے پانچ سو کے تین سو دے کر بات ترخانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ عام طور پر خازن کے مزاج اس نوع کے ہوتے ہیں، اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ اس کو جو حکم دیا گیا اس کو نافذ کرتا ہے۔ ﴿فَیُعْطِیْهِ کَامِلاً مُوَفَّراً﴾ کسی کارِ خیر میں جتنا دینے کے لئے کہا گیا وہ پورے پورا دیتا ہے ﴿طَیِّبَةً بِهِ نَفْسُهُ﴾ ساتھ میں خود بھی پوری خوش دلی کے ساتھ دیتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی سیٹھ کے دباؤ کی وجہ سے دے دیتا ہے کہ مالک کہہ رہا ہے لیکن اس کا جی کڑھتا ہے، اس کے دل میں یوں آتا ہے کہ اس کو اتنا کیوں دے رہے ہیں لیکن تابع ہونے کی وجہ سے مجبور ہے، اس لئے دے رہا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جتنا دینے کے لئے کہا گیا وہ پورے پورا دیتا ہے اور خوش دلی کے ساتھ دیتا ہے۔ تو اصل صدقہ کرنے والا تو سیٹھ اور مالک ہے جس نے دینے کے واسطے کہا، لیکن یہ بھی دو صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہے۔ یعنی جتنا ثواب سیٹھ کو ملا اتنا ہی اس کو بھی ملے گا، لیکن اس کے لئے چند قیدیں آئیں کہ اول تو یہ کہ وہ مسلمان اور امین ہو، دوسرا یہ کہ جو دینے کے لئے کہا گیا وہ پورے پورا

دیتا ہو، اور تیسری شرط یہ ہے کہ خوش دلی کے ساتھ دیتا ہو۔ یہ تین باتیں اگر اس کے اندر پائی جاتی ہیں تو اس صورت کے اندر اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا دینے والے مالک کو ملتا ہے اور ثواب دینے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، کوئی کہے کہ پیسہ تو اس مالک کا تھا لیکن خازن ہونے کی وجہ سے اس کو بھی گراں گذرتا ہے اور جب وہ خوش دلی کے ساتھ اس کارِ خیر میں شرکت کرے گا تو اصل کام کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ثواب دیا جاتا ہے وہ تو دل کی نیت کے اوپر ہوتا ہے، آدمی کے جذبے کے اوپر ہوتا ہے کہ کس جذبے سے دے رہا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب سیٹھ نے دیا اور یہ بھی اسی مقدار سے خوش دلی کے ساتھ ادا کر رہا ہے تو جو جذبہ سیٹھ کا وہی جذبہ تقریباً اس کا بھی ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے اس کو بھی اتنا ہی اجر دیا جاتا ہے، اجر اللہ تعالیٰ کی دین ہے، جس کو جتنا چاہیں دیں۔ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ اِس کو مال دینے پر اور اُس کو جذبے اور نیت کی وجہ سے اتنا دیا گیا۔

یہاں تو اس لئے لائے ہیں کہ اس نیکی کے کام میں اس نے برابر کا حصہ لیا اس لئے اجر و ثواب کا حقدار ہوا۔ معلوم ہوا کہ نیکی کے کاموں میں آپ جتنا بھی تعاون کریں گے، ایک دوسرے کو تقویت پہنچائیں گے، سپورٹ کریں گے؛ تو آپ کو بھی اجر و ثواب کے اندر شرکت ملے گی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

اَلنَّصِيُحَةُ

(خیرخواہی اوربھلائی)

﴾اقتباس﴿

اسلام نے جن اوصاف سے متصف ہونے کی تعلیم دی ہے اور جن چیزوں کو آپسی معاشرت کو قائم کرنے کے لئے ضروری قرار دیا ہے؛ ان میں سے ایک وصف نصیحت یعنی خیر خواہی بھی ہے

حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے پورے معاشرے کو ایک جسم سے تعبیر کیا ہے کہ جسم میں مختلف اعضاء ہوتے ہیں اور وہ اعضاء ایک دوسرے سے اس طرح منسلک اور جڑے ہوئے ہیں اور ہر عضو کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسا تعلق اور رشتہ ہے کہ اگر کسی بھی عضو کو تھوڑی سی تکلیف پہنچ جائے تو دوسرے سارے اعضاء اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں

مؤمنین کا حال بھی آپس میں اسی طرح ہونا چاہیے

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

تم میں سے کوئی آدمی کامل مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد.

فأعوذباللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

قال اللہ تعالیٰ: ﴿اِنَّمَاالْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ﴾

﴿ایک جامع لفظ﴾

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے ﴿بَابٌ فِی النَّصِیْحَۃِ﴾ ''نصیحۃ'' عربی لفظ ہے۔ عام طور پر اردو میں اس کا ترجمہ خیر خواہی کرتے ہیں، کسی کے لئے بھلائی چاہنا۔ اگرچہ اردو میں جو تعبیر اختیار کی گئی ہے وہ اس لفظ کے پورے معنٰی کو ظاہر نہیں کرتی۔ جیسا کہ لفظ ''الفلاح'' ہے۔ اذان میں آتا ہے ''حی علی الفلاح''۔ آؤ کامیابی کے لئے۔ تو اس لفظ ''الفلاح'' کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک جامع لفظ ہے۔

جامع کا مطلب یہ ہے کہ اس میں الفاظ کم ہوں اور معانی اور مفہوم بہت وسیع ہو۔ لکھا ہے کہ لفظِ فلاح ایسا جامع لفظ ہے کہ عربی یا کسی دوسری زبان میں کوئی دوسرا ایسا لفظ نہیں جو اس کے معنٰی کو پورے طور پر ظاہر کرے، بلکہ اس کے معنٰی اور مفہوم کو بتلانے کیلئے کئی الفاظ لانے پڑیں گے، ایک لفظ سے کام نہیں چلے گا۔ اسی طرح لفظِ ''النصیحۃ'' کے متعلق بھی لکھا ہے کہ یہ کلمہ بھی بڑا جامع ہے، اس کے الفاظ بہت مختصر اور کم ہونے کے باوجود

اس کے معانی اور مفاہیم بہت وسیع ہیں۔اسی لئے کہا گیا ہے:﴿حِيَازَةُ الْخَيْرِ لِلْمَنْصُوْحِ لَهٗ﴾ یعنی جس کی خیر خواہی کر رہے ہیں اس کے لئے دنیوی، اخروی، ظاہری، باطنی ہر طرح کی بھلائی چاہنا۔''نصیحت'' کا یہ مفہوم ادا کیا گیا ہے۔اردو میں اس کے لئے جو لفظِ خیر خواہی استعمال کیا گیا ہے وہ اس لفظ''نصیحت'' کے بہت محدود مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

﴿معاشرت کو قائم کرنے والا ایک ضروری وصف﴾

اسلام نے جن اوصاف سے متصف ہونے کی تعلیم دی ہے اور جن چیزوں کو آپسی معاشرت کو قائم کرنے کے لئے ضروری قرار دیا ہے؛ ان میں سے ایک وصف نصیحت یعنی خیر خواہی بھی ہے۔اس بات کو واضح کرنے کے لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ پاک کی آیتوں کے دو تین ٹکڑے پیش کئے ہیں۔ایک آیت ہے﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔گویا اخوت اور بھائی چارے کا تقاضہ یہ ہے کہ بھائی اپنے بھائی کے لئے خیر و بھلائی چاہے۔

بلکہ حدیثِ پاک میں تو حضورِ اکرم ﷺ نے مؤمنین کو ایک جسم کے اعضاء سے تعبیر کیا ہے۔(بخاری شریف،۵۵۵۲) ایک جسم کے مختلف اعضاء ہوتے ہیں اسی طرح پوری ملت ایک جسم کے مانند ہے اور اس کے جتنے بھی افراد ہیں وہ ایک جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہوتے ہیں۔اور حضور اکرم ﷺ نے اس کی وضاحت کے طور پر فرمایا کہ جسم کے کسی عضو میں تکلیف ہو جائے مثلاً انگلی پر ورم آ گیا اور اس میں خون و پیپ بھر گیا تو یہ انگلی ایک چھوٹا سا عضو ہے اور دوسرے اعضاء آنکھ وغیرہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ وزنی بھی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی تکلیف کی وجہ سے دوسرے اعضاء یہ نہیں سوچتے کہ یہ تکلیف تو انگلی کو ہے، ہمارا

کیا ہے، ہم تو آرام سے ہیں۔ وہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ جب انگلی کو تکلیف ہوتی ہے تو اس تکلیف کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا پورا جسم پریشان ہو جاتا ہے ﴿اَلْجَسَدُ كُلُّهُ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى﴾ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کا پورا جسم اس ایک عضو کی تھوڑی سی تکلیف کی وجہ سے بیداری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ انگلی میں دنبل نکل آیا تو پورا جسم آرام سے رہے، اور آنکھ کہے کہ میں تو سوتی ہوں، انگلی کو تکلیف ہے تو وہ جانے، دانت کہے کہ مجھے کیا ہے۔ بلکہ اس چھوٹی سی تکلیف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے پورے معاشرے کو ایک جسم سے تعبیر کیا ہے کہ جسم میں مختلف اعضاء ہوتے ہیں اور وہ اعضاء ایک دوسرے سے اس طرح منسلک اور جڑے ہوئے ہیں اور ہر عضو کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسا تعلق اور رشتہ ہے کہ اگر کسی بھی عضو کو تھوڑی سی تکلیف پہنچ جائے تو دوسرے سارے اعضاء اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔ مؤمنین کا حال بھی آپس میں اسی طرح ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ایک مؤمن کو کوئی تکلیف پہنچی، اس کے اوپر کوئی مصیبت آئی، تو دوسرے مؤمنین اس کی طرف سے بے التفاتی و بے توجہی برتیں کہ اس کے اوپر مصیبت آئی ہے، ہمارا کیا ہے۔ ایسا نہ ہو بلکہ وہ یوں سمجھیں کہ اس کی مصیبت ہماری مصیبت ہے۔ اس آیت کو اسی لئے لائے ہیں۔

﴿ہر ایک کی بھلائی چاہنا؛ نبیوں کے اوصاف میں سے ہے﴾

دوسرا ارشادِ باری پیش کیا: اِخْبَاراً عَنْ نُوحٍ علیہ السلام: ﴿وَأَنْصَحُ لَكُمْ﴾

اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے قرآنِ پاک میں

ان کا قول نقل فرمایا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں، خیر خواہی کرتا ہوں۔ گویا اپنے خاندان، اپنے معاشرے اور اپنی ملت کی بھلائی چاہنا؛ یہ نبیوں کے اوصاف میں سے ہے۔ چنانچہ اسی خیر خواہی کا نتیجہ تھا کہ ساڑھے نوسو (۹۵۰) سال تک حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو ایمان کی دعوت دیتے رہے، کوئی ایک دو دن کا مسئلہ نہیں تھا۔ ہمارا معاملہ ہوتا تو ہم کیا کرتے، دوسروں کو چھوڑ یئے، اپنے گھر کے فرد کو دو چار وقت سمجھاتے ہیں پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی کے باپ کو کہا جاتا ہے کہ آپ کا بیٹا یہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مَیں نے تو اس کو بہت سمجھایا؛ لیکن نہیں مانتا تو چھوڑ دیا۔ باپ بھی بیٹے کے معاملے میں ایسا بولتا ہے۔ حالانکہ اس نے دو چار دن، دو چار ہفتے، دو چار مہینے تک سمجھایا ہوگا، لیکن اس کے بعد وہ اس سے مایوس ہو کر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن ہر نبی کو اپنی امت کے ساتھ جو تعلق ہوتا ہے وہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ جو تعلق ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ساڑھے نوسو (۹۵۰) سال تک سمجھایا، اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں برتی، بلکہ برابر سمجھاتے رہے، قرآنِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿لیلاً ونهاراً﴾ رات و دن سمجھایا۔ ایسا نہیں کہ کسی خاص وقت میں سمجھاتے ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر شراح لکھتے ہیں، مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہاں مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، عربی داں جانتے ہیں کہ فعل حدوث کو بتلانے کے لئے آتا ہے، گویا حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے اپنے قوم کی خیر خواہی کا سلسلہ برابر چلتا رہا۔

اور حضرت ہود علیہ السلام کا جملہ نقل کیا: ﴿أَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴾ مَیں تمہارا خیر خواہ

ہوں اور امانت دار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام پہنچانے کے لئے دیے گئے؛ ان کو پوری امانت کے ساتھ تم تک پہنچا رہا ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ تمہاری خیر و بھلائی بھی چاہتا ہوں۔

﴿دین کی حقیقت مختصر الفاظ میں﴾

عن أبی رقیّة تمیم بن أوس الداری رضی اللہ عنہ ان النّبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قالَ: اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ. قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ: لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِهِمْ. (رواہ مسلم)

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ یہ صحابہ میں سے ہیں، ۹ھ میں ایمان لائے ہیں اور مسلم شریف میں ایک روایت ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حوالے سے بھی ذکر فرمائی ہے۔ اسی لئے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ ان کی ایک خصوصیت ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چیز ان سے نقل فرمائی ہے۔

وہ نقل فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ﴿اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ﴾ دین نام ہے خیر خواہی کا۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے دین کو خیر خواہی سے تعبیر فرمایا ہے۔ پورے دین کی حقیقت کیا ہے؟ اگر کوئی آدمی دین کی حقیقت کسی کے سامنے مختصر الفاظ میں پیش کرنا چاہے اور ایک لفظ میں یہ بتلانا چاہے کہ دین کیا ہے؛ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ﴿اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ﴾ دین نام ہے خیر خواہی کا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کی خیر خواہی؟ تو حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کس کیلئے خیر خواہی اور بھلائی چاہنا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے، اللہ کی کتاب کے لئے، اور مسلمانوں کے حکمرانوں کے لئے اور عوامِ مسلمین کے واسطے بھلائی چاہنا۔

﴿اللہ تعالیٰ کے لئے خیر خواہی کا کیا مطلب؟﴾

اللہ کے واسطے نصیحت وخیر خواہی کا مطلب کیا ہے؟ کتابوں میں اسے بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان لانا، توحید کا اقرار کرنا، اوامر کو بجالانا، نواہی سے بچنا، اللہ ہی کے واسطے کسی کے ساتھ محبت رکھنا اور اللہ ہی کے واسطے دشمناوٹ رکھنا۔

دیکھئے! اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد آدمی کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا رشتہ قائم ہوجاتا ہے کہ اس کی اپنی ذات کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے لئے نچھاور کردیتا ہے اور ختم کردیتا ہے۔ اب وہ جو بھی کرے گا اللہ تعالیٰ ہی کی کہی کرے گا۔ اس کی آنکھ وہی دیکھے گی جو اللہ تعالیٰ نے دیکھنے کے لئے کہا ہے۔ اس کے کان وہی سنیں گے جو اللہ تعالیٰ نے سننے کے لئے کہا ہے۔ اس کے ہاتھ وہی کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے پکڑنے کے لئے کہا ہے۔ اسی طریقہ سے کسی کے ساتھ دوستی دشمنی کا معاملہ آگیا تو وہاں بھی اپنی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاطر دوستی اور دشمنی کرے گا اسی لئے جو اللہ کے دوست ہیں انہیں کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں؛ ان کے ساتھ تعلق قائم نہیں کرتا۔ یہ ساری چیزیں ﴿اَلنُّصْحُ لِلّٰہِ﴾ میں داخل ہیں۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے خیر خواہی کے اندر جو چیزیں بتلائی گئیں ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ ان سب کا فائدہ بندہ ہی کو ملتا ہے۔ گویا اپنے ہی فائدہ کے لئے کرتا ہے۔ جیسے جتنی بھی عبادتیں ہیں وہ کہنے کو تو یہی ہے کہ بندہ ساری عبادتیں اللہ تعالیٰ کے واسطے کرتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو عبادت کا جو فائدہ اور ثمرہ ہے وہ اس عبادت کرنے والے کو ہی حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا

اسی طرح یہاں لفظ ''نصیحة''اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے استعمال کیا گیا ہے،اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خیر خواہی کے ذیل میں اس کی نسبت سے جو چیزیں کی جارہی ہیں ؛اس سے اللہ تعالیٰ کو فائدہ پہنچتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تو ان سب سے بہت زیادہ بلند و بالا ہے۔اس کے بدلے میں فائدہ تو انسان ہی کو پہنچے گا۔

﴿اللہ تعالیٰ کی کتاب کی خیر خواہی﴾

﴿وَلِكِتَابِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے لئے خیر خواہی یعنی قرآنِ پاک کی خیر خواہی۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی اس پر ایمان لائے،اس کی تلاوت کا جیسا حق ہے ویسی تلاوت کرے،ترتیل کے ساتھ،تصحیح حروف کا اہتمام کرے،اور ترتیل کے واسطے جو چیزیں ضروری ہیں ان سب کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنِ پاک کی تلاوت کرے۔قرانِ پاک میں جن چیزوں کا حکم دیا گیا ہے ان کو بجالائے،جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے اپنے آپ کو بچاوے۔قرانی اعمال کو اپنا مطمحِ نظر بنائے،قرانی اخلاق سے اپنے آپ کو مزین کرنے کی کوشش کرے۔قرآنی تعلیم کو لوگوں میں عام کرے،خود بھی سیکھے اور دوسروں کو بھی سکھائے،خود بھی پڑھنے کا اہتمام کرے،دوسروں کو بھی پڑھائے،یہ ساری چیزیں ﴿اَلنُّصْحُ لِكِتَابِهٖ﴾ میں داخل ہیں۔

﴿حکمرانوں کی خیر خواہی﴾

﴿وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ اور مسلمانوں کے حکمرانوں کے ساتھ خیر خواہی کرنا۔ائمہ امام کی جمع ہے،جس کا معنیٰ ہے پیشوا اور بڑے لوگ۔ائمہ سے مراد اکثروں نے تو یہی لیا ہے کہ حکمران طبقہ۔بعضوں نے علماء مراد لیا ہے۔حکمران ہوں یا علماء ہوں؛ دونوں کی

خیرخواہی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حکمران ہونے کی حیثیت سے جو صحیح احکام جاری کئے جائیں ان کی بجا آوری، اوران کی اطاعت وفرمانبرداری کا معاملہ کرنا، ان کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرنا اوران کی کوئی ایسی تعریف نہ کرے جس کی وجہ سے وہ غلط فہمی میں پڑ کر کسی برائی میں مبتلا ہو جائیں، اور لوگوں کو ان کی اطاعت وفرمانبرداری کی دعوت دیتا رہے کہ لوگ ان کے خلاف بغاوت نہ کریں۔ یہ ساری چیزیں اس میں آجاتی ہیں۔

اور علماء شریعت کے جن احکام کی طرف رہنمائی کریں ان کو ماننا اوران کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل پیرا ہونا۔ علماء بھی مسلمانوں کے دلوں کے حکمراں ہیں۔

﴿عام لوگوں کی خیرخواہی﴾

﴿وَعَامَّتِهِمْ﴾ اور عام مسلمانوں کی خیرخواہی وبھلائی چاہنا۔ اب ہر مسلمان کی بھلائی کا کیا مطلب ہے؟ اگر وہ کسی دینی کمزوری میں مبتلا ہے تو آپ اس کو اس سے دور کر کے بھلائی کی طرف لانے کی کوشش کیجیے، اور دنیوی اعتبار سے کسی مصیبت میں مبتلا ہے تو اس کا تعاون کیجیے۔ بیماری میں مبتلا ہے تو علاج معالجہ میں مدد کیجیے۔ اس طرح کی ہر چیز اس میں آجاتی ہے۔

﴿حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بیعت﴾

عن جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قَالَ: بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ. (متفق علیہ)

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر نماز کے قائم کرنے پر بیعت کی (بیعت کا مطلب ہے عہد کرنا، کسی کو گواہ بنا کر ایک قسم کا عہد و

پیمان اور وعدہ کیا جاتا ہے؛اس کو بیعت سے تعبیر کرتے ہیں) نماز کے لئے لفظ اقامت استعمال کیا جاتا ہے، نماز کو قائم کرنا۔قرآنِ پاک میں بھی اسی لفظ سے حکم دیا گیا ہے ﴿أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾ ”صَلُّوا الصَّلٰوةَ“ نہیں کہا کہ نماز پڑھو، بلکہ جہاں بھی آیا ہے وہاں اقامتِ صلٰوۃ آیا ہے۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ اقامت کا مطلب ہے کہ نماز کو کما حقہ ادا کرنا۔نماز کے تمام ارکان، واجبات، سنن ومستحبات کی رعایت کرتے ہوئے اگر کوئی آدمی نماز ادا کرتا ہے؛ تو اس کو اقامت کہتے ہیں۔تب ہی اس کا فائدہ بھی ہوگا۔

﴿وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ﴾ زکوٰۃ کے ادا کرنے پر بیعت کی۔اگر زکوۃ واجب ہے تو اس کو ادا کریں گے۔﴿وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ﴾ اور ہر مسلمان کی خیر خواہی و بھلائی کرنے کا عہد و پیمان کیا۔نصیحت کا مطلب اوپر بتلا چکا ہوں۔

﴿نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر کئے گئے عہد و پیمان کا لحاظ﴾

ان صحابی نے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر عہد کیا تھا کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کریں گے۔وہ اس عہد کا اتنا پاس ولحاظ کرتے تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کسی کو ایک گھوڑا خریدنے کے لئے وکیل بنایا۔وکیل تین سو درہم کے عوض میں گھوڑا خرید کر لایا۔مالک کو بھی ساتھ میں لایا تاکہ اس کو رقم دلوائی جائے۔انہوں نے گھوڑا دیکھ کر اس کے مالک سے یوں کہا: تمہارا گھوڑا تو تین سو درہم سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے، اس لئے تم بجائے تین سو کے چار سو کے عوض دینے پر راضی ہو؟ جب وہ تین سو پر راضی ہو گیا تھا تو چار سو پر کیوں راضی نہ ہوتا؟ اس نے کہا: ہاں! ٹھیک ہے۔پھر کہنے لگے: تمہارا گھوڑا تو مجھے چار سو درہم سے بھی زیادہ قیمتی

معلوم ہوتا ہے۔اس طرح چھ سو کہا، چھ سو سے سات سو کہا اور آخر میں آٹھ سو درہم میں وہ گھوڑا خریدا۔یعنی دوسروں کی خیر خواہی کا یہ حضرات اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ اپنا نقصان بھی اس کے لئے گوارا کرلیا جاتا تھا۔ یہ تھا وہ عہد و پیمان جو نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر کیا اور اس کا اتنا لحاظ کیا۔

﴿ یک جان، دو قالب ﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی کامل مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ یہ روایت پہلے بھی آ گئی ہے۔ یہاں بھی اسی نسبت سے لائے ہیں کہ گویا ہر مؤمن کو اپنے مؤمن بھائی کے ساتھ ایسا ہی رشتہ و تعلق ہونا چاہیے جیسے اپنی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اپنی ذات کی جیسی بھلائی چاہتا ہے، ہر وقت یہ سوچتا ہے کہ کس طرح میں اپنے آپ کو فائدہ پہنچاؤں؛ اسی طرح مؤمن بھائی کے لئے بھی خیر کا طلب گار رہے۔ گویا مؤمن کے ساتھ اس کا تعلق یک جان و دو قالب جیسا ہونا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق وسعادت نصیب فرمائے

الأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ

بھلائی کا حکم کرنا

اور

برائی سے روکنا

﴿ مجلس ۱ ﴾

شوّال المکرّم ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم فروری ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدًاعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًاكَثِيْرًا كَثِيْرًا. أمابعد.

وَلْتَكُن مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِوَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

امر بالمعروف کی تشریح

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے ﴿اَلْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ''معروف'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہے جانی پہچانی چیز، جس سے سب واقف ہوں۔ اور ''منکر'' نکارت سے ہے جس کا معنٰی ہے انجانی چیز، اُوپری چیز، جس سے کوئی واقف نہ ہو۔ نئی چیز کے لئے منکر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تو معروف کا مطلب ہوا وہ کام جو شریعت کی نگاہ میں جانے پہچانے ہوں، جن کے کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے، چاہے فرض کے طور پر کرنے کا حکم دیا ہو، چاہے واجب کے طور پر یا سنت کے طور پر یا مستحب کے طور پر۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام شریعت کی نگاہ میں مطلوب ہیں کہ یہ ہونے چاہئیں، ان کا درجہ فرض واجب سنت مستحب جو بھی ہو، ایسے کاموں کے لئے لفظِ معروف استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا یہ وہ کام ہیں جو شریعت کی نگاہ میں جانے پہچانے اور مشہور ہیں اور ہر وہ آدمی جو شریعت سے واقف ہے؛ اس کو جانتا ہے۔

اب امر بالمعروف کا مطلب یہ ہوا کہ بھلائی کی باتوں کا اور ایسی چیزوں کا حکم کرنا

جو شریعت کی نگاہ میں مطلوب ہیں، چاہے وہ عقائد کے قبیل سے ہوں اس کی لوگوں کو دعوت و ترغیب دینا؛ یہ بھی امر بالمعروف ہے۔ چاہے اخلاق کے قبیل سے ہوں، چاہے اعمال کے قبیل سے ہوں۔ نماز روزہ وغیرہ اس کی دعوت دینا؛ یہ بھی امر بالمعروف ہے۔ چاہے افعال کے قبیل سے ہوں، چاہے اقوال کے قبیل سے ہوں یعنی وہ چیز جو زبان سے کہی جاتی ہے اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا؛ یہ بھی امر بالمعروف ہے۔ پھر چاہے اس کا درجہ فرض کا ہو، واجب کا ہو، سنت کا ہو، مستحب کا ہو؛ یہ تمام چیزیں لفظِ معروف کے اندر آجاتی ہیں۔ ایسی چیزوں کی لوگوں کو دعوت دینا، ان کی طرف بلانا، اس کے لئے اس کے درجے کا لحاظ کرتے ہوئے آمادہ کرنا۔ فرض کے لئے فرض کے مطابق، واجب کے لئے واجب کے مطابق، سنت اور مستحب کے لئے اسی کے مناسب۔ ایسا بھی نہیں کہ کسی چیز کا شریعت میں جو درجہ مقرر ہے اس سے اس کو بڑھا دیا جائے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسی درجے میں رکھتے ہوئے لوگوں کو اس کی ترغیب دینا، اس کے لئے آمادہ کرنا، اس کی دعوت دینا، اس کی طرف بلانا؛ اس کا نام امر بالمعروف ہے۔ اسی کو ''بھلی بات کا حکم کرنا'' کہتے ہیں۔

نہی عن المنکر کا مطلب

دوسری چیز نہی عن المنکر ہے۔ منکر کا مطلب ابھی بتلایا کہ جو چیز انجانی ہو، اوپری ہو نامعلوم شئی؛ جس سے کوئی واقف نہ ہو۔ منکر نکیر وہ دو فرشتے جو قبر کے اندر سوال و جواب کیلئے آئیں گے، چونکہ ان کے چہرے ایسے ہوں گے جو مردے نے کبھی دیکھے نہیں ہوں گے، اس لئے یہ شکل وصورت اس کی نگاہوں میں بالکل اجنبی، اوپری، انجان سی ہوگی؛ اس لئے ان کو منکر نکیر کہا جاتا ہے۔

شریعت کی نگاہ میں ''منکر'' وہ کام کہلاتا ہے جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے

اب اس ممانعت کا درجہ جو بھی ہو، چاہے حرام ہو، یا مکروہ ہو اور پھر مکروہ میں تحریمی ہو یا تنزیہی ہو یا خلافِ اولیٰ ہو، جو بھی ہو لیکن شریعت اس کے ہونے کو پسند نہیں کرتی بلکہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ یہ کام نہ ہو؛ وہ تمام چیزیں منکر کے اندر آجاتی ہیں۔ اور پھر اس کا تعلق عقیدے سے ہو، اخلاق سے ہو، اعمال سے ہو، پھر اس میں بھی افعال سے ہو یا اقوال سے ہو۔ بہر حال! ہر وہ چیز جو شریعت کی نگاہ میں اس قابل ہے کہ اس سے منع کیا جائے، ممانعت کا درجہ جو بھی ہو، حرمت کا ہو، کراہیت کا ہو، عدمِ اولویت کا ہو؛ ایسی تمام چیزوں کے لئے منکر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ نہی عن المنکر کا مطلب یہ ہوا کہ جو چیزیں شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہیں ان سے لوگوں کو منع کرنا، روکنا، باز رکھنا۔ یہ نہی عن المنکر ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ دو چیزیں شریعت کی جان ہیں۔ پورے دین کا مدار اور بنیاد ہی ان دونوں پر ہے۔ جب تک یہ دو شعبے مکمل طور پر کام نہیں کریں گے وہاں تک دین باقی نہیں رہ سکتا، بلکہ وجود میں بھی نہیں آسکتا۔ اسی لئے قرآن وحدیث کے اندر اس امتِ مسلمہ کی جو خصوصیت بیان کی گئی ہے اس میں اسی چیز کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلّف کون؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں پہلی آیت لائے ہیں: ﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ تمہارے اندر ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی دعوت دے، بھلائی کی طرف لوگوں کو بلائے۔ خیر کا لفظ بھی عام ہے۔ بھلی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے؛ وہی لوگ دنیا اور آخرت میں پورے طور پر کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

اب ایک سوال ہے کہ کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ایک کے لئے ضروری

ہے یا کوئی مخصوص طبقہ اس کا مکلّف ہے؟ بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ امت کا ہر ہر فرد اپنی اپنی حیثیت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلّف ہے۔ اس صورت میں "مِنْکُمْ" میں لفظِ "مِنْ" جو آیا ہے تو علامہ کاظم نے فرمایا کہ یہ "مِنْ" بیانیہ ہے، تبعیضیہ نہیں ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ امت کے اندر سب ہی کے لئے ایسا کرنا ضروری نہیں، کچھ افراد ایسے ہوں جو اس کام کو انجام دیتے ہوں اور اس ڈیوٹی کو بجالاتے ہوں۔ ایسا ایک طبقہ ہر زمانہ میں ہر علاقے میں، ہر بستی میں، ہر محلے میں، ہر معاشرے کے اندر ہونا چاہیے۔ اگر ایسے لوگ ہیں تو اور لوگوں کی طرف سے ذمہ داری پوری ہو جائے گی۔ اور اگر ایسا ایک طبقہ بھی نہیں ہے تو سب ہی گنہ گار ہوں گے۔

فرضِ عین اور فرضِ کفایہ

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ذمہ داری تو سب ہی کی ہے البتہ اس کے بعد بھی کچھ لوگ اگر اس ذمہ داری کو پورا کرلیں گے تو سب کی ذمہ داری پوری ہو جائے گی، جیسے فرضِ کفایہ میں ہوتا ہے کہ یہ چیز فرض ہے، یہ کام ہونا چاہیے، سب کریں تب بھی ادا ہو جائے گا، اور اگر کچھ افراد کریں تب بھی کافی ہے، جیسے نمازِ جنازہ۔ ایک مسلمان کا انتقال ہو گیا تو شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ یہ مسلمان بغیر جنازہ کی نماز کے دفن نہیں ہوگا۔ اس کے جنازے کی نماز پڑھنا تمام لوگوں پر ضروری ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ بغیر نمازِ جنازہ کے دفن نہیں ہونا چاہیے، ایک نے پڑھ لی، دس نے پڑھ لی، بیس نے پڑھ لی، لاکھ نے پڑھ لی، اگر نمازِ جنازہ کے بعد دفن کیا گیا تو سب کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ اور اگر کسی ایک نے بھی نہیں پڑھی یہاں

تک کہ بغیر نمازِ جنازہ کے ہی اس کو دفن کرنے کی نوبت آئی؛ تو تمام لوگ گنہ گار ہوں گے۔ فرضِ کفایہ کا مطلب یہی ہوتا ہے۔

اور فرضِ عین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز ہونی چاہیے اور ہر ایک کو کرنا ضروری ہے، جیسے پانچ نمازیں: یہ ضروری ہیں اور ہر ایک کے لئے ضروری ہیں، اگر گھر کے اندر چار آدمی ہیں اور تین نے پڑھی ایک نے نہیں پڑھی تو نہ پڑھنے والا گنہ گار ہوگا۔ بہرحال! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق بھی علماء کے اندر دو رائیں ہیں۔

اس آیت میں لفظِ "مِـنْ" سے چونکہ اشکال ہوتا تھا اس لئے مفسرین نے یوں کہہ کر حل فرمادیا کہ یہ "مِنْ" تبعیض کے لئے نہیں ہے بلکہ بیان کے لئے ہے، لہٰذا ﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ کا مطلب یہ ہوا ﴿كُونُوا أُمَّةً يَّدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ تم ایسی امت بن جاؤ جو بھلائی کی دعوت دے۔

چنانچہ جو حضرات سب کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں وہ دلیل میں دوسری آیت پیش کرتے ہیں جو آگے آرہی ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ﴾ امتِ محمدیہ کو خطاب کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے فرمایا: تم بہترین امت ہو یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے عالَم کے اندر جتنی بھی امتیں پیدا فرمائی ہیں ان تمام میں سب سے بہتر امت امتِ محمدیہ ہے ﴿أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ان کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی بھلائی کے واسطے پیدا فرمایا ﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ﴾ بھلی باتوں کا حکم کرتے ہو ﴿وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

﴿امر بالمعروف کا حکم﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ درگذر کو لازم پکڑ لیجئے۔ اگر کسی آدمی کی طرف سے آپ کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا جائے تو آپ بجائے اس کے کہ اس سے انتقام اور بدلہ لیں؛ اس سے درگذر کر دیجیے۔ گویا ﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ درگذر کی عادت بنا لیجیے، آپ کا مزاج عَفْو و صَفْح کا ہونا چاہیے ﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ اور بھلی بات کا حکم کیجیے۔ یہاں امر بالمعروف کا تذکرہ آیا اس معنٰی کر یہ آیت لائے ہیں۔

﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ اور ناواقف لوگوں سے آپ اعراض اور درگذر کیجیے اگر کسی نادان کی طرف سے کوئی بات ایسی پیش آجائے تو اس نے اس حرکت کا ارتکاب نادانی کی وجہ سے کیا ہے، لہٰذا آپ اسکے ساتھ نادانی والا معاملہ نہ کریں بلکہ اس سے اعراض کریں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار اور ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یعنی امورِ خیر میں، بھلائی اور نیکی کی باتوں میں وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اس لئے ﴿أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ کہا گیا۔ ﴿يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ بھلی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔

﴿بنی اسرائیل کی حرکتیں اور ان پر انبیاءِ وقت کی زبانی پھٹکار﴾

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَالِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوْهُ. لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا، ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے لعنت کی گئی۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم یہ دیا گیا تھا کہ سنیچر کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں۔ ویسے بھی ان کے یہاں سنیچر کا دن عبادت کے واسطے خاص کیا گیا تھا اس لئے اس دن دوسرے کام نہیں کرنے چاہئیں، اور چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی آزمائش مقصود تھی، اس لئے قدرتی طور پر ہوتا یہ تھا کہ خاص سنیچر کے دن سمندر کے اندر جب جواڑ آتا تھا تو اس کے اندر خوب مچھلیاں آتی تھیں، دوسرے دنوں میں یہ بات نہیں ہوا کرتی تھی، اس وجہ سے یہ لوگ لالچ میں آگئے اور انہوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ جب پانی آتا تھا تو مچھلیاں آتی تھیں اور واپس لوٹنے کا جب وقت آتا تو وہ آڑ کر دیتے تھے تاکہ مچھلیاں جا نہ سکیں، پھر اس دن نہیں پکڑتے تھے بلکہ دوسرے دن پکڑتے تھے، پہلے سے جب روکے رکھا ہے تو اب شکار آسان ہو گیا۔ انہوں نے یہ ایک حیلہ شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس زمانہ کے صلحاء نے ان کو منع بھی کیا کہ ایسا مت کرو، لیکن انھوں نے نہیں مانا؛ تو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے بد دعا کی، اسی پر وہ لوگ بندر بنا دیئے گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنو اسرائیل کے بعض لوگوں نے مطالبہ کیا کہ آپ دعا کیجیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں سے بنا بنایا تیار دستر خوان آئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر وہ آئے تو اس کا حق ادا کرنا پڑے گا، اگر اس کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی اور ناشکری کا تمہاری طرف سے صدور ہوگا تو اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا۔ چنانچہ آپ کی دعا پر دستر خوان آیا اور ان لوگوں نے ناشکری کی، اس کا حق ادا نہیں کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان

کے لئے بددعا کی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ لوگ سور بنا دیئے گئے۔ اسی کو یہاں ذکر کیا ہے: ﴿ذَالِکَ بِمَا عَصَوْا وَ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ﴾ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی تھی اور وہ حد سے آگے بڑھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حدود مقرر کئے گئے تھے ان کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ ﴿کَانُوْا لَایَتَنَاهَوْنَ عَن مُنْکَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ﴾ جس برائی کا انھوں نے ارتکاب کیا، اس سے باز نہیں رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے بلکہ اصرار کرتے تھے۔

اگر کسی آدمی سے کوئی گناہ صادر ہو جائے اور پھر اس پر ندامت ہو، آئندہ کے لئے وہ اپنے آپ کو اس سے باز رکھے تو دوسری بات ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ آدمی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، اور جانتا بھی ہے کہ مَیں ایک نافرمانی اور گناہ کا کام کر رہا ہوں، لیکن نہ اس کو اس پر کوئی ندامت ہے، اور نہ آئندہ کے لئے باز رہنے کا عزم ہے، اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو اس سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ﴿لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ﴾ وہ لوگ بہت بری حرکت کرتے تھے۔

﴿کفر کی ممانعت مخصوص لہجہ میں﴾

﴿قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ﴾ باری تعالیٰ نے فرمایا: اے نبی! کہہ دیجیے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق یعنی دین آچکا ہے، جب ایمان کے تقاضوں پر اور دین کے اوپر عمل کی طرف آنے کی دعوت دی جا چکی ہے، اب تم میں سے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ یعنی اگر کوئی آدمی اس کے بعد بھی کفر کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، بلکہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

یہاں پر کفر کی اجازت نہیں دی گئی ہے بلکہ بطورِتہدید کے فرمایا ہے۔عربی زبان میں امر کا صیغہ مختلف معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔دوسری زبانوں میں بھی ایسا ہوتا ہے۔تو ایک معنی اور مقصد اس کا تہدید بھی ہے،کسی کو ڈرانے،دھمکانے کے لئے کہا جاتا ہے جیسے آپ کسی کو ایک مدت تک سمجھاتے رہیں کہ ایسا مت کرو،اس کے باوجود بھی وہ باز نہ آئے تو آپ کہتے ہیں!اچھا پھر کرو۔اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کام کے کرنے کی اجازت دی گئی،بلکہ دھمکانا مقصود ہوتا ہے کہ اب اگر کروگے تو اس کی سزا ضرور بھگتنی پڑے گی۔اسی طرح یہاں پر بھی ﴿فَلْیَکْفُرْ﴾ آیا ہے،کہ جو چاہے کفر کرے۔اس کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں ہے کہ کفر کی اجازت دی جارہی ہے۔بلکہ بطور دھمکی کے کہا جارہا ہے کہ اگر کوئی کفر کا ارتکاب کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو سزا بھگتنی پڑے گی۔گویا یہ بھی ایک معنیٰ کر نہی عن المنکر ہوا،اس لئے لائے ہیں۔

﴿لاگ لپیٹ اور مداہنت نہ ہو﴾

﴿فَاصْدَعْ بِمَاتُؤْمَرُ﴾ باری تعالیٰ نے فرمایا:اے نبی!جن چیزوں کا آپ کو بذریعۂ وحی حکم دیا گیا ہے ان کو لوگوں کے سامنے بالکل کھول دیجیے۔کھل کر صاف صاف اعلان کردیجیے ﴿فَاصْدَعْ﴾ کا معنیٰ کسی چیز کا صاف صاف اعلان کردینا،اس میں کوئی لاگ لپیٹ نہ رکھنا۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو جن چیزوں کا لوگوں تک پہنچانے کے لئے حکم دیا گیا ہے ان کے پہنچانے میں آپ کی طرف سے نعوذ باللہ کوئی مداہنت اور کمی نہیں ہونی چاہیے،بلکہ کھل کر ان کو لوگوں کے سامنے پیش کیجیے۔

﴿امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ؛عمومی عذاب سے محافظ﴾

﴿وَاَنْجَیْنَاالَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْءِ وَاَخَذْنَاالَّذِیْنَ ظَلَمُوْابِعَذَابٍ بَئِیْسٍ بِمَاکَانُوْا یَفْسُقُوْنَ﴾ باری تعالیٰ نے فرمایا: جولوگ برائی سے منع کرتے تھےاور روکتے تھے، ہم نے ان کونجات دے دی۔اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، گناہوں کاارتکاب کیا تھاان کو بڑے سخت اور دردناک عذاب کے ذریعہ سے پکڑا، ان کی اس بدکاری کی وجہ سے جووہ کرتے تھے۔

دیکھو!ایک بات ہے کہ اگر معاشرہ میں کسی برائی کاارتکاب ہورہاہوتو اگراس برائی کے ارتکاب کے بعداس برائی سے روکنے والے بھی موجود ہیں یعنی اس معاشرہ میں کچھ افراد وہ بھی ہیں جولوگوں پراس برائی کی قباحت واضح کرکے اس سے روکنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں تواس صورت میں اس قوم اور معاشرہ پرکوئی عمومی عذاب نہیں آئے گا، جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

اوراگرکسی معاشرہ میں کسی برائی کاارتکاب کیاجائے اوراس برائی سے روکنے کا اہتمام نہ ہو،تواس برائی کے ارتکاب پراللہ تعالیٰ کی طرف سے جوعذاب آئے گاوہ عمومی شکل میں آئے گااور پھرکوئی اس سے بچ نہیں سکے گا۔وہ لوگ جنہوں نے اس برائی کاارتکاب نہیں کیا تھاوہ بھی عذاب میں تومبتلا ہوں گے، البتہ قیامت کے روز وہ اس گناہ کے مرتکبین میں شمار نہیں ہوں گے، لیکن دُنیامیں باری تعالیٰ کی طرف سے عمومی شکل میں جوعذاب دیا جائے گا اس میں وہ بھی شامل ہوجائیں گے۔اسی لئے علماء نے لکھاہے کہ امت کے اندرامر بالمعروف اورنہی عن المنکر کا سلسلہ جاری رہے، تب ہی عمومی عذاب سے حفاظت ہوگی ؛ ورنہ نہیں ہوگی۔

﴿جو آدمی کوئی برائی ہوتی دیکھے؛ تو کیا کرے؟﴾

عن أبی سعید ن الخدری ﷛ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ یقول: مَنْ رَأیٰ مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذَالِکَ أَضْعَفُ الْاِیْمَانِ

حضرت ابوسعید خدری ﷛ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے کوئی آدمی خلافِ شرع کوئی ناجائز کام ہوتا دیکھے تو اس کو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اس کو دور کرے اور درست کرے۔ اور اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں ہے تو زبان سے اس کو منع کردے کہ بھائی! یہ مت کرو۔ اور اگر زبان سے بھی منع کرنے کی طاقت نہیں ہے تو اس کو اپنے دل سے برا سمجھے۔ اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو آدمی ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو، اس کے باوجود زبان سے روکنے پر اکتفا کرے، تو پھر دھیرے دھیرے ادنیٰ درجے کی طرف بڑھتے بڑھتے ایمان کا جو ادنیٰ ترین درجہ ہے؛ اس سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو کوشش تو یہی کرنی چاہیے کہ وہ جہاں ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو؛ وہاں پر ہاتھ سے روکے۔

اب یہ ہے کہ ہاتھ سے روکنا، زبان سے روکنا، اور دل سے برا سمجھنا؛ یہ ہر ایک کے لئے ہے یا مخصوص طبقے کے لئے ہے؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ ہر ایک کے لئے ہے جو ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو وہ ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے روکنے کی صورت میں اس کو اپنی جان کا ڈر ہو، اپنے مال کا یا اپنے کسی عضو کے تلف ہوجانے کا خطرہ ہو تو اس صورت میں بجائے ہاتھ سے روکنے کے زبان سے روکے اور اگر اس صورت میں بھی اندیشہ لاحق ہو؛ تو پھر دل سے برا سمجھے۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ طبقوں کے اعتبار سے ہے۔ جو لوگ اہلِ سلطنت

اور اصحابِ اختیار ہیں جن کے پاس طاقت اور حکومت ہے وہ اس بات کے مکلّف ہیں کہ لوگوں کو ہاتھ سے روکیں اور اس کا ارتکاب نہ کرنے دیں۔ اور جو اہلِ علم ہیں وہ اس بات کے مکلّف ہیں کہ زبان سے منع کریں۔ اور بقیہ حضرات دل سے برا سمجھیں۔ بہر حال! دل سے برا سمجھنا یہ آخری درجہ ہے، اب اگر یہ بات بھی نہیں ہے تو آدمی کو اپنے ایمان کے متعلق فکر کرنی چاہیے کہ ایمان باقی بھی ہے یا نہیں۔

﴿برائی کرنے والوں کا مقابلہ﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال: مَامِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ أُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّوْنَ، وَأَصْحَابٌ يَّأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهِ، ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ، وَيَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ. (رواہ مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ سے پہلے کسی بھی امت میں اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس امت میں اس نبی کے کچھ مخصوص مددگار ہوا کرتے تھے۔ ایسے لوگ ہوا کرتے تھے جو اس نبی کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑے رہتے تھے اور اس نبی کی کہی ہوئی باتوں پر چلتے تھے، اس کی پیروی کرتے تھے۔ ﴿حَوَارِیْ﴾ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کو خصوصی تعلق ہو اور خاص مدد کرنے والا ہو۔ پھر اس کے بعد جو طبقہ آتا تھا ان میں بعض ایسے ہوتے تھے جو ایسی باتیں کہتے تھے جس کو خود کرتے نہیں تھے اور ایسے کام کرتے تھے جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں دیا گیا۔ مطلب یہ

ہے کہ ایسے لوگ جو شریعت کے اوپر پورا عمل نہیں کرتے تھے، ورنہ اس نبی کے زمانہ میں اکثر وہ حضرات ہوتے تھے جو اس نبی کے طریقہ پر چلتے تھے۔

ایسے خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرنے والوں کا جو آدمی اپنے ہاتھ سے مقابلہ کرے؛ وہ مؤمن ہے۔ جو اپنے دل سے مقابلہ کرے؛ وہ مؤمن ہے۔ اور جو ان کا مقابلہ زبان سے کرے؛ وہ بھی مؤمن ہے۔ اب اگر ان تینوں میں سے کوئی بات نہیں ہے؛ تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ گویا ان تینوں میں سے کوئی ایک بات بھی پائی جائے گی تو کہا جا سکتا ہے کہ ان میں ایمان کی رمق ہے؛ ورنہ پھر نہیں۔

﴿کسی بھی حال میں شریعت کا دامن نہیں چھوڑیں گے﴾

عن أبی الولید عبادة بن صامت رضی اللہ عنہ قال: بَایَعْنَا رسولَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلیٰ السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِیْ الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرِہِ، وَعَلیٰ اَثَرَةٍ عَلَیْنَا، وَعَلیٰ اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ أَهْلَهٗ اِلَّا أَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللہِ تَعَالیٰ فِیْهِ بُرْهَانٌ، وَعَلیٰ أَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِ أَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (متفق علیہ)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس بات کی بیعت کی کہ ہم آپ کے احکام کو سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ اور تنگی میں اور آسانی کے اندر آپ کی اطاعت کریں گے۔ یعنی حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں ہم آپ کے احکام پر عمل کریں گے۔ بعض مرتبہ جب موافق حالات ہوتے ہیں اس وقت تو آدمی شریعت پر عمل کرتا ہے، جب کچھ مخالف حالات ہوتے ہیں تو پھر دوسری چیزوں کی طرف نگاہ اٹھانے لگتا ہے۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ آدمی جب ایمان لے آیا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ

ہر حال میں شریعت کا جو حکم ہو؛ اسی کو بجالائے۔

﴿وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ﴾ اور خوش حالی میں اور تنگی میں آپ کی بات مانیں گے یعنی حالات ٹھیک ہوں تب بھی اور مزاج کے خلاف ہو، غربت اور تنگی کا زمانہ ہو؛ تب بھی شریعت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔

﴿وَعَلٰى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا﴾ اور ہم شریعت کے احکام کو اس وقت بھی نہیں چھوڑیں گے جب ہمارے مقابلہ میں ترجیح دی جارہی ہو۔ مثلاً حاکم کی طرف سے ایسے امور میں جو سب کے لئے یکساں ہوا کرتے ہیں اور وہ باتیں جن میں سب کو برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں ایسے موقعہ پر اُس حق دینے والے کی طرف سے بجائے اس کے کہ سب کو یکساں حق دے؛ کسی کو زیادہ دیا جارہا ہے، اسی کو ترجیح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب وہ حاکم ہو چاہے کوئی اور ہو۔ مثلاً باپ ہے اس کے چار بیٹے ہیں تو باپ کے باپ ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے کہ چاروں بیٹوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے لیکن وہ اگر کسی ایک بیٹے سے اچھا سلوک کرتا ہے؛ اسی کو ﴿عَلٰى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا﴾ سے تعبیر کیا جاتا ہے، ہاں! اگر ترجیح دینے کیلئے یا مزید مناسب سلوک کرنے کے لئے شریعت کی طرف سے کوئی دلیل اور حکم موجود ہو، تو اس کو ترجیح سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔

بہرحال! ایسے موقعہ پر بھی کہ جب ہمارے مقابلہ میں دوسرے کو ترجیح دی جائے تو شریعت کے دامن کو نہ چھوڑے۔ اس کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کی یا انتقام کے لئے کوئی تدبیر سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے اگر اپنا حق ادا نہیں کیا اور آپ کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے؛ تو اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حوالے کردو۔ ایسا نہیں کہ آپ اس کے مقابلہ پر اتر آئیں۔

﴿ اربابِ اقتدار سے اقتدار چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے ﴾

﴿وَعَلىٰ اَنْ لَاننَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ﴾ اور اس بات کی بھی بیعت کی جو لوگ حاکم اور اربابِ اقتدار ہیں ان سے اقتدار چھیننے میں ہم ان سے نزاع نہ کریں۔ عام طور پر جو بڑے فتنے ملکوں کے اندر یا شہروں اور آبادیوں کے اندر واقع ہوتے ہیں؛ اس کی بنیاد یہی اقتدار ہوتی ہے کہ ایک آدمی کے پاس اقتدار ہے اس سے اُس اقتدار کو حاصل کرنے کیلئے کچھ لوگ کوشش کرتے ہیں۔ جب کچھ لوگ آگے بڑھیں گے تو آپس میں ٹکراؤ ہوگا اور اس کے نتیجہ میں خود مسلمانوں میں آپس میں دو جماعتیں ہو جائیں گی، اختلافات ہوں گے اور یہی چیز بڑے فتنے کا باعث ہوگی۔ اگر ملک کا اقتدار ہے تو ملک کے اندر یہ صورت پیش آئے گی۔ جس درجے کا اقتدار ہوگا اس درجے کا فتنہ ہوگا۔ اگر مسجد کے متولی بننے کا معاملہ چل پڑا کہ ایک کو ہٹا کر دوسرے کو لایا جائے؛ تو اس صورت میں اسی مسجد کے مصلیوں میں دو گروہ ہو جائیں گے جماعت کی پٹیلائی (પટેલાઈ) اور چودھراہٹ کے اندر اختلاف ہوا کہ چودھری کون بنے؟ تو جماعت میں اختلاف ہو جائے گا۔

ایک اصول ہے کہ صاحبِ اقتدار سے اقتدار چھیننے کی اگر کوشش کی جائے گی تو آپس میں جھگڑے ہوں گے اور نزاع پیدا ہوگا۔ ہاں! اگر وہ آدمی اس کا اہل نہیں ہے اور اس کو آسانی کے ساتھ الگ کیا جا سکتا ہے اور اس کو الگ کرنے کے نتیجہ میں جماعت میں دو گروہ نہیں ہوتے بلکہ سب متفق ہیں؛ تب تو کوئی اشکال نہیں ہے۔ لیکن نا اہل ہونے کے باوجود کچھ لوگ اس کے ساتھ ایسے ہیں کہ اگر اس کو الگ کیا گیا تو جماعت میں تفریق کا اندیشہ ہے تو شریعت کہتی ہے کہ تفریق کے مقابلہ میں اس نا اہل کی نا اہلیت کو برداشت کرنا زیادہ مناسب ہے۔

﴿اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحاً عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ فِیْہِ بُرْھَانٌ﴾ البتہ وہ صاحبِ اقتدار اگر کسی ایسی حرکت کا ارتکاب کر رہا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ کھلم کھلا کافر ہو جاتا ہے، اسلام پر باقی نہیں رہتا، اور اس کے لئے آپ کے پاس قرآن وحدیث سے دلیل موجود ہے کہ اس حرکت کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے وہ اسلام پر باقی نہیں رہا؛ تو اس سے اقتدار کو چھیننے کے لئے اور اس کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے ضرور کوشش کیجیے۔ اور جب تک یہ بات نہ ہو؛ وہاں تک ایسا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔

﴿اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے﴾

﴿وَعَلیٰ اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ﴾ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس بات پر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیعت لی، وعدہ لیا اور عہد کرایا کہ ہم حق بات کا اظہار کریں گے کہیں بھی ہوں، اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اور حق پر عمل کرنے کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔

بھائی! آپ شریعت پر عمل کر رہے ہیں جس کی وجہ سے لوگ آپ کو ملامت کرتے ہیں۔ مثلاً آپ نے یہ کرتا کیوں پہن رکھا ہے؟ ایسا لباس کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ ایسی شکل صورت ڈاڑھی والی کیوں بنا رکھی ہے؟ لوگ آپ کا مذاق کرتے ہیں یا آپ کی ملامت کرتے ہیں؛ تو اس معاملے میں کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی بات ہے۔ جس آدمی کو جتنی محبت ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ شریعت پر عمل کے معاملہ میں پختہ ہوگا۔ اور جتنا تعلق کم ہوگا اتنا ہی ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ کرتا رہے گا۔

﴿محبت اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے﴾

جیسے آج کل لوگوں کو ایکٹروں کے ساتھ محبت ہے تو ان کا طریقہ اپنانے میں وہ مست ہیں۔ نوجوانوں کو دیکھا ہوگا کہ ماں باپ بھی کہہ رہے ہیں، پورا گھر کہہ رہا ہے، ساری دنیا کہہ رہی ہے؛ پھر بھی اس کو کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ جیسا ایکٹر کر رہا ہے؛ ایسا ہی یہ بھی کرنے کے لئے تیار ہے، چاہے اس نے جو بھی کیا ہو۔ اگر اس نے کان چھدوا کر اس کے اندر بالی ڈال رکھی ہے؛ تو یہ بھی کان چھدوا کر بالی ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ ویسے تو بال کٹوائے گا نہیں، لیکن اگر اس نے آدھا سر منڈوا رکھا ہے اور آدھے پر بال رکھے ہیں؛ تو یہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ آج یہ بھی فیشن ہے۔ ویسے کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ اس کے ساتھ محبت اور تعلق کی بات ہے۔

اسی طرح کسی کو اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک رسول ﷺ کے ساتھ تعلق ہوگا تو ان کے طریقوں کو اپنانے میں اس کو کسی کی پرواہ نہیں ہوگی، چاہے ساری دنیا اس کو ملامت کرتی رہے اور اس کا مذاق اڑاتی رہے۔

کل ہم ٹرین میں آرہے تھے تو بات چیت چل رہی تھی کہ مائیکل جیکسن کی وجہ سے پورا نوجوان طبقہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اور صاحب ہمارے ساتھ تھے، انھوں نے سنایا کہ کسی جگہ پر اس نے ایک بچے کو بوسہ دیا تو اس بچے نے ایک سال تک غسل نہیں کیا، کیونکہ غسل کرتا تو اس کا منھ جہاں لگا ہے اس کا اثر زائل ہو جاتا، اس لئے ایک سال تک غسل نہیں کیا۔ تعجب ہوتا ہے۔ آج کل یہ ایک چیز چل پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں، شریعت کے معاملہ میں کسی

ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔یہی اللہ اور اس کے پاک رسول ﷺ کے ساتھ محبت کی اصل علامت ہے۔ اور جتنا ملامت کی طرف دھیان دے گا معلوم ہوا کہ شریعت کے ساتھ تعلق اتنا کم ہے۔ ورنہ محبوب کے معاملہ میں تو کوئی بھی آجاوے، ماں باپ بھی آجائیں، گھر کا کوئی بڑے سے بڑا فرد بھی آجائے؛ تب بھی اس کی کوئی پرواہ کرنے کے لئے وہ تیار نہیں ہوتا۔ ماں باپ زیادہ روک ٹوک کریں تو کہتا دیتا ہے کہ اچھا! گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہوں۔نوجوانوں کو اگر زیادہ چھیڑا جاتا ہے تو وہ یہاں تک پہنچتے ہیں، پھر ماں باپ بھی صلح کر لیتے ہیں کہ ٹھیک ہے۔خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی ایمان کی حقیقت اور ایمان کی وہ پختگی عطا فرمائے کہ دین کے ہر باب میں، دین کے ہر معاملہ میں ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی طرف توجہ نہ کریں۔ آمین۔



سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ

اے اللہ! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام نصیب فرما، خاص کر اپنے گھر والوں اور ماتحتوں کے معاملہ میں پورے طور پر سو فیصد عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! اس میں ہر قسم کی مداہنت، کاہلی اور سستی سے ہماری پوری حفاظت فرما۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی مانگی، وہ ہمیں عطا فرما، اور جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما۔

اَلْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ

بھلائی کا حکم کرنا

اور

برائی سے روکنا

﴿مجلس ۲﴾

۲۳/شوال المکرّم ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۱/فروری ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد.

﴿داد ودہش کے معاملہ میں اولاد کے ساتھ برابری﴾

عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:مَثَلُ الْقَائِمِ فِی حُدُوْدِاللّٰہِ وَالْوَاقِعِ فِیْھَا کَمَثَلِ قَوْمٍ اِسْتَھَمُوْاعَلیٰ سَفِیْنَۃٍ،فَصَارَبَعْضُھُمْ أَعْلاَھَاوَبَعْضُھُمْ أَسْفَلَھَا،وَکَانَ الَّذِیْنَ فِیْ أَسْفَلِھَااِذَااسْتَقَوْامِنَ الْمَآءِ مَرُّوْاعَلیٰ مَنْ فَوْقَھُمْ.فَقَالُوْا:لَوْأنَّاخَرَقْنَافِیْ نَصِیْبِنَاخَرْقًاوَلَمْ نُؤْذِمَنْ فَوْقَنَا،فَاِنْ تَرَکُوْھُمْ وَمَاأَرَادُوْاھَلَکُوْاجَمِیْعاً،وَاِنْ أَخَذُوْاعَلیٰ أَیْدِیْھِمْ نَجَوْاوَنَجَوْاجَمِیْعاً.

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں۔حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں اوران کے والد بشیر رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں،حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پرسب سے پہلے بیعت کرنے والے یہی بشیر رضی اللہ عنہ ہیں۔ان کے حالات میں لکھاہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ثقیفہ بنوساعدہ کے اندرجب بیعت ہوئی توسب سے پہلے اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ آپ ہاتھ بڑھائیے تاکہ مَیں بیعت ہوؤں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں اس سے پہلے انھوں نے ہاتھ بڑھادیا تھااور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے۔یہ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے ہیں۔اور ان کی والدہ عَمْرَہ بنتِ رواحہ رضی اللہ عنہا ہیں جوحضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ حضرت عبداللہ انصاری تھےاورشاعربھی تھے،غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے ہیں۔

حدیثِ پاک میں ان کا قصہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی والدہ نے ان کے والد بشیر سے کہا کہ آپ اپنا فلاں باغ میرے بیٹے کو- جو آپ سے ہے- ہدیہ میں دے دیجیے، چنانچہ ان کے اصرار پر ابا نے ان کو باغ ہدیہ میں دے دیا۔ ان کی والدہ نے پھر کہا: اچھا! اس پر حضور اقدس ﷺ کو گواہ بنا لیجیے۔ انھوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ ان کے والد ان کو لیکر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اللہ کے رسول! مَیں نے اپنے اس بیٹے کو اپنا فلاں باغ ہدیہ میں دیا ہے، آپ اس پر گواہ رہیے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: تمہاری اور بھی اولاد ہے؟ کہا: ہاں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اُن کو بھی دیا جیسا اِن کو دیا؟ کہا: نہیں! ان کو نہیں دیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: مَیں ایسی ظلم اور زیادتی اور بے انصافی والی بات پر گواہ نہیں بنوں گا۔ پھر حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اپنی اولاد کو ہدایا اور بخشش میں کوئی چیز دینا چاہو؛ تو برابر دو۔ (مسلم شریف۔ باب کراہۃ تفضیل بعض الاولاد فی الہبۃ، حدیث ۴۱۸۲) ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کسی کو دیا اور کسی کو نہیں دیا۔ یا کسی کو زیادہ دیا اور کسی کو کم دیا۔ بلکہ جب آپ ان کو اپنی اولاد ہونے کی حیثیت سے دے رہے ہیں تو جیسے یہ آپ کی اولاد ہے؛ دوسری بھی آپ کی اولاد ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے درمیان اپنی جائداد تقسیم کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں لڑکا ہو یا لڑکی سب کو برابر دینا چاہیے۔ ایسا نہیں کہ لڑکے کو زیادہ اور لڑکی کو کم۔ یا یہ کہ لڑکوں ہی کو دیا اور لڑکیوں کو نہیں دیا۔ کیوں کہ یہ جو آپ کی طرف سے دیا جارہا ہے وہ ہدیہ کے طور پر ہے اور اولاد ہونے میں سب برابر ہیں۔

اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اولیاء اور والدین کو یہ بھی تاکید فرمائی کہ تمہاری اولاد کی اطاعت اور فرمانبرداری کے اندر مدد کرو۔ یعنی تمہاری اولاد تمہاری فرمانبردار بنے اس میں ان

کی مدد کرو، ایسا نہ کرنا کہ اپنی اولاد میں سے ایک کو تو آپ دے رہے ہیں اور دوسرے کو نہیں دے رہے ہیں۔ آپ کا یہ طرزِ عمل اور روش آپ کی اس اولاد کو جس کو نہیں دیں گے آپ سے کاٹنے کا کام کرے گی، اور اس صورت میں وہ آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری ویسی نہیں کرے گی جیسے دوسری کرتی ہیں، گویا اس اولاد کو نافرمانی پر آمادہ کرنے کا کام آپ ہی کر رہے ہیں۔ آپ جیسے اُن کے والد ہیں اِن کے بھی والد ہیں۔ اب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی آپ کی فرمانبرداری کرتا ہے، کوئی نافرمانی کرتا ہے۔

ہمارے سماج کا المیہ

آج کل عام رواج ہو گیا ہے کہ بڑھاپے میں اگر کسی کے یہاں ماں باپ رہتے ہیں اور اس نے ذرا خدمت کی تو اب وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ مجھے کچھ صلہ مل جائے، اور ماں باپ بھی یوں چاہتے ہیں کہ ہم اس کا فائدہ کر کے جائیں۔ اب وہ جائیداد کے معاملہ میں کہتا ہے کہ مَیں نے یہ گھر اپنے اس بیٹے کو لکھ دیا جس نے میری خدمت کی۔

ہمارے پاس تو دارالافتاء میں سوالات آتے ہی رہتے ہیں۔ وہ بھی باپ کے انتقال کے بعد کہ ابا نے وصیت کی تھی۔ کیونکہ مَیں نے خدمت کی دوسرے بھائیوں نے نہیں کی۔ ان کو تو ہم یوں جواب دیتے ہیں کہ ان کی آپ نے جو خدمت کی تھی اس کا صلہ آپ ان سے کیوں مانگتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ سے مانگیے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ ماں باپ کی خدمت کرو۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر آپ نے عمل کیا، دوسرے بھائیوں نے عمل نہیں کیا، تو جس کے حکم پر آپ نے عمل کیا ہے وہ ان شاء اللہ آپ کے اس عمل کا بدلہ دے گا، اور جنہوں نے عمل نہیں کیا ہے ان کو وہ ثواب اور اجر نہیں ملے گا۔ دنیا کے اندر بھی جو فائدہ آپ کو ہو گا دوسروں کو نہیں ہو گا۔ آپ ماں باپ سے کیوں وصول کر رہے ہیں اور ان کو کیوں گنہ گار بناتے ہیں۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی اپنی پوری زندگی نیکی کا کام کرتا ہے یہاں تک کہ جنت کے قریب ہوجاتا ہے لیکن موت کے وقت ایسی وصیت کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وارثوں میں سے کسی کو محروم کردیتا ہے اور جہنم میں جاتا ہے۔ آج کل عام طور پر یہ ہورہا ہے، اس لئے ان صحابی کا نام دیکھ کر خیال آیا کہ اس کا تذکرہ کردوں۔

اگر اس نے خدمت کی ہے تو آپ بھی کیوں اس کو صلہ دینے کی فکر کرتے ہیں، اس نے اولاد ہونے کی حیثیت سے اپنی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا ثبوت دیا؛ تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا۔

﴿ایک مثال سے وضاحت﴾

اس کو مَیں ایک مثال سے سمجھایا کرتا ہوں کہ اگر آپ کو بادشاہِ وقت یوں کہے کہ فلاں کا یہ کام کردو۔ اس کے کہنے سے آپ اس کا وہ کام کردیں۔ پھر جس کا کام کیا ہے اس سے آپ یہ مطالبہ کریں کہ میں نے آپ کا یہ کام کردیا اس کا مجھے معاوضہ دو۔ تو یہ آپ کی حماقت کی بات ہوگی۔ آپ نے اس کا یہ کام اس کے کہنے سے نہیں کیا ہے بلکہ بادشاہِ وقت کے کہنے سے کیا ہے، تو آپ بادشاہ سے مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟ اگر آپ اِس سے بدلہ لیں گے تو دے دے کر کیا دے گا؟ ایک معمولی آدمی ہے جو اپنی حاجت پوری نہیں کرسکتا تھا آپ کو کچھ دے گا بھی تو معمولی چیز دے گا، اور جس بادشاہ کے کہنے سے آپ نے یہ کام کیا ہے وہ جب بدلہ دے گا تو بہت کچھ دے گا۔ اس لئے جو خدمت کرنے والے ہیں ان کو بھی چاہیے کہ اس طرح اصرار کر کے ان کو گناہ میں مبتلا نہ کریں۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو خدمت کرتے ہیں وہی بعد میں دباؤ بھی ڈالتے ہیں کہ آپ ہمارے واسطے یوں وصیت کرجایئے اور اس طرح وِل [will] لکھ کر جایئے۔ آج کل

ہمارے معاشرے میں جو خرابیاں پھیلتی جارہی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ باپ کی طرف سے اولاد کو جو کچھ دیا جاوے تو اس چیز کا اہتمام ہونا چاہیے کہ تمام کو یکساں دے؛ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی۔ اور مرنے کے بعد جو ملتا ہے وہ وراثت کے طور پر ملتا ہے اور وراثت باپ نہیں دے رہا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں، مرنے کی وجہ سے باپ کی ملکیت تو ختم ہوگئی اب اللہ تعالیٰ کہہ رہے ہیں کہ اِس کو اتنا دیا جائے

شریعت کے اندر وراثت کا جو حکم نازل کیا وہ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا، بیٹے کو جوڈبل (Double) دے رہے ہیں یا بیٹی کو ایک گنا (single) دے رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں، اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں، لیکن اگر آپ کو اپنی زندگی میں دینا ہے تو پھر برابر دیجیے، شریعت نے یہی حکم دیا۔

﴿نہی عن المنکر نہ کرنے کا نقصان...ایک مثال﴾

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿مَثَلُ الْقَائِمِ فِي حُدُوْدِ اللهِ وَالْوَاقِعِ فِيْهَا كَمَثَلِ قَوْمٍ اِسْتَهَمُوْا عَلٰى سَفِيْنَةٍ﴾ وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی حدود کی رعایت کرتا ہے، حدود سے یا تو تمام احکام مراد ہیں یا پھر جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور حرام قرار دیا ہے وہ مراد ہے، تو جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس سے بچتا ہے اور دوسروں کو بھی ان میں مبتلا ہونے سے روکتا ہے ایسے آدمی کو ﴿اَلْقَائِمُ فِيْ حُدُوْدِ اللهِ﴾ سے تعبیر کیا گیا ﴿وَالْوَاقِعِ فِيْهَا﴾ دوسرا وہ ہے جو اس میں مبتلا ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا اور حرام قرار دیا ان کا ارتکاب کرتا ہے اور ان گناہوں کے کاموں کو انجام دیتا ہے ان دونوں کو حضور اکرم ﷺ ایک مثال سے سمجھا

رہے ہیں، ان دونوں کا حال ایسا ہے جیسے کچھ لوگ ایک کشتی کے اندر سوار ہیں اور مسافر زیادہ ہیں، کشتی بھی دو حصوں میں ہے ایک اوپر کا حصہ ہے اور دوسرا نیچے کا حصہ ہے، اب ہر شخص چاہتا ہے کہ مَیں اوپر جاؤں ، دوسرا نیچے جائے۔اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے قرعہ اندازی کی کہ جس کا نام نیچے نکلے وہ نیچے رہے اور جس کا نام اوپر نکلے وہ اوپر رہے۔

اس کے بعد دریا کا سفر شروع ہوا (دریا وہی جس کو ہم گجراتی میں ندی کہتے ہیں جو میٹھے پانی کا ہوتا ہے اس کو اردو میں دریا کہا جاتا ہے، اور جس کو ہم دریا کہتے ہیں اس کو اردو میں سمندر کہا جاتا ہے اس کا پانی کھارا ہوتا ہے) اب اس طرح سفر ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ کشتی کے نیچے حصے میں ہیں اور کچھ اوپر کے حصے میں ہیں، نیچے والوں کو استعمال کے لئے پانی کی ضرورت پیش آتی ہے، کشتی کے اندر پانی کا ذخیرہ موجود نہیں ہے، پانی اسی دریا میں سے لینا ہے، لہٰذا اوپر والے تو آسانی سے پانی لے سکتے ہیں لیکن نیچے والوں کو پانی حاصل کرنے کیلئے اوپر آنا پڑتا ہے اور برتن میں پانی بھر کر لے جانا پڑتا ہے۔ایک تو اوپر بار بار آنے کی وجہ سے اور دوسرے پانی بھر کر لے جانے کی وجہ سے اوپر والوں کو زحمت ہوتی ہے، پانی گرتا بھی ہے، اس لئے نیچے والوں نے سوچا کہ ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ کشتی کے اندر نیچے سوراخ کرلیں؛ تاکہ نیچے سے براہِ راست ہم پانی حاصل کرسکیں اور ہمارے بار بار اوپر آنے جانے کی وجہ سے رفقاءِ سفر کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ بھی اس سے بچ جائیں گے، اور ہم اوپر آنے جانے کی زحمت سے بچ جائیں گے، دونوں کو راحت ہوگی۔ان کی میٹنگ ہوئی اور یہ طے ہوا کہ اچھا! ہم سوراخ کرلیں گے جب اس مشورہ کا پتہ اوپر والوں کو چلے اور وہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور انھوں نے جو پلان بنایا ہے اس میں ان کو آگے بڑھنے دیں اور کوئی اوبجیکشن

(Objection) نہ اٹھائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نیچے سوراخ کرلیں گے اور پانی کشتی کے اندر آجائے گا تو نیچے والے بھی برباد ہوں گے اور اوپر والے بھی۔ حالانکہ سوراخ کرنے کا کام اوپر والوں نے کیا نہیں تھا، تو اگر اوپر والے بے تعلق رہیں گے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ اور اگر وہ ان کا ہاتھ پکڑیں گے کہ ایسا نہیں ہوگا، ہم آپ کو اس طرح سوراخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بھی بچیں گے اور نیچے والے بھی جو ایسی نادانی کی حرکت کرنے جارہے ہیں ان کو بھی بچائیں گے۔

اسی طرح امت دنیا کے اندر زندگی گذار رہی ہے اس میں کچھ لوگ تو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پامال کرتے ہیں، اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ تو جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لارہے ہیں وہ یوں سوچیں کہ ہم تو اعمال کررہے ہیں، وہ لوگ خلاف ورزی کرتے ہیں تو ان کو کرنے دو، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا ان کی اس نافرمانی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے کی وجہ سے جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا عذاب آئے گا اور ہلاکت ہوگی تو ایسا نہیں ہوگا کہ وہ لوگ جو نافرمانی میں مبتلا تھے وہی ہلاک ہوں گے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ یہ لوگ جنہوں نے نافرمانی کا ارتکاب نہیں کیا تھا لیکن اُن کو روکا بھی نہیں تھا وہ بھی دنیوی طور پر تو ہلاک ہوجائیں گے، آخرت کی بات دوسری رہے گی۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں یہی دستور ہے کہ کسی قوم میں، کسی معاشرے میں، کسی سوسائٹی کے اندر اگر کوئی برائی کا کام ہورہا ہو تو یہ نہیں کہ جو کررہے ہیں ان کو کرنے دیا جائے بلکہ جو اس کو دیکھ رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ برائی کا کام ہے ان کو چاہیے کہ برائیوں کے کام

کرنے والوں کو روکیں اور منع کریں۔ یہ نہ سوچیں کہ چھوڑو، ان کو کرنے دو، ہمیں ان کے معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے، ہم خود بچے ہوئے ہیں بس کافی ہے۔ نہیں! اگر ایسا کر کے اپنے آپ کو الگ کرلیں گے اور لاتعلق بنالیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آئے گا وہ عمومی شکل میں آئے گا اور وہ عذاب سب کو لے ڈوبے گا۔

بدعمل حکام کے ساتھ رعایا کا ردِّ عمل کیا ہو؟

عن أم المؤمنين أم سلمة هند بنت أبی أمية رضی اللہ عنہا عن النبی ﷺ انهٗ قال: اِنَّهٗ يُسْتَعْمَلُ عَلَيْكُمْ اُمَرَآءُ، فَتَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ. فَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ بَرِئَ، وَمَنْ اَنْكَرَ فَقَدْ سَلِمَ، وَلٰكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ. فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَلَا نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ: لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ.

اُم المؤمنین اُمِ سلمہ بنت اَبو اُمیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آئندہ کی پیشین گوئی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: تم پر کچھ ایسے لوگ امیر بنائے جائیں گے کہ وہ جو حرکتیں کریں گے اور جن اعمال کو انجام دیں گے ان میں سے بعض تو وہ ہوں گے جن کو تم جانتے ہو یعنی شریعت کے مطابق ہیں (میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ نیکی کے کام کو شریعت میں معروف سے تعبیر کیا جاتا ہے اور گناہ کے کام کو شریعت میں منکر سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور بعض کام وہ ہوں گے جو شریعت کے خلاف ہوں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف ثابت ہوئی، بنوامیہ کے زمانہ میں ایسے امراء آئے جنہوں نے اسی کے مطابق کیا جو نبی کریم ﷺ پہلے سے خبر دے چکے تھے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ان امراء کی حرکتوں پر تمہاری طرف سے جو (Response) اور تأثر دیا جائے گا وہ تین طرح کا ہوسکتا ہے۔ بعض لوگ وہ ہیں جو ان کی حرکتوں کو دل سے برا سمجھتے ہیں اگرچہ زبان سے منع نہیں کرتے؛ وہ

تو بری ہو گئے یعنی اس گناہ میں شریک نہیں ہوئے۔اور بعض لوگ وہ ہیں جنہوں نے اتنا ہی نہیں کہ فقط دل سے برا سمجھا بلکہ زبان سے منع بھی کیا اور ٹوکا؛ تو وہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے محفوظ ہو گئے۔ البتہ جو لوگ ان کی اس حرکت کے اوپر خوش ہو گئے یعنی انھوں نے تسلیم کرلیا اور وہ بھی ساتھ دینے لگے؛ وہ ان کے ساتھ شریک ہیں۔

﴿برائی سے روکنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟﴾

دیکھو! منع کرنے کے سلسلے میں ایک بات یاد رہے کہ منع کرنے کے لئے پتھر مارنا ضروری نہیں ہے کہ اس کے سر میں مارو۔ بعض لوگ منع نہیں کرتے تو بالکل ہی نہیں کرتے اور جو منع کرنے پر آتے ہیں تو ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں جو اختلاف اور شقاق ڈالنے والا ہوتا ہے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ❁ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

کبھی منع نہیں کرتے تو کچھ بھی نہیں کہتے اور منع کرنے پر آئے تو ایسا انداز اختیار کیا کہ لوگ نفرت کرنے لگے۔ آج کل ایسا ہوتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

﴿بچوں کی تعلیم میں نرمی سے کام لیا جائے﴾

ایک مرتبہ ایک جگہ پر کسی مولوی صاحب نے پوچھا کہ پہلے زمانہ میں پڑھاتے تھے تو پٹائی بھی کرتے تھے، لیکن والدین کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا اور تعلیم بھی اچھی طرح ہوتی تھی، اب تو والدین بھی آ کر لڑتے ہیں اور یہ کرتے ہیں وہ کرتے ہیں؛ اب کیا کیا جائے؟ ان کو پڑھایا جائے یا نہ پڑھایا جائے؟ مَیں نے کہا کہ پہلے والدین بھی اپنی اولاد کو کچھ کہتے تھے تو اولاد سامنے کچھ نہیں کہتی تھی، اب تو اگر والدین اولاد کو کچھ کہیں تو اولاد بھی

سامنے الٹا جواب دینے لگتی ہے، لہٰذا آپ اپنے بچوں کے معاملہ میں جو طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ نرمی سے سمجھاتے ہیں؛ وہی طریقہ یہاں بھی اختیار کیجئے۔ روکنے کے لئے ضروری نہیں کہ آپ سختی سے کام لیں۔

نہی عن المنکر کے لئے کوئی سخت طرز اختیار نہ کرے

اب ایک آدمی برا کام کر رہا ہے تو آپ محبت سے بلا کر یوں کہہ دیجئے کہ بھائی! آپ جو کام کر رہے ہیں وہ شریعت کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ بس! آپ کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ یہ نہی عن المنکر ہوگیا۔ نہی عن المنکر کے لئے ضروری نہیں کہ آپ شور مچائیں اور ڈنڈا لے کر اس کی پٹائی شروع کردیں۔ آپ نے اس کو مطلع کردیا اور اس کی حرکت پر آپ نے کہہ دیا کہ باز رہیے؛ تو آپ نے نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے دیا۔ ہاں! اگر آپ کو ڈر یہ ہے کہ اتنا کہنے جاؤں گا تب بھی اس کی طرف سے جانی یا مالی نقصان پہنچ سکتا ہے، وہ شر پر آمادہ ہوسکتا ہے اور مجھے تکلیف دے ڈالے گا؛ تو پھر آپ رخصت پر عمل کرتے ہوئے دل سے برا سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا چاہیں تو اس کی اجازت ہے۔ لیکن دل سے برا سمجھنا تو ضروری ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہوا کہ نہی عن المنکر کے واسطے کوئی سخت طرز اختیار کرنا ضروری نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل ... تین نمونے

نبی کریم ﷺ کے حالات میں سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ جب کسی کو منع کرتے تھے تو سخت طریقہ اختیار نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ آپ نرمی کرتے تھے۔

پہلے بھی گذر چکا ہے کہ حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ جو ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا

(جن کی یہ روایت ہے) کے اگلے شوہر ابوسلمہ سے تھے۔فرماتے ہیں کہ مَیں ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک پلیٹ میں کھانا کھارہا تھا،بچوں کی عادت ہوتی ہے اس طرح پلیٹ میں اِدھر اُدھر ہاتھ ماررہا تھا،تو نبی کریم ﷺ نے کہا: بیٹا دیکھو! کھانے کے لئے جب بیٹھوتو بسم اللہ پڑھو،داہنے ہاتھ سے کھاؤ اوراپنے سامنے سے کھاؤ،یہ تین باتیں ان کو بتلائیں تو حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میرے کھانے کا طریقہ برابر یہ ہے۔دیکھو!اس روایت میں یہ نہیں ہے کہ آپ نے اٹھا کرایک طمانچہ ماردیا کہ یہ کیا کرتا ہے اور ہم کسی کو روکنے پر بھی آتے ہیں تو طمانچہ مارنے کی ہی بات کرتے ہیں۔یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

ایک صحابی فرماتے ہیں کہ مَیں نیا نیا اسلام لایا تھا،نماز میں شریک ہوا،کسی کو چھینک آئی،مَیں نے یرحمک اللہ کہا تو سب اپنی اپنی ران پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگے گویا روکنا چاہتے تھے۔مَیں کہنے لگا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ وہ لوگ اور زیادہ آنکھیں نکالنے لگے اور تو کچھ بول نہیں سکتے تھے،جب نماز پوری ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے مجھے قریب بلایا اور فرمانے لگے: دیکھو! یہ نماز اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی یاد کے واسطے رکھی ہے،جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو تو اس میں قرآنِ پاک کی تلاوت کرے،تسبیح پڑھے،اللہ کا ذکر کرے،کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نہ مجھے ڈانٹا،نہ پیٹا،نہ کچھ کہا بلکہ بہت نرمی سے مجھے سمجھایا۔یہاں بھی آپ نے سخت طریقہ اختیار نہیں کیا۔

(ابوداؤد۔باب تشمیت العاطس فی الصلوۃ حدیث ۱۳۹)

ایک اور قصہ پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان نے آکر نبی کریم ﷺ

سے اجازت چاہی کہ اے اللہ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دیجئے۔ جب انھوں نے یہ سوال کیا تو صحابہ تیز تیز نگاہوں سے اس کو دیکھنے لگے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے کہا کہ اچھا! ایک بات بتاؤ، تمہاری ماں ہے؟ پھوپھی ہے؟ خالہ ہے؟ کہا! ہاں ہے۔ فرمایا: اگر کوئی آدمی تمہاری والدہ کے ساتھ، تمہاری پھوپھی کے ساتھ، تمہاری خالہ کے ساتھ ایسی حرکت کرے تو تم اس کو گوارہ کر سکتے ہو؟ کہنے لگا کہ مَیں اس کو گوارہ نہیں کر سکتا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: تم بھی جس کے ساتھ یہ کرنا چاہو گے وہ بھی کسی کی بیٹی، کسی کی پھوپھی، کسی کی خالہ، کسی کی ماں تو ہو گی؟ فوراً اس کی سمجھ میں آ گیا۔ پھر حضور ﷺ نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور دعا فرمائی کہ اے اللہ اس کے دل میں سے ایسی بات کو نکال دے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے مجھے کوئی سخت جملہ نہیں کہا۔ آپ ﷺ کی تعلیم کا طریقہ سیرت کی کتابوں میں آپ دیکھئے تو یہی ملے گا۔

(مسند احمد ۲۵۶/۵)

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی بھی برائی کو روکنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ آپ خواہ مخواہ کوئی سخت طریقہ اختیار کریں۔ ہاں! اگر حاکم ہو تو الگ بات ہے۔ ورنہ عمومی طور پر لوگوں کو روکا جائے۔ مثلاً آپ مسجد میں آئے تو دیکھا کہ کسی کا بچہ شرارت کر رہا ہے، تو آپ اس کو محبت کے ساتھ سمجھا دیجئے کہ بیٹا! ایسا مت کرو۔ اب اس کی پٹائی کرنی ہے تو اس کا باپ کرتا رہے، آپ کو کیا تعلق ہے۔ آپ پٹائی میں نہ پڑیں، آپ تو اس کو صرف محبت سے سمجھا دیجیے۔ پھر دو تین مرتبہ کے بعد بھی نہیں مانتا تو اس کے باپ سے مشورہ کر لیجیے کہ آپ کے بیٹے کی یہ غلطی ہے، اس کو سدھارنے کی ضرورت ہے۔ یا اس کا کوئی مربی اور استاذ ہے جس کو باپ کی طرف سے تربیت کے معاملے میں سخت طریقہ اپنانے کی اجازت دی گئی ہے تو اس کو کہہ دیجیے۔ لیکن آپ کو اس کے ساتھ سخت رویہ اپنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا عام مزاج یہ ہے کہ یا تو کہتے ہی نہیں اور کہنے پر آتے ہیں تو ایسی روش اختیار کرتے ہیں جو بالکل ضروری نہیں۔ نہی عن المنکر کے لئے صرف آپ کا اس کو یوں کہہ دینا ہی کافی ہے کہ بھائی! یہ چیز ممنوع ہے، آپ مت کیجئے۔

﴿ٹکراؤ کی شکل اختیار نہ کی جائے﴾

خیر! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایسے امراء، حکام (جس کو گجراتی میں (સત્તાધીશ) کہتے ہیں) اگر برسرِ اقتدار آجائیں جو بعض چیزیں شریعت کے خلاف کریں گے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں تو ہم ان سے قتال اور لڑائی نہ کریں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿لا﴾ لڑائی مت کرنا؛ جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں۔

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ حکام کی طرف سے جو باتیں خلافِ شرع پیش آتی ہیں ان کے اوپر نکیر کے معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ طریقہ بتلایا ہے کہ جس میں ٹکراؤ کی شکل اختیار نہ کی جاوے۔ ہاں! کوئی ایسا آدمی ہے کہ اس کو ہٹا دیا جائے تو کسی فتنے کا اندیشہ نہیں ہے تو گنجائش ہے، ورنہ نہیں۔

ہمارے معاشرے میں جو لوگ اربابِ اختیار ہوتے ہیں ان کے خلاف بھی جب باتیں شروع ہوتی ہیں تو وہاں پر بھی یہی شکل اختیار کرنی چاہیے کہ اگر فتنے کا اندیشہ ہو تو تدبیر سے کام لیا جائے تا کہ کھلم کھلا ٹکراؤ کی شکل پیدا نہ ہو۔ باقی یہ ہے کہ منع ضرور کرنا چاہیے۔

﴿حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا﴾

عن أم المؤمنين أم الحكم زينب بنت جحش رضی اللہ عنہا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دَخَلَ عَلَيْهَا فَزِعًا يَقُوْلُ: ((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ، وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ، فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوْجَ وَ مَأْجُوْجَ مِثْلُ هٰذِهٖ)) وَحَلَّقَ بِأُصْبُعَيْهِ الْاِبْهَامِ وَالَّتِيْ تَلِيْهَا. فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللهِ! أَنَهْلِكُ وَفِيْنَا

الصَّالِحُوْن؟قال: نَعَمْ!اِذَا کَثُرَ الْخَبَثُ.

ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کا ۵ھ میں نکاح ہوا تھا۔ یہ حضور ﷺ کی پھوپھی زاد بہن ہیں اور پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں جو حضور کے منہ بولے بیٹے تھے۔حضور ﷺ نے ان کے ساتھ جب نکاح کرانا چاہا تو اگر چہ جس وقت نکاح کیا جارہا تھا اس وقت آزاد تھے لیکن چونکہ ان پر غلامی کا داغ کسی زمانہ میں لگ چکا تھا،جس کی وجہ سے اِنھوں نے اور اِن کے بھائی وغیرہ نے اس کو پسند نہیں کیا تھا کہ اِن کا نکاح اُن کے ساتھ کیا جائے اسی پر قرآنِ پاک کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَامُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضیٰ اللہُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ اس آیت کا شانِ نزول یہ بھی بتلایا جاتا ہے۔بہر حال!انھوں نے حضورِ اکرم ﷺ کو اختیار دے دیا کہ آپ جیسا چاہیں؛ ویسا کریں۔حضورِ اکرم ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کرادیا۔ان دونوں کے مزاج میں موافقت نہیں ہوئی۔ایک وقت آیا کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے ان کو طلاق دے دی۔ان کی عدت گذر جانے کے بعد خود اللہ تعالیٰ نے ان کا نکاح نبی کریم ﷺ کے ساتھ کرادیا،قرآنِ پاک میں آیت نازل ہوئی ﴿فَلَمَّا قَضیٰ زَیْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَهَا﴾ اسی لئے ازواجِ مطہرات کے مقابلہ میں یہ فخر کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ تمہارا نکاح تو وَلیوں نے کرایا اور میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے آسمان پر کرایا۔ان سے خلوت اور شبِ زفاف کے بعد حضور ﷺ نے بڑا ولیمہ کرایا اور ازواجِ مطہرات میں سے سب سے اچھا ولیمہ اگر حضور ﷺ نے کرایا ہو؛ تو وہ انہیں کی رخصتی کے موقعہ پر کرایا۔

﴿پھر صلحاء کا وجود بھی نہیں بچا سکے گا﴾

انہی ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ہے،فرماتی ہیں کہ

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ میرے یہاں تشریف لائے تو گھبرائے ہوئے تھے، آپ پر دہشت طاری تھی، خوف زدہ حالت میں تشریف لائے جیسے آئندہ کسی چیز کا خطرہ ہو اور یہ فرمارہے تھے: ﴿لاالٰہ الااللہ﴾ یہ جملہ کبھی تعجب کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ قومِ عرب کے واسطے ہلاکت ہو اس شر کی وجہ سے جو قریب آ گیا ہے۔ قومِ عرب سے مراد مسلمان ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں جتنے بھی مسلمان تھے سب کا تعلق قومِ عرب سے تھا، اور بعد میں بھی مسلمان جو دنیا میں پھیلنے والے تھے ان میں بڑی تعداد عرب کی تھی اس لئے نبی کریم ﷺ نے قومِ عرب فرمایا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے انگوٹھے اور اپنی انگشتِ شہادت کا حلقہ بنا کر فرمایا کہ یاجوج ماجوج کی دیوار میں سے اتنا سوراخ ہو گیا۔ گویا وہ زمانہ قریب آرہا ہے کہ یاجوج ماجوج دنیا والوں پر ظاہر ہوں گے، اور ان کی وجہ سے دنیا میں فتنہ و فساد پھیلے گا، یہ کہہ کر نبی کریم ﷺ نے انگوٹھے اور اپنی انگشتِ شہادت کے ذریعہ سے حلقہ بنایا۔ یہاں آگے جو بات آرہی ہے اسی سے استدلال کرنا مقصود ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم لوگ ہلاک ہو سکتے ہیں جبکہ ہمارے درمیان نیک لوگ موجود ہوں؟ یعنی جب معاشرہ میں صلحاء بڑی تعداد میں موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے بھی کیا ہمارے اوپر ہلاکت آسکتی ہے؟ عمومی عذاب آسکتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿نَعَمْ! اِذَا کَثُرَ الْخَبَثُ﴾ جب برائی بڑھ جائے۔ تعداد کمیّت اور پرسنٹیج (Percentage) بڑھ جائے تو یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عمومی عذاب آوے اور اس کے نتیجے میں سب ہی ہلاک ہو جائیں ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں آیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے اس عام عذاب سے ڈرو جو صرف جن

لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے انہیں کو نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ یہ کب ہوگا؟ جیسا کہ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان برائیوں کے کرنے والوں کو اگر روکا نہ جائے، نہی عن المنکر کا سلسلہ ختم ہو جائے؛ تو یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر نہی عن المنکر کا سلسلہ باقی ہے تو پھر یہ صورت نہیں ہو سکتی۔

عام گذرگاہوں پر بیٹھنے کی مشروط اجازت

عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِیَّاکُمْ وَالْجُلُوْسَ عَلیٰ الطُّرُقَاتِ. فَقَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہ! مَالَنَامِنْ مَجَالِسِنَا بُدٌّ، نَتَحَدَّثُ فِیْهَا. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَاِذَااَبَیْتُمْ اِلَّا الْمَجْلِسَ فَاعْطُوْا الطَّرِیْقَ حَقَّهٗ، فَقَالُوْا: وَمَاحَقُّ الطَّرِیْقِ یَارَسُوْلَ اللّٰہ؟ قَالَ: غَضُّ الْبَصَرِ وَکَفُّ الْأَذیٰ، وَرَدُّ السَّلَامِ، وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ، وَالنَّهْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو فرمایا کہ تم راستوں پر بیٹھنے سے بچو۔ جو لوگ گھر کے باہر اوٹوں (اوٹلے) پر بیٹھتے ہیں وہ راستہ ہی پر ہوتے ہیں، انصار کے یہاں گھر تو چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے، گھر کے باہر کا صحن ذرا کشادہ ہوتا تھا، ان کے یہاں مجلسیں وہیں لگا کرتی تھیں، تو حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ وہاں مت بیٹھو۔ ان حضرات نے اپنی دشواری پیش کی کہ یا رسول اللہ! اگر وہاں نہیں بیٹھیں گے تو ہمارے بیٹھنے کی جگہ ہی کہاں ہے؟ ہمارے پاس بیٹھنے کے لئے الگ جگہیں نہیں ہیں، ہمارے مکان اتنے کشادہ نہیں ہیں کہ ان میں الگ سے کوئی بیٹھک روم، نشست گاہ موجود ہو بلکہ چھوٹا سا مکان ہوتا ہے اور آپس میں کبھی بات کرنے کے لئے بیٹھنا ہوتا ہے تو وہیں صحن کے اندر ہی بیٹھتے ہیں، اس لئے اگر وہاں نہیں بیٹھیں گے تو کہاں بیٹھیں گے؟ حضور ﷺ نے

فرمایا: اچھا! اگر یہی تمہاری مجلسیں اور بیٹھکیں ہیں جو راستہ میں بنی ہوئی ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بیٹھ کر تم آپس میں باتیں کرسکو تو راستوں کا جو حق ہے وہ ادا کرو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! راستوں کا حق کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿غَضُّ الْبَصَرِ﴾ ایک تو یہ کہ نگاہوں کی حفاظت ہو کہ وہاں سے عورتیں بھی گذرتی ہیں، بعض لوگ تمہاری نگاہوں کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں، اگر ایسی کھلی جگہ بیٹھے ہوئے ہو تو نگاہیں نیچی ہوں، آنے جانے والوں کو دیکھتے مت رہو ﴿وَكَفُّ الْأَذىٰ﴾ دوسرا تکلیف دینے والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی کو طعن و تشنیع نہ کرے۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی گذرتا ہے تو اس کے اوپر کوئی جملہ چست کر دیا۔ مثلاً کہا کہ دیکھو! حضرت جارہے ہیں، فلاں صاحب جارہے ہیں، کسی کو چڑانے کے واسطے ایسا کہہ رہے ہیں، تو ایسا نہیں ہونا چاہیے ﴿وَرَدُّ السَّلَامِ﴾ اور سلام کا جواب دینا کہ آنے جانے والا اگر آپ کو سلام کرتا ہے تو اس کو سلام کا جواب دیجیے، یہ بھی راستہ کا حق ہے ﴿وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ﴾ بھلی بات کا حکم کرنا (یہاں اسی لئے لائے) وہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں، کھلی جگہ ہے، تو کبھی بھلی بات کہنے کی نوبت آئے گی تو چوکیو مت۔ ﴿وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ آپ کھلے میں بیٹھے ہیں، دِکھ رہا ہے کہ کوئی غلط کام کر رہا ہے، تو آپ اس کو روکیے، بری بات سے روکنا بھی آپ کے ذمہ ہے۔ یہ سب کروگے تو راستوں کا حق ادا ہوگا اور تب ہی آپ کو بیٹھنے کی اجازت ہے؛ ورنہ نہیں۔

لیکن یہ جب کہ آپ کے پاس نشست گاہ کے طور پر اور کوئی جگہ نہ ہو، اگر دوسری جگہ ہو تو وہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے، علماء نے منع لکھا ہے۔ اور کوئی دوسری جگہ نہ ہونے کی

صورت میں اگر ایسی کھلی جگہ میں بیٹھیں گے تو پھر ان ساری چیزوں کی رعایت کرنی پڑے گی ورنہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایسی جگہوں پر بیٹھنے والے انہیں غلط چیزوں کا ارتکاب کرتے ہیں، آنے جانے والی نامحرم عورتوں کی طرف نگاہیں بھی اٹھتی ہیں، لوگوں پر طعن و تشنیع ان پر جملے چست کرنا، ان کا مذاق اور ٹھٹھا اُڑانا، آنے جانے والوں کو چھیڑنا، تکلیف پہنچانا، پاس پڑوسیوں کو تکلیف میں ڈالنا، وغیرہ وغیرہ۔

﴿بات چھوٹی سی، لیکن فتنہ بڑا﴾

ایک مرتبہ ایک گاؤں سے رات کے وقت ہمارے یہاں فون آیا کہ یہاں بہت بڑی لڑائی ہونے کا اندیشہ ہے، کچھ لوگ حملہ کرنے کے واسطے آئے ہیں، آپ لوگ پہنچ جایئے؛ ورنہ بڑا فساد ہوگا۔ ہم لوگ گئے تو معلوم ہوا کہ وہاں روزانہ کچھ نوجوان ایک گھر کے اوٹے پر بیٹھ کر کیرم بورڈ کھیلا کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے گھر کے آس پاس رہنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے، لیکن وہ غریب لوگ تھے اور یہ نوجوان منع کرنے کے باوجود باز نہیں آتے تھے۔ اور پھر یہ نوجوان مالداروں کے بیٹے تھے تو ان کو کوئی کچھ کہتا بھی نہیں تھا، ان کے بڑوں تک بھی بات پہنچائی گئی لیکن انھوں نے نہیں مانا تو آخر وہ لوگ بہت تنگ آ گئے۔ جس کے اوٹے پر کیرم چلتا تھا وہ ایک عورت کا گھر تھا اس کا قریب کے شہر میں کوئی رشتہ دار رہتا تھا اور وہ سر پھرا آدمی تھا۔ اس کی ایک بڑی جماعت تھی جس کا وہ سرغنہ بھی تھا۔ اس عورت نے جا کر اس کو اطلاع دی تو وہ اپنی پوری ٹولی لے کر آیا۔ اب ان کو خطرہ محسوس ہوا کہ ہماری خیر نہیں ہے تو فوری طور پر فون کرایا کہ یہ لوگ آئیں گے تب ہی ہمارا بچاؤ ہوگا۔ ہم پہنچے اور سب تفصیل سنی تو ان نوجوانوں کو ڈانٹا اور ان لوگوں سے بھی کہا کہ اب یہ توبہ کرتے ہیں، آئندہ باز رہیں

گے، ان کو معاف کردو۔

تو عام طور پر یہ فتنے کی چیز ہوا کرتی ہے، اس لئے سوسائٹی کے اندر، معاشرے اور سماج میں، کسی علاقے اور محلے میں اس طرح کا کوئی سلسلہ ہو تو بڑوں کو پہلے ہی اس کی روک تھام کردینی چاہیے؛ ورنہ بعد میں جا کر یہی چیز بڑے فتنے کا باعث بنا کرتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے



سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلیٰ سَیِّدِنَامُحَمَّدٍالنَّبِیِّ الْاُمِّیِّ کَمَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی بِعَدَدِمَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اے اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف فرما، خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں اور سنتوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی توفیق عطا فرما۔ نفس اور شیطان کی شرارتوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہمیں تو اپنے احکام پر زیادہ سے زیادہ چلنے کی توفیق عطا فرما، اے اللہ! تیری منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہنے کا اہتمام نصیب فرما، اے اللہ! اگر کہیں برائی ہورہی ہو اور اس برائی کو روکنے کے لئے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان کوششوں میں زیادہ سے زیادہ عملی اور قولی طور پر حصہ لینے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! برائیوں کو ہمارے معاشرے سے عافیت کے ساتھ دور فرما، اس کی شناعت اور قباحت معاشرے کے ہر ہر فرد کے دل میں بٹھادے، اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرما۔ اے اللہ! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام نصیب فرما، خاص کر اپنے گھر والوں اور ماتحتوں کے معاملہ میں پورے طور پر سو فیصد عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! اس

میں ہر قسم کی مداہنت، کاہلی اور سستی سے ہماری پوری حفاظت فرما۔ نبی کریم ﷺ کے طریقوں پر چلنے کی ہمیں توفیق نصیب فرما اور حضور ﷺ کے طریقوں کی محبت ہمارے دلوں میں ڈال دے۔ اے اللہ! ہمارے بیماروں کو صحت کاملہ، عاجلہ، مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشان حالی کو دور فرما۔ اے اللہ! روزی کے معاملہ میں جو پریشان ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما کر روزیوں میں برکت اور کشادگی پیدا فرما۔ اے اللہ! کاروبار میں برکت عطا فرما۔ حرام سے حفاظت فرما، حلال کا اہتمام نصیب فرما اے اللہ! ہماری تمام ضروریات کی اپنے خزانۂ غیب سے کفالت فرما، ہمیں کسی کا محتاج اور دست نگر نہ بنا۔ اے اللہ! ہمیں تیری ذات عالی پر اعتماد اور توکل کامل نصیب فرما۔ اے اللہ! تیرے غیروں کی طرف سے ہماری نگاہوں کو ہٹالے۔ اے اللہ! ہمارے دلوں کو تیری ذات ہی کے اوپر، اور صرف تجھ ہی سے متعلق فرمادے۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی مانگی، وہ ہمیں عطا فرما، اور جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اَنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

وَصَلیٰ اللهُ تُعَالیٰ عَلیٰ خَیْرِ خَلْقِهٖ وَنُوْرِعَرْشِهٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ

اَلْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ

بھلائی کا حکم کرنا

اور

برائی سے روکنا

﴿مجلس ۳﴾

شوال المکرّم ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۸/فروری ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد.

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رَاىٰ خَاتَمًامِنْ ذَهَبٍ فِىْ يَدِرَجُلٍ فَنَزَعَهٗ فَطَرَحَهٗ وَقَالَ:يَعْمِدُأَحَدُكُمْ اِلىٰ جَمْرَةٍمِنْ نَارٍفَيَجْعَلُهَافِىْ يَدِهٖ،فَقِيْلَ لِلرَّجُلِ بَعْدَمَاذَهَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ،خُذْخَاتَمَكَ اِنْتَفِعْ بِهٖ.قَالَ:لَاوَاللّٰهِ!لَاآخُذُهٗ اَبَدًاوَقَدْطَرَحَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم

مردوں کے لئے سونا اور ریشم منع ہے

آپ کو معلوم ہے کہ یہ باب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں چل رہا ہے، بھلی بات کی لوگوں کو تاکید اور حکم کرنا اور برائی اور گناہ کی چیز سے لوگوں کو روکنا۔ اسی سلسلے میں یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب سونا مردوں کے لئے حرام ہو چکا تھا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی نکال کر پھینک دی اور ارشاد فرمایا کہ تم میں کا کوئی آدمی جہنم کا انگارا لے کر اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے یعنی اس کو پہنتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی کو جہنم کے انگارے سے تعبیر فرمایا، چونکہ یہی چیز کل کو جہنم میں انگارے کی شکل اختیار کرے گی اور اس کے ذریعہ اس کو عذاب دیا جائے گا، اس لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے شریعتِ محمدیہ میں مردوں کے لئے سونے اور ریشم کے

استعمال کو حرام قرار دیا، البتہ عورتوں کے لئے اس کی اجازت ہے اسی لئے حضورِ اکرم ﷺ نے اس کے ہاتھ میں جو سونے کی انگوٹھی تھی اس کو خود اپنے دستِ مبارک سے نکال کر پھینک دیا یہاں تو صرف یہ بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ برائی کا کام جو حضور نے اپنی نگاہوں سے دیکھا اس کو اپنے ہاتھ سے دور کیا۔ چونکہ شروع میں روایت آچکی ہے کہ کوئی آدمی شریعت کے خلاف کوئی کام دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے دور کرے، نبی کریم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے نکال کر اس کو پھینکا، اس مناسبت سے اس روایت کو اس باب میں لائے ہیں کہ آپ نے اپنے فعل سے منکر پر نکیر فرمائی۔

اس موقعہ پر یہ چیز یاد رہے کہ آج کل ہمارے یہاں مردوں میں سونے کی انگوٹھی استعمال کرنے کا اور گلے کے اندر سونے کی چین استعمال کرنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے، خاص کر کے نوجوانوں میں یہ چیز بڑھتی جا رہی ہے، حالانکہ مردوں کے لئے اس کا استعمال حرام ہے، نبی کریم ﷺ نے اس کو آگ کے انگارے سے تعبیر کیا۔ اسی لئے اپنے عزیزوں میں اگر کسی کو اس طرح استعمال کرتے ہوئے دیکھے تو اس کو محبت سے سمجھا کر دور کر دے۔ یہ بہت اہم چیز ہے، اس کی وجہ سے آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نظرِ رحمت سے دور رہتا ہے، شیطان کو اس سے قریب ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔

﴿صحابہ کے جذبۂ اطاعت کی ایک مثال﴾

اب نبی کریم ﷺ نے تو اس کے ہاتھ سے نکال کر اس لئے پھینک دیا تھا کہ آپ بتلانا چاہتے تھے کہ اس کا پہننا جائز نہیں ہے، باقی آپ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آدمی بالکل اس کو چھوڑ دے۔ اگر وہ اس کو لے کر بیچتا اور اس کی قیمت اپنے کام میں لانا چاہتا، یا اس انگوٹھی کو

اپنے گھر کی عورتوں بہن ماں وغیرہ کو دیتا کہ وہ استعمال کرتیں؛ تو شریعت کی طرف سے اس کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔

چنانچہ ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کے ہاتھ پر سونے کی انگوٹھی دیکھی تو آپ نے فرمایا اس کو پھینک دو۔ بعد میں جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور نے پوچھا وہ انگوٹھی کیا ہوئی؟ اس نے کہا کہ آپ نے فرمایا تھا تو میں نے پھینک دی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ تم اس سے فائدہ مت اٹھاؤ یعنی تم اس کو مت پہنو، باقی اس کو بیچ کر اس کی قیمت استعمال میں لانا چاہو؛ تو اس کی اجازت ہے۔ یہاں پر بھی چونکہ آپ ﷺ نے اس کو انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھا تھا اور سونے کی انگوٹھی کا پہننا حرام ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ نے خود اپنے دستِ مبارک سے نکال کر پھینک دیا۔ گویا آپ اس کو اس برے کام سے روکنا چاہتے تھے، باقی آپ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ یہ آدمی اس انگوٹھی کو بالکل چھوڑ دے، اگر وہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت سے فائدہ اٹھانا چاہتا یا اپنے گھر کی عورتوں کو دیتا کہ وہ استعمال کرتیں؛ تو اس کی اجازت تھی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ جب مجلس سے تشریف لے گئے تو لوگوں نے اس سے یوں کہا کہ یہ انگوٹھی جو حضور ﷺ نے تمہارے ہاتھ سے نکال کر پھینک دی ہے اس کو لے لو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ، اپنے دوسرے کام میں لاؤ۔ لیکن صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ جو تعلق تھا اور جو محبت تھی اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ جس چیز کو حضور اکرم ﷺ پھینک دیا؛ بھلا وہ دوبارہ اس کو کیسے ہاتھ لگا سکتے تھے؟ لہٰذا ان صحابی نے کہا کہ اللہ کی قسم! اس انگوٹھی کو جب نبی کریم ﷺ نے پھینک دیا تو میں ہرگز اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

﴿حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ﴾

عن أبی سعیدالحسن البصری أن عائذبن عمرو رضی اللہ عنہ دَخَلَ عَلیٰ عُبَیْدِاللّٰہِ بنِ زِیَاد فقال: اَیْ بُنَیَّ! اِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ: اِنَّ شَرَّ الرِّعَآءِ الْحُطَمَۃُ، فَاِیَّاکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنْھُمْ. فَقَالَ لَہُ: اِجْلِسْ فَاِنَّمَا اَنْتَ مِنْ نُخَالَۃِ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم. فَقَالَ: وَھَلْ کَانَتْ لَھُمْ نُخَالَۃٌ، اِنَّمَا کَانَتِ النُّخَالَۃُ بَعْدَھُمْ وَفِیْ غَیْرِھِمْ. (رواہ مسلم)

یہ اِس باب کی نویں روایت لائے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جو اکابرِ تابعین میں سے ہیں اس کے راوی ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ تھیں، وہ کبھی کسی کام کے لئے گئی ہوئی ہوتیں تو ان کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس چھوڑ کر کے جاتیں اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ چھوٹے دودھ پیتے تھے، کبھی وہ روتے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ان کو اپنی چھاتی سے لگاتی اور اپنا پستان ان کو دیتیں تھیں، جو دودھ اترتا اس کو وہ پیتے تھے۔ چنانچہ بڑے فصیح و بلیغ تھے، ان کے خطبات اور فصاحت و بلاغت بڑی معروف ہے، کتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ میں ان کے بلیغ کلمات کو مؤرخین نے نقل کیا ہے لکھا ہے کہ ان کی یہ فصاحت و بلاغت حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس دودھ کا اثر تھا اور تصوف کے بھی تمام سلسلے انہیں سے جا کر ملتے ہیں، ان کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتے ہیں۔

﴿حضرت عائذ رضی اللہ عنہ کی نصیحت عبیداللہ بن زیاد کو﴾

حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، ۶۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ایک مرتبہ یہ عبیداللہ بن زیاد کے پاس گئے جو یزید بن معاویہ کی طرف سے کوفہ اور عراق کا گورنر تھا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ جس لشکر نے جنگ کی تھی تو یزید کی طرف سے اس لشکر کا سپہ سالار

یہی عبید اللہ بن زیاد تھا۔ تو ایک دن حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا ﴿اَیْ بُنَیَّ!﴾ اے بیٹے! چونکہ وہ عمر میں چھوٹا تھا اور چھوٹوں کو کبھی بیٹے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ﴿اِنَّ شَرَّ الرِّعَآءِ الْحُطَمَةُ﴾ بدترین چرواہے وہ ہوتے ہیں جو اپنے بھیڑوں کو، جانوروں کو اور بکریوں کو بہت سختی کے ساتھ ہانکتے ہیں۔ اگر بکریوں کو ہانکنے والا سختی کے ساتھ ان کو ہانکے، زور زور سے ڈنڈے مارے، تو وہ تیزی دکھلانے کے واسطے ایک دوسرے پر گرتی ہیں اور تکلیف اٹھاتی ہیں۔

یہاں حکمران طبقہ کو چرواہے سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جیسے چرواہا بکریوں کا نگران ہوتا ہے اسی طرح حکمران بھی اپنے عوام اور پبلک کا نگران ہوتا ہے۔ کہنے کا حاصل یہ تھا کہ جیسے ان چرواہوں کو نبی کریم ﷺ نے بدترین چرواہا قرار دیا جو اپنی بکریوں کے ساتھ سختی کا معاملہ کرتے ہیں اسی طریقے سے جو حکمران اپنے عوام کے ساتھ، ماتحتوں کے ساتھ، رعیت کے ساتھ سختی کا معاملہ کریں وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ اسی لئے حضرت عائذ رضی اللہ عنہ نے یہ روایت نقل کر کے اس کو تاکید کی: ﴿فَاِيَّاكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنْهُمْ﴾ تو ایسا مت بنیو۔ چونکہ یہ بھی ظلم و زیادتی کیا کرتا تھا۔ بس! یہاں نہی عن المنکر والی بات پائی گئی کہ وہ جس برائی میں اور ظلم و زیادتی میں مبتلا تھا اس کو یہ روایت سنا کر حضرت عائذ نے اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ یہ نہی عن المنکر پر عمل ہوا۔

﴿ایں خانہ ہمہ آفتاب است﴾

﴿فَقَالَ لَهُ: اِجْلِسْ فَاِنَّمَا اَنْتَ مِنْ نُخَالَةِ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ ﷺ﴾ اس پر عبید اللہ نے حضرت عائذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بیٹھو! آپ تو نبی کریم ﷺ کے صحابہ کا بھوسہ ہو۔ آٹے کو چھلنی سے جب چھانا جاتا ہے تو جو چھلکے چھلنی کے اندر رہ جاتے ہیں، جس کو ہم بھوسہ کہتے ہیں اس کو عربی

زبان میں ﴿نُخَالَۃٌ﴾ کہا جاتا ہے۔تو وہ ان کو یوں کہتا ہے کہ تم نبی کریم ﷺ کے صحابہ کا بھوسہ ہو بیٹھ جاؤ۔اس پر حضرت عائذ رضی اللہ عنہ نے کہا ﴿وَهَلْ كَانَتْ لَهُمْ نُخَالَةٌ؟﴾ صحابہ میں بھی کوئی بھوسہ تھا؟ بھوسہ تو آٹے کا ردی حصہ سمجھا جاتا ہے، گویا مجھے تم صحابہ کا بھوسہ کہہ کر جو تعبیر کرتے ہو،اس کا مطلب یہ ہوا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے جن کو نعوذ باللہ گھٹیا درجے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے،اس لئے انھوں نے استفہامِ انکاری کے طور پر اس کی اس بات پر نکیر کرتے ہوئے کہا کہ کیا صحابۂ کرام میں بھی بھوسہ تھا؟ ﴿اِنَّمَا كَانَتِ النُّخَالَةُ بَعْدَهُمْ وَفِي غَيْرِهِمْ﴾ ارے یہ بھوسہ والی بات تو بعد میں آئی۔صحابہ تو سب کے سب اعلیٰ درجے کے تھے۔

نبی کریم ﷺ کا صحابۂ کرام کے سلسلے میں ارشاد ہے ﴿أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ﴾ میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں کسی ایک کا بھی تم اتباع کرلو،کسی کو بھی چن لو،اس کے ذریعہ سے تم کو راہ مل جائے گی۔گویا حضرت عائذ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ تم صحابۂ کرام کی جماعت کے سلسلے میں ایسے الفاظ جو استعمال کرتے ہو؛ بالکل غلط ہے۔

﴿ظالم حکام کیوں مسلّط ہوتے ہیں؟﴾

عَنْ حُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْلَيُوشِكَنَّ اللّٰهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِّنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ.

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تم لوگ بھلی بات کا حکم کرتے رہو اور بری بات سے روکتے رہو، یا تو پھر قریب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے اوپر اپنی طرف سے

کوئی سزا یا عذاب بھیجے، پھر تم اس کے دور ہونے کی دعا کرو لیکن تمہاری دعا قبول نہ کی جائے

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ امت کے اندر ہر معاشرہ اور ہر جماعت میں، ہر علاقے، بستی اور ہر محلے میں ہر جگہ باقی رہنا چاہیے۔ جہاں کہیں بھی کچھ مسلمان آباد ہوں وہاں سب نہیں تو کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہوں کہ جو ہر برائی کے اوپر نکیر کرتے ہوں اور ٹوکتے ہوں اور بھلائی کا حکم کرتے ہوں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے گا تب تو اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں آئے گا۔

دیکھو! اگر کوئی آدمی برائی کا کام تنہائی میں کرتا ہے تو وہ اس کا ذمہ دار ہے، لیکن برائی کا کام کھلّم کھلاّ کیا جائے اور لوگ دیکھ رہے ہیں اور کوئی اس کو ٹوکتا نہیں، اس پر نکیر نہیں کرتا، تو جو نکیر نہیں کرتا وہ بھی حکماً اس کے اندر شریک سمجھا جاتا ہے۔ گویا اس نے بھی سکوت اختیار کر کے اس کا ساتھ دیا۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سب ہی اس گناہ میں شریک ہوئے، کوئی عمل کر کے، تو کوئی خاموشی اختیار کر کے۔ جب اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عذاب آئے گا تو کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑنے کی صورت میں عام طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب مسلط کیا جاتا ہے؛ وہ ظالم حکمرانوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ آج کل ہر جگہ یہی شکایت ہے کہ حکمران ظلم وزیادتی کرتے ہیں۔ ہر آدمی یہی شکایت کرتا ہے اور پھر اس سلسلے میں دعائیں بھی ہوتی ہیں لیکن حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ﴾ اس وقت تم اس مصیبت کے دور ہونے کے واسطے دعائیں بھی کرو گے تو تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔ اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ باقی رہنا چاہیے اگر ہر جگہ یہ سلسلہ جاری رہے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عمومی عذاب نہیں آئے گا۔

﴿افضل ترین جہاد﴾

عن أبی سعیدالخدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قَالَ: أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جائِرٍ ....

عن عبداللہ طارق بن شهاب البجلی الاحمسی رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلاً سَئَلَ النَّبِيَّ ﷺ وَقَدْ وَضَعَ رِجْلَهُ فِي الْغَرْزِ اَيُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟ قَالَ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جائِرٍ....

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہترین جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی اور حق کی بات کرنا ہے۔ دوسری روایت اسی طرح کی ہے حضرت طارق بن شہاب بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ سواری پر سوار ہورہے تھے اور رکاب میں پاؤں ڈال رہے تھے (جو گھوڑے کے دونوں طرف لٹکا ہوا رہتا ہے جس میں پاؤں ڈال کر آدمی سوار ہوتا ہے جس کو گجراتی میں પેગડા کہتے ہیں) اس وقت نبی کریم ﷺ سے کسی نے پوچھا: ﴿اَيُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟﴾ کون سا جہاد سب سے بہتر ہے؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جائِرٍ﴾ ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا بہترین جہاد ہے۔

اس کو بہترین جہاد سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو آدمی قتال اور جہاد کے واسطے کافروں کے لشکر کے مقابلہ میں نکلتا ہے تو وہاں یہ امکان بھی ہے کہ وہ کامیابی حاصل کر کے صحیح سلامت واپس آجائے، لیکن ظالم حکمران کے مقابلہ میں جب وہ حق بات کہے گا تو وہاں پر اس کی ہلاکت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کو افضل اس لئے قرار دیا گیا کہ جہاں یقین ہے کہ اس کو ظالم حکمران کی طرف سے تکلیف پہنچائی جائے گی، جان یا مال کا نقصان

ہے، اس کے باوجود حق بات کا اس کے سامنے اظہار کرتا ہے۔ اس لئے اس آدمی کے مقابلہ میں اس کو افضل قرار دیا گیا ہے۔

﴿بنی اسرائیل میں بگاڑ کیسے شروع ہوا؟﴾

عن ابن مسعودٍ رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: اِنَّ اَوَّلَ مَادَخَلَ النَّقْصُ عَلیٰ بَنِي اِسْرائِيلَ اَنَّهُ كَانَ الرَّجُلُ يَلْقَى الرَجُلَ فيقول: ياهٰذَا! اِتَّقِ اللهَ وَدَعْ مَاتَصْنَعُ، فَاِنَّهُ لايَحِلُّ لَكَ، ثُمَّ يَلْقَاهُ مِنَ الْغَدِوَهُوَعَلیٰ حَالِهٖ فَلاَيَمْنَعُهُ ذَالِكَ اَن يَّكُوْنَ اَكِيْلَهُ وَشَرِيْبَهُ وَقَعِيْدَهُ، فَلَمَّافَعَلُوْاذَالِكَ ضَرَبَ اللهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ. ثم قال: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَوَعِيْسٰى ا بْنِ مَرْيَمَ ذَالِكَ بِمَاعَصَوْا وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَايَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَاكَانُوْايَفْعَلُوْنَ. تَرٰى كَثِيْرًامِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَاقَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللهُ عَلَيْهِمْ وَفِى الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُوْنَ وَلَوْكَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَالنَّبِيِّ وَمَااُنْزِلَ اِلَيْهِ مَااتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًامِنْهُمْ فَاسِقُوْنَ. ثُمَّ قَالَ: كَلَّا وَاللهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَلَتَأْخُذُنَّ عَلٰى يَدِالظَّالِمِ، وَلَتَأْطِرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا، وَلَتَقْصُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِ قَصْرًا، اَوْلَيَضْرِبَنَّ اللهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ، ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَالَعَنَهُمْ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلے بنواسرائیل کے اندر جو کمی آئی اور سب سے پہلا بگاڑ جو پیدا ہوا اس کی صورت یہ تھی کہ کوئی آدمی اگر برائی کا کام کررہا ہے، گناہ کا ارتکاب کررہا ہے، تو دوسرا آدمی جب اس سے ملاقات کرتا تھا جو اس گناہ میں مبتلا نہیں ہے وہ اس کو تنبیہ کرتا تھا اور نصیحت کرتا تھا ٹوکتا تھا

کہتا تھا: ارے بھلے آدمی! اللہ سے ڈرو، اور یہ جو تم کررہے ہو، جس گناہ کے اندر تم مبتلا ہو اس کو چھوڑ دو، ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ شروع میں ایسا ہوتا تھا کہ اس کو دیکھا کہ شراب پی رہا ہے تو اس کو تنبیہ کردی کہ مت پیو۔ زنا کاری میں مبتلا ہے تو تنبیہ کردی کہ مت کرو۔ سود کھا رہا ہے تو اس کو تنبیہ کردی کہ مت کھاؤ، یہ گناہ کا کام ہے، حرام ہے۔ کسی بھی برائی کے اندر کوئی مبتلا ہوتا تو شروع شروع میں یہ ہوتا تھا کہ ایک دو روز کے لئے اس کو تنبیہ کرتا تھا کہ ایسا مت کرو۔ پھر دو چار دنوں کے بعد جب دیکھا کہ وہ نہیں مانتا تو اس کے باوجود اس کے ساتھ تعلق باقی رکھتا تھا یعنی بعد میں اس کو روکتا نہیں تھا، حالانکہ اس کے ساتھ کھا پی رہا ہے، اس کا ہم پیالہ ہے، ہم نوالہ ہے، اٹھنا بیٹھنا سب ساتھ میں ہے، ہم نشین ہے۔

﴿پھر اس برائی کی برائی دل سے نکل جاتی ہے﴾

﴿فَلَمَّا فَعَلُوْا ذٰلِکَ ضَرَبَ اللّٰہُ قُلُوْبَ بَعْضِھِمْ بِبَعْضٍ﴾ جب ان لوگوں نے ایسا کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے بعض کے دلوں کو دوسرے بعض کے ساتھ خلط ملط کردیا۔ یعنی وہ لوگ جو برائی میں مبتلا نہیں تھے گناہ کا کام نہیں کرتے تھے اور انھوں نے ان گناہ کا کام کرنے والوں کو شروع میں روکا لیکن بعد میں روکنے کا سلسلہ بند کردیا، اور ان کے ساتھ کھانے پینے کے تعلقات باقی رکھے تو اللہ تعالیٰ نے دلوں کو خلط ملط کردیا۔ دیکھو! کسی اچھی چیز میں بری چیز کو خلط ملط کردیا جائے تو وہ اچھی چیز بھی بری بن جاتی ہے، یعنی ان نہ کرنے والوں کے دلوں میں اس گناہ کے کام کی جو برائی، شناعت، قباحت اور اس کی جو گندگی تھی، اس کو جو برا سمجھتے تھے وہ برا سمجھنا ختم ہوگیا۔ اب وہ بھی اس کو برا نہیں سمجھ رہے ہیں یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان پر ایک وبال تھا۔

برائی سے اگر کوئی روکتا رہے، تو اس کی برائی اس کے دل میں بھی باقی رہے گی۔ اور اگر روکتا نہیں رہے گا بلکہ روکے بغیر اس کو دیکھتا رہے گا تو ایک وقت آئے گا کہ اس خاموشی کے نتیجے میں اس کے دل میں سے بھی اس برائی کی قباحت دور ہو جائے گی۔

مثال کے طور پر بیٹا ٹی وی لے کر آیا، باپ کو پسند نہیں ہے، اس نے منع کیا کہ بیٹا ٹی وی مت رکھیو، بہت گناہ ہے، حرام ہے۔ بہت سمجھایا لیکن بیٹا نہیں مانا، اس کے باوجود باپ نے اس کے ساتھ اپنا تعلق کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سارا سلسلہ باقی رکھا، اب روزانہ جب اس کو کرتے دیکھے گا تو دھیرے دھیرے اس کے دل میں سے بھی ٹی وی کی برائی نکل جائے گی۔ یہ قدرتی عمل ہے اور ایک نفسیاتی چیز ہے کہ کسی برائی کو آپ بار بار دیکھتے رہیں تو پھر اس کی برائی دل میں سے نکل جاتی ہے۔

جیسے گوبیلس کا اصول ہے کہ ایک جھوٹ کو آپ بار بار دہراتے رہیے؛ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سننے والا اس جھوٹ کو بھی سچ سمجھنے لگے گا۔ اسی طرح یہ برائی بھی آپ کے سامنے ہوتی رہے اور آپ اس پر نکیر نہ کریں تو ایک وقت آئے گا کہ آپ کے دل میں سے بھی اس کی برائی نکل جائے گی۔ نکیر کا سلسلہ اگر قائم رکھیں یا اس سے آپ اپنا تعلق منقطع کر لیں؛ تب تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ آپ کے دل میں اس برائی کی برائی باقی رہے گی۔

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے قرآنِ پاک کی یہ آیت پڑھی: ﴿لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ. تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَفِی الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُوْنَ. وَلَوْ کَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِیِّ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ وَلٰکِنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ﴾ بنو اسرائیل میں سے جن

لوگوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اللہ کا انکار کیا ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی طرف سے لعنت کی گئی اور بددعا کی گئی، یہ اس لئے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود سے آگے بڑھتے تھے، وہ جس برائی کے کام میں مبتلا تھے ایک دوسرے کو اس سے روکتے نہیں تھے اور بہت بری تھی وہ حرکت جس کا وہ ارتکاب کررہے تھے۔ گویا برائی کے کام میں مبتلا ہونے کی صورت میں اگر روکنے کا سلسلہ نہیں رہے گا تو پھر یہی ہوگا۔ ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ اہلِ کفر کے ساتھ دوستی کیئے ہوئے ہیں، بہت برا ہے وہ جوان کے سامنے ان کا نفس اور جی پیش کررہا ہے۔

﴿ورنہ تمہارے ساتھ بھی بنی اسرائیل والا معاملہ ہوگا﴾

﴿ثُمَّ قَالَ: كَلَّا وَاللهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ پھر حضور ﷺ نے اس مثال کو سنا کر اور بنواسرائیل کا حال سنا کر اپنی امت کو تاکید فرمائی کہ دیکھو! پہلے ایسا ہو چکا ہے، اور اپنی امت کے متعلق حضور ﷺ نے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت پر بھی وہی حالات گذریں گے جو بنواسرائیل کے اوپر گذرے ہیں ﴿حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ﴾ جیسا کہ ایک جوتا دوسرے جوتے کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔ جب یہ حال بتلایا تو اب اپنی امت کو تاکید فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! تم لوگ بھلی بات کا حکم کرتے رہیو اور بری بات سے روکتے رہیو، اور ظالم کے ہاتھ کو پکڑتے رہیو۔ کوئی آدمی اگر ظلم کررہا ہے تو اس کو ظلم سے روکنے کی کوشش کرتے رہنا۔ اور حق کی طرف اس کو موڑتے رہیو، یعنی وہ حق سے ہٹنا چاہتا ہو تو اس کو پکڑ پکڑ کر حق کی طرف لاتے رہیو۔ اور حق پر اس کو جماتے رہیو۔ اگر تم ایسا نہیں کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو بھی بعض کے ساتھ خلط ملط کردے گا۔ یعنی وہی معاملہ جو بنواسرائیل کے ساتھ کیا گیا تھا تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ چونکہ انھوں نے بھی شروع میں تو

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا، بعد میں وہ سلسلہ چھوڑ دیا اور آپس کے تعلقات جوں کے توں باقی رکھے تو جس مصیبت اور بلا میں وہ گرفتار ہوئے تھے اسی میں تم بھی گرفتار ہو جاؤ گے ﴿ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ﴾ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ تم پر بھی لعنت بھیجے گا اور تم کو اپنی رحمت سے دور کر دے گا جیسے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا تھا۔

اس لئے آدمی یہ نہ سمجھے کہ ایک دو مرتبہ کہہ دیا اور وہ نہیں مانتا، تو ہمارا کام پورا ہو گیا۔ اگر وہ نہیں مانتا تو شریعت یہ حکم دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعلقات باقی نہ رکھیں۔ سمجھا کر دیکھ لیا اور نہیں مانتا تو تعلق قطع کر لیجئے، اس کی وجہ سے مان جائے گا۔ اگر نہیں مانے گا تو کم از کم اس صورت میں آپ تو اپنے کو اس برائی میں مبتلا ہونے سے بچالیں گے۔

ترمذی شریف کی روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بنو اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے ان کو ان گناہوں سے منع کیا لیکن وہ لوگ گناہوں سے باز نہیں آئے ﴿فَجَالَسُوْهُمْ فِي مَجَالِسِهِمْ وَاٰكَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ﴾ اس کے باوجود بھی ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا جاری رکھا، ان سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایک کے دلوں کو دوسروں کے دلوں کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور ان پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی لعنت بھیجی ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ یہ ان کی نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ جس وقت آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس وقت نبی کریم ﷺ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر آپ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: ﴿لَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ حَتّٰی تَأْطِرُوْهُمْ عَلَی الْحَقِّ اَطْرًا﴾ اللہ کی قسم! تم بھی نہیں بچ سکتے جب تک کہ ان گناہوں میں مبتلا لوگوں کو موڑ نہ دو (ترمذی شریف، حدیث نمبر ۲۹۷۳) تمہاری طرف سے یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان گناہوں سے اُن کو ہٹایا جائے اور دور کیا جائے۔

﴿ہمارا متضاد طرزِ عمل﴾

دیکھو! یہ ساری روایتیں جو بھلی بات کا حکم کرنے اور بری بات سے روکنے کے سلسلے میں آئیں، تو پہلے بھی آ چکا ہے کہ آدمی اگر اپنے ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو، تو ہاتھ سے روکے۔ اگر نہیں تو زبان سے روکے، اور یہ بھی نہیں ہے تو دل سے اس کو برا سمجھے۔

ہم اپنے معاشرے میں دیکھیں تو بہت سے افراد وہ ہوتے ہیں جو اپنے ماتحت یعنی اپنی اولاد ہے، اولاد کی اولاد ہے، یا اگر خاندان میں بڑا ہے، صاحبِ اثر ورسوخ ہے، یا اپنی جماعت اور برادری کے اندر اس کا اثر ورسوخ ہے، تو ماتحتوں پر اس کو قدرت ہے کہ ان کو برائی سے روکے؛ تو پھر اس کی کوشش یہی ہونی چاہیے۔

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے تو بیٹے کو روکا لیکن کیا کریں، وہ نہیں رُکتا۔ نماز نہیں پڑھتا، ہم نے تو بہت کہا کہ بیٹا! نماز پڑھو، لیکن نہیں پڑھتا، کیا کریں؟ اس کو اس کی قبر میں سونا ہے ہم کو اپنی قبر میں سونا ہے۔ تو غور کیجیے کہ اگر وہی بیٹا کاروبار میں دھیان نہیں دیتا، دوکان پر نہیں بیٹھتا، اور اس سلسلے میں آپ کی طرف سے دی گئی ہدایتوں پر عمل نہیں کرتا، تو اس صورت میں بھی آپ یہی جواب دے کر بیٹھے رہتے؟ اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتے؟ اس کی طرف سے چشم پوشی کرتے؟ کیا اس کی غفلت، سستی اور کاہلی کو آپ چپ چاپ برداشت کرتے کہ ٹھیک ہے چلو! اب نہیں مانتا تو ہم کما کر کھلائیں گے؟ نہیں! اس صورت میں آپ کی طرف سے باقاعدہ وارننگ دی جائے گی کہ دیکھو! اگر کاروبار کی طرف دھیان نہیں دیتے، دوکان پر نہیں بیٹھتے، تو اتنے دنوں کی مہلت دیتا ہوں، پھر گھر چھوڑ دینا، تم اپنا نبھالینا، وہاں تو باقاعدہ دھمکی دی جاتی ہے، اور وہاں یہ معاملہ نہیں ہوتا، بلکہ

ناراضگی کا بڑی شدت کے ساتھ اظہار ہوتا ہے، اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو اپنے دوسرے لوگوں سے کہہ کر اس کو تنبیہ کروائی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو طریقہ اُس صورت میں اختیار کیا جاتا ہے، کیا نماز نہ پڑھنے کی صورت میں یا گناہوں میں مبتلا ہونے کی صورت میں یا کسی برائی کے ارتکاب پر تنبیہ کرنے کے معاملے میں بھی وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں؟ ظاہر ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے، آسمان زمین کا فرق ہے۔ معلوم ہوا کہ ہماری طرف سے جس قسم کی روک تھام کی جانی چاہیے تھی اور اس کے لئے جس قوت کے ساتھ ہمیں اس کو روکنا تھا؛ وہ کرتے نہیں ہیں۔

ہاں! یہی معاملہ اگر کاروبار یا دوسری لائن میں پیش آتا، تو ہم جو تدبیریں اپنا سکتے تھے، وہی ساری تدبیریں اور طریقے اس کی اصلاح اور سدھارنے کے دینی معاملے میں یا گناہ کے ارتکاب کرنے کے معاملے میں آزمالئے، پھر بھی نہیں مانتا؛ تو بات دوسری ہے، آپ کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے۔

آپ کا بیٹا اگر حکومت کے کسی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، کسی ایسی جماعت میں شریک ہو گیا جس کے اوپر حکومت نے پابندی لگا رکھی ہے، آپ کو معلوم ہو جائے کہ اِس کا تعلق اُس جماعت سے ہے تو آپ لرز جائیں گے اور ڈر جائیں گے کہ اس کی وجہ سے ہمارے پورے گھر پر مصیبت نہ آجائے۔ آپ اس کو تنبیہ کر دیں گے کہ آج کے آج تمہارا یہ معاملہ صاف ہو جانا چاہیے؛ ورنہ میرا گھر چھوڑ دو۔ تمہاری وجہ سے ہمیں تکلیف اٹھانی پڑے گی، کہیں جیل نہ بھگتنی پڑے۔ تو ہمارا بیٹا دنیوی حکومت کی خلاف ورزی کرتا ہے یا اس کی بغاوت کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے، ان سے دوستی کرتا ہے تو اس صورت میں باپ ڈرا سہما

رہتا ہے، لرزاں رہتا ہے، تو پھر اگر بیٹا اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کررہا ہے اس کے باوجود ہمیں کوئی خوف نہ ہو؛ تو یہ واقعتاً سوچنے کی چیز ہے۔

﴿ایک ممکنہ غلط فہمی کا ازالہ﴾

عن أبی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ قال: یاأیھا الناس اِنَّکُمْ لَتَقْرَؤُوْنَ هٰذِهِ الْاٰیَةَ: ”یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ أَنْفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَااهْتَدَیْتُمْ“ وَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ، فَلَمْ یَأْخُذُوْا عَلیٰ یَدَیْهِ، أَوْشَکَ أَنْ یَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ مِنْهُ.

یہ روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ قرآنِ پاک کی ایک آیت ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی تھی، اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو: ﴿یَااَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَااهْتَدَیْتُمْ﴾ اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو، اپنی درستگی کی طرف توجہ کرو، اگر تم راہِ راست پر آگئے تو جو راستہ سے ہٹا ہوا ہے، گمراہی میں مبتلا ہے، اس کا گمراہی میں ہونا؛ تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اب اس آیت کی وجہ سے شاید کوئی یوں سمجھے کہ دنیا کچھ بھی کرتی رہے، میرا بیٹا کچھ بھی کرے، میری بیوی کچھ بھی کرے، میرے گھر والے کچھ بھی کریں، اگر میں نماز پڑھتا ہوں، اور شریعت پر عمل کرتا ہوں؛ تو بس کافی ہے، اس لئے کہ قرآن میں ہے ﴿لَایَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَااهْتَدَیْتُمْ﴾ تم اگر راہِ راست پر آگئے، اور سدھر گئے، تم نے اپنا معاملہ ٹھیک اور درست کرلیا، اب کوئی آدمی اگر گمراہی میں مبتلا ہے تو تمہارے لئے اس کا گمراہی میں مبتلا ہونا مضر نہیں ہے۔

اس آیت سے شاید کسی کو غلط فہمی ہو، اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

کہ اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو لیکن مَیں نے حضورِ اکرم ﷺ سے یہ بھی سنا ہے: ﴿اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ یَأْخُذُوا عَلٰی یَدَیْهِ أَوْشَکَ أَن یَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ مِنْهُ﴾ لوگ اگر ظالم کو اور اللہ تعالیٰ کے نافرمان کو دیکھیں کہ وہ نافرمانی میں مبتلا ہے اس کے باوجود اس کو روکتے نہیں ہیں تو اس صورت میں ڈر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب پر عذاب آجائے۔

اس سے معلوم ہوا آدمی راہِ راست پر اسی وقت کہلائے گا جب وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایتوں پر پوری طرح عمل کرے۔ اور اس نے ہی یہ حکم بھی دیا ہے کہ جب تم خود شریعت پر عمل کر رہے ہو، اور جو لوگ برائی میں مبتلا ہیں ان کو پوری کوشش کے ساتھ روک بھی رہے ہو، اس کے باوجود وہ برائی سے باز نہیں آرہے ہیں؛ اب تمہارے لئے کوئی نقصان کی چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسی بات نہیں ہے، آپ نے ان کو برائی سے نہیں روکا، یا معمولی درجہ میں روکا اور جتنی قوت استعمال کرنی چاہیے، وہ نہیں کی؛ تو پھر ﴿اِذَا اهْتَدَیْتُمْ﴾ پر عمل ہی نہیں ہوا۔ جب تم نے ہدایت پر عمل نہیں کیا تو پھر تمہارے لئے ﴿لَا یَضُرُّکُمْ﴾ والی گارنٹی نہیں ملے گی۔ یہ گارنٹی تو اُسی صورت میں مل سکتی ہے، جب ہم اللہ تعالیٰ اور رسولِ پاک ﷺ کی طرف سے دی گئی تمام ہدایتوں پر عمل کرلیں۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی انہیں ہدایتوں میں سے ہے۔ اگر ہم اس پر بھی عمل کرلیں تو پھر آگے کہا جارہا ہے کہ اب تمہارے لئے کوئی نقصان نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی رضامندی کی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر والے فریضے کو انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے

﴿آمین﴾

تَغْلِیْظُ عُقُوْبَةِ مَنْ أَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ أَوْنَهٰی عَنْ مُنْكَرٍ وَخَالَفَ قَوْلُهٗ فِعْلَهٗ

﴿قول اور عمل میں تضاد پر سخت سزا﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد.

أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّوَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتَابَ أَفَلاَ تَعْقِلُوْنَ

و قال تعالیٰ: یَاأَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْالِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَاتَفْعَلُوْنَ کَبُرَمَقْتًاعِنْدَاللّٰہِ أَنْ تَقُوْلُوْامَالَاتَفْعَلُوْنَ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پچھلا باب قائم کیا تھا جس میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم بیان کیا تھا اور اسی سلسلے میں روایتیں پیش کی تھیں ۔اب ایک اور باب قائم کرتے ہیں جس میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جو آدمی بھلی بات کا حکم کرے اور بری بات سے روکے اور خود اس کا قول اس کے فعل کے خلاف ہو، یعنی وہ خود جو کہتا ہے اس کے مطابق کرتا نہیں ہے، بھلی بات کی لوگوں کو تاکید کرنے کے باوجود خود اس پر عمل نہیں کرتا، برائیوں سے لوگوں کو روکنے کے باوجود خود اس سے باز نہیں آتا؛ تو ایسے آدمی کے واسطے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کیسی سخت سزا ہے۔

علماءِ یہود حضور ﷺ کی حقانیت سے واقف تھے

اس سلسلے میں سب سے پہلے آیتِ کریمہ لائے ہیں جس میں علماءِ یہود کو خطاب ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جو یہود مدینہ منورہ میں آباد تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا، وہ لوگ اپنی کتاب توریت میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کے متعلق پڑھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آخری

زمانے میں ایک پیغمبر کو بھیجے گا جو آخری نبی ہوں گے، ان کی یہ یہ نشانیاں ہیں اور جو نشانیاں بتلائی گئی تھیں ان کو وہ جانتے تھے اور سمجھتے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ جو علامتیں نبی آخر الزماں کی ہماری کتاب میں بتلائی گئیں ہیں وہ آپ ﷺ کے اندر پورے طور پر موجود ہیں۔ قرآن میں اسی کو ایک جگہ یوں فرمایا گیا ہے: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ أَبْنَاءَ هُمْ﴾ وہ نبی کو ایسا جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ جیسے آدمی کو اپنے بیٹے کے متعلق اپنا بیٹا ہونے کا یقین ہوتا ہے، ان علماءِ یہود کو اس سے بھی زیادہ یقین تھا کہ آپ ﷺ آخری پیغمبر ہیں اور ہماری کتاب میں جس نبی آخر الزماں کی آمد اور بعثت کی خبر دی گئی ہے، آپ ﷺ وہی ہیں۔

کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے- جو پہلے یہودی تھے اور توریت کے عالم تھے- ایک مرتبہ پوچھا کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ (یہود) آپ ﷺ کو ایسا ہی جانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹے کو۔ یعنی ایک باپ کو اپنے بیٹے کے اپنا بیٹا ہونے کا جتنا یقین ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ کے نبی آخر الزماں ہونے کا ان کو ایسا ہی یقین ہے؛ اس کے باوجود ایمان نہیں لاتے۔ تو اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کو اس سے زیادہ یقین تھا۔ اور اس کی وجہ بھی ہے کہ بیٹے کے بیٹا ہونے کا یقین تو اس لئے ہے کہ یہ ہماری بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوا، لیکن یہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو، اور کسی اور کے ساتھ تعلق قائم کرلیا ہو، اور اس سے یہ بچہ پیدا ہوا ہو۔ باپ یوں سمجھتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ دوسرے کا بیٹا ہے۔ جیسے اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر ہے ؎

پردہ دری کا یہ نتیجہ نکلا ❁ جس کو سمجھتے تھے بیٹا وہ بھتیجہ نکلا

بعض مرتبہ بے پردگی کی وجہ سے ایسی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

بہرحال! حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب میں کہا: ہم کو اپنی اولاد کے اپنی اولاد ہونے کا جتنا یقین تھا اس سے زیادہ یقین تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور پیغمبر ہیں۔ تو یہ لوگ اس چیز کو جانتے تھے اور جاننے کی وجہ سے دوسروں کو کہتے بھی تھے کہ ان پر ایمان لاؤ، لیکن خود ایمان نہیں لاتے تھے۔

﴿ایک یہودی کا قصہ﴾

چنانچہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا جس کا نام عبدالقدوس تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا تھا اور آپ کا کام کاج کر دیا کرتا تھا، وہ بیمار ہوا، آخری گھڑی آ گئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی کہ وہ لڑکا جو ہمارا کام کاج کیا کرتا ہے؛ بیمار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خبر لینے کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ اب وہ بچنے والا نہیں ہے، آخری گھڑی ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: کلمہ پڑھ لے اور ایمان لے آ، تا کہ آخرت میں تیری نجات ہو جائے۔ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کلمہ پڑھنے کے لئے فرمایا تو وہ بچہ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی اس کو ہدیہ بھی دے تو وہ باپ کی طرف نگاہ اُٹھاتا ہے کہ باپ کی طرف سے اجازت ملے تو مَیں قبول کروں۔ اس کے باپ نے کہا: ﴿أَجِبْ أَبَاالْقَاسِمِ﴾ (ابوالقاسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ہے) ابوالقاسم جو فرما رہے ہیں اس کو مان لو۔ چنانچہ وہ بچہ ایمان لے آیا اور اس کے بعد اس کی وفات ہوئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم کے عذاب سے بچالیا۔ (باب عیادۃ المشرک حدیث ۵۶۵۷)

خیر! اس کی موت ایمان پر آئی۔

﴿اعتبار الفاظ کے عموم کا ہے، خاص موقعہ کا نہیں﴾

یہ آیت انہیں علماء یہود کو خطاب کرتے ہوئے نازل ہوئی ہے، لیکن ایک اصول ہے جو تفسیر اور اصول فقہ کی تمام کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ کوئی آیت کسی خاص واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہو، لیکن اس کا مضمون اگر عام ہے، تو اس کا حکم بھی عام ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ حکم خاص اسی واقعہ کے لئے ہو، بلکہ قیامت تک آنے والی دنیا اس آیت کی مخاطب سمجھی جائے گی اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا گیا ہے وہ تمام پر لاگو ہوگا۔

مثال کے طور پر ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کسی غزوہ کے سفر میں تھے، نماز کا وقت آ گیا، پانی نہیں تھا، نہ لوگوں کے پاس پانی تھا اور نہ جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں کوئی کنواں یا نہر تھی، اور نہ تالاب اور چشمہ تھا۔ اب نماز کا وقت گذر رہا تھا، لوگ پریشان تھے کہ کیا کیا جائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیمّم والی آیت نازل ہوئی کہ اگر تم سفر میں ہو اور پانی موجود نہیں ہے تو پھر مٹی سے تیمّم کرلو اور نماز ادا کرلو۔ (بخاری شریف کتاب التیمم، حدیث نمبر ۳۳۴)

دیکھئے! یہاں یہ آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوئی جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس اسی وقت کے لئے یہ حکم تھا بلکہ اس میں الفاظ عام ہیں، ہر ایک کو خطاب کیا گیا ہے، اس لئے قیامت تک کے لئے اجازت ہوگئی کہ اب جب بھی کوئی آدمی سفر میں ہے، پانی نہیں ہے یا گھر پر ہے لیکن بیماری کی وجہ سے پانی کے استعمال پر قدرت نہیں ہے؛ تو وہ تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔

ایسے ہی دوسری آیات میں بھی جو کسی خاص واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہوں، اس کا قاعدہ یہی ہے کہ اس کا مضمون عام ہوتا ہے، قیامت تک آنے والی دنیا کے لوگ اس

کے مخاطب ہیں۔ اسی طرح یہ آیت اگرچہ یہود کے علماء کو مخاطب بنا کر نازل ہوئی تھی اور ان کو کہا گیا ہے، لیکن اس کا مضمون عام ہونے کی وجہ سے ہر وہ آدمی جس میں یہ بات پائی جاتی ہو؛ وہ اس کا مخاطب ہے۔

دوسروں کو نصیحت کرتے ہو؛ خود کو بھول جاتے ہو؟

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ﴾ کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو۔ یہ خطاب علماءِ یہود کو تھا کہ وہ لوگوں کو ایمان لانے کے لئے کہتے تھے کہ یہ نبی آخر الزمان ہیں، ان پر ایمان لاؤ۔ لہٰذا کہا گیا کہ تم تو لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرتے ہو ﴿وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ اور اپنی ذات کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتاری ہوئی آسمانی کتاب توریت کو پڑھتے ہو۔ تم کو تو آسمانی کتاب کا علم حاصل ہے۔ اور جس آدمی کو آسمانی کتاب کا علم حاصل ہو؛ وہ ایسی نادانی کی حرکت نہیں کیا کرتا۔ ﴿أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا تم عقل اور سمجھ نہیں رکھتے؟ یعنی کیسی نادانی والی بات ہے کہ آدمی جس کام کو اچھا سمجھتا ہے اور اچھا سمجھ کر دوسروں کو کرنے کے لئے کہتا ہے۔ اور کوئی آدمی جب کسی دوسرے کو کسی اچھے کام کا حکم دیتا ہے تو اس کا مقصد سامنے والے کی خیر خواہی ہوتی ہے، اس کی بھلائی چاہتا ہے کہ بھئی! یہ کرلو؛ تمہارا کام بن جائے گا۔ تو جو آدمی دوسروں کی بھلائی چاہے، اور اپنی بھلائی نہ چاہے، اور خود اس پر عمل نہ کرے؛ تو اس سے بڑی نادانی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی لوگوں کو بھلی بات کے لئے کہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ پہلے خود اس پر عمل کرے۔ جب تک خود عمل نہیں کرے گا وہاں تک اس کے کلام

میں تاثیر اور قوت پیدا نہیں ہوگی۔ جس کو یہ بات کہی جائے گی وہ یہ سوچے گا کہ اگر یہ ایسا ہی کام ہوتا جس میں کوئی فائدہ تھا تو جو مجھے کہہ رہا ہے، وہ خود کیوں نہیں کرتا۔ آپ کو دیکھ کر اس کے اندر عمل کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا، وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، لیکن آپ کو کرتے ہوئے دیکھے گا تو اس کو بھی ترغیب ہوگی۔

ہمارے اسلاف اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ ایسی چیزیں جن کا تعلق اگرچہ شریعت کے حکم سے نہیں ہوتا لیکن اگر کبھی کسی کو بطورِ نصیحت کہنے کی نوبت آتی تو جب تک کہ خود اس پر عمل نہیں کرتے؛ وہاں تک کسی کو کہنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت اپنے بچے کو لے کر آئی اور حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ حضرت! میرا بچہ کھجور بہت کھاتا ہے، اس کو نصیحت کر دیجیے۔ کھجور گرم خوراک ہے، کثرت سے استعمال کرنے کی وجہ سے نقصان ہوسکتا ہے۔ حضرت نے کہا: اچھا! آٹھ دن کے بعد آنا، آٹھ دن کے بعد پھر وہ بچہ کو لے کر آئی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بچہ سے کہا: بیٹا! کھجور زیادہ مت کھایا کرو۔ بس! اتنا ہی کہا۔ وہ عورت یوں سمجھ رہی تھی کہ آٹھ دن کے بعد بلایا ہے تو کوئی خاص بات ہوگی، اس نے جب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے اتنا ہی جملہ سنا تو اس نے اپنے دل کی بات عرض کر دی کہ حضرت! اگر اتنی ہی بات کہنی تھی تو اس میں آٹھ دن کا انتظار کیوں کروایا؟ یہ بات تو آپ اس وقت بھی کہہ سکتے تھے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ جس وقت تو اپنے بچے کو لے کر آئی اور تو نے کہا کہ یہ زیادہ کھجور کھاتا ہے اس کو نصیحت فرما دیجیے، تو

مَیں بھی کھجور زیادہ کھاتا تھا، اب مَیں تو کھجور زیادہ کھاؤں اور بچے کو یوں کہوں کہ کھجور زیادہ مت کھاؤ۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میری بات میں اثر نہیں رہتا، اس لئے مَیں نے مہلت مانگی کہ پہلے کم سے کم مَیں اپنی اصلاح کرلوں اور خود اس پر عمل کرنے کے بعد اس قابل بن جاؤں کہ یہ بات اس کو کہہ سکوں، اس لئے ان آٹھ دنوں میں مَیں نے اپنی وہ زیادہ کھجور کھانے کی عادت چھوڑ دی۔ آج اب مَیں اس پوزیشن میں ہوں کہ اس کو یوں کہوں کہ بیٹا! زیادہ کھجور مت کھاؤ۔ حالانکہ کھجور کھانا کوئی بری بات نہیں ہے، اور پھر وہ تو بچہ تھا، ممکن ہے کہ بچہ کو موافق نہ آئے لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا۔ ہما شما [ہم اور آپ] ہوتے تو یہ ساری مصلحتیں دیکھتے، وہ حضرات اس چیز کو نہیں دیکھتے تھے، وہ تو ایک ہی بات جانتے تھے کہ ہم جب دوسرے کو کوئی چیز کہہ رہے ہیں تو پہلے خود عمل کریں؛ پھر ہم اس قابل ہیں کہ دوسرے کو کہیں۔

بہرحال! اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ بھلا تم لوگ دوسروں کو بھلی بات کا حکم کرتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو اور تم تو اللہ کی آسمانی کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو، اور اس کے علم سے واقف بھی ہو؛ پھر بھی اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔

کیا نصیحت کے لئے خود عمل کرنا ضروری ہے؟

اب یہاں ایک مسئلہ اور ہے، کیا وہ آدمی جو خود نیکی کا کام نہیں کرتا؛ اس کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو اس نیکی کے کام کی ترغیب دے؟ یا ایک آدمی جس گناہ سے خود نہیں بچتا؛ کیا اس کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو اس گناہ سے بچنے کی تلقین کرے؟ مثلاً ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا لیکن اب کیا اس کے لئے ناجائز ہے کہ وہ دوسروں کو یوں کہے کہ نماز پڑھو، یا ایک آدمی سینما دیکھتا ہے تو کیا اس کے لئے ناجائز ہے کہ دوسروں کو یوں کہے کہ سینما مت دیکھو؟

تو علماء نے لکھا ہے کہ بھلی بات کا حکم کرنا اور بری بات سے روکنا ہر آدمی کا فریضہ ہے، اگر وہ خود عمل نہیں کرتا تو وہ گنہ گار ہے۔ نماز نہیں پڑھتا تو نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے گنہ گار ہے، لیکن اس کا بیٹا بھی نماز نہیں پڑھتا تو اس کو چاہیے کہ بیٹے کو تاکید کرے کہ بیٹا! نماز پڑھو۔ اگر بیٹے کو بھی تاکید نہیں کرے گا تو یہ دوسرا گناہ ہے۔ اب دو گناہ ہوگئے۔ خود بھی عمل نہیں کرتا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بیٹے کو بھی نماز کے لئے نہ کہے۔ بیٹے کو نماز کی تاکید کرنا الگ ذمہ داری اور الگ فریضہ ہے اور خود نماز پڑھنا الگ فریضہ ہے۔ اب اگر وہ ایک فریضہ انجام نہیں دیتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرا فریضہ بھی انجام نہ دے۔ ورنہ دو فریضے چھوڑنے کا گنہ گار ہوگا۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ ایک آدمی روزہ رکھتا ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا، تو کوئی اس کو یوں کہے بھلا آدمی نماز تو نہیں پڑھتا، روزہ کاہے کو رکھتا ہے؟ غور کیجیے یہ کوئی بات ہوئی۔ روزہ رکھتا ہے تو ایک نیکی کا کام کر رہا ہے اور ایک فریضہ ادا کر رہا ہے، اب دوسرا فریضہ ادا نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ جو فریضہ ادا کر رہا ہے اس کو بھی چھوڑ دے۔

……یہ انداز غلط ہے

یہیں سے اس بات کی غلطی بھی معلوم ہوگئی کہ لوگ جو کہتے ہیں وہ کتنا غلط ہے کہ ڈاڑھی رکھتے ہو اور ایسا کام کرتے ہو۔ یہ ایک جملہ ہے جو لوگ بولتے ہیں۔ لو! جماعت میں جاتے ہو اور ایسے کام کرتے ہو۔ یہ کہنا غلط ہے۔ ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا۔ اس نے ڈاڑھی رکھی یہ کوئی گناہ کا کام نہیں کیا۔ ڈاڑھی رکھنا الگ سے ایک واجب ہے جس کو وہ ادا کر رہا ہے۔ نماز نہیں پڑھتا یہ الگ چیز ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ نماز نہیں پڑھتا تو ڈاڑھی بھی منڈوا دے۔ فلاں کام نہیں کرتا تو جماعت میں جانا بھی چھوڑ دے۔ یہ جو ایک عام مزاج بنتا

جارہا ہے؛ یہ غلط ہے۔ ایسی باتیں تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کو کسی کی طرف سے بھلی بات کہی جاتی ہے تو بری معلوم ہوتی ہے۔ ہماری طرف سے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہمیں کسی نے کوئی نصیحت کی بات کہی تو چاہے وہ اس نصیحت پر عمل نہ کرتا ہو لیکن ہمیں تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ دیکھو! اللہ کا بندہ اپنی اتنی خیر خواہی نہیں کر رہا ہے جتنی میری کر رہا ہے۔ ہمیں تو اس کا غلام بن جانا چاہیے، نہ کہ اس پر اعتراض کریں۔ (مجمع بہت محظوظ ہوا اور خوب ہنسا) اب اگر ہمیں عمل کی توفیق نہیں ملتی تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔ باقی یہ انداز اچھا نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں جو کہا گیا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ کوئی آدمی روزہ رکھتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا تو اس کو جب یوں کہا جاتا ہے کہ روزہ رکھتا ہے، نماز نہیں پڑھتا؟ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تو روزہ رکھنا چھوڑ دے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب روزہ رکھتا ہے تو نماز بھی پڑھ، اسی طرح یہاں اس آیت میں بھی ہے کہ جب تم لوگوں کو بھلی بات کا حکم کرتے ہو تو خود بھی تو عمل کرو۔ یہ نہیں ہے کہ خود عمل نہیں کرتے ہو تو دوسروں کو بھلی بات کا حکم مت کرو۔

اب اگر کوئی شخص آیت کا مطلب یہ نکالے کہ تم عمل نہیں کرتے تو ہم کو بھی مت کہو، تو یہ اس کی زبردست بھول ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کے بندے! جب بھلی بات کے لئے دوسروں کو تاکید کرتے ہو تو خود اپنی ذات کو کیوں بھول جاتے ہو؟ ﴿وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ﴾ خود دلیل ہے اس مطلب کی جو بیان کیا گیا۔ اپنے کو بھول جاتے ہو یعنی خود کیوں نہیں کرتے؟ یہ مطلب نہیں ہے کہ بھلی بات کا حکم کرنا چھوڑ دو۔

﴿ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو جو خود کرتے نہیں؟﴾

دوسری آیت ہے: ﴿یَاأَیُّهَاالَّذِیْنَ آمَنُوْالِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَاتَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللهِ أَنْ تَقُوْلُوْامَالَاتَفْعَلُوْنَ﴾ اے ایمان والو! کیوں ایسی بات اپنی زبان سے نکالتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بڑی ناراضگی کی بات ہے کہ تم اپنی زبان سے ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ دراصل اس آیت کا ایک خاص شانِ نزول ہے کہ کچھ مسلمان بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک کون سا عمل سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے تاکہ ہم وہ عمل کریں۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ کسی کو نبی کریم ﷺ کے پاس یہ سوال لے کر بھیجیں، لیکن ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے سورۂ صف کی یہ آیت نازل فرمائی جس میں آگے ہے: ﴿إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ جو لوگ اللہ کے راستے میں ایسی صف بنا کر جیسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو، اللہ کے دشمنوں سے لڑتے ہیں، یہ عمل اللہ کو بہت پسند ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ پسندیدہ عمل ہے۔ اب یہ حکم تو پہلے ہی آ چکا تھا اور اس حکم پر عمل کے معاملہ میں بعض لوگوں نے کچھ کوتاہی کی تھی۔ غزوۂ اُحد اس سے پہلے پیش آیا تھا اور اس موقعہ پر بعض حضرات افراتفری کی وجہ سے میدان چھوڑ کر ہٹے تھے یا بعضوں نے تمنا کی تھی کہ اگر جہاد کا حکم آیا تو ہم عمل کریں گے۔ تو عمل تو ضرور کیا لیکن سنتے ہی اولین وہلہ میں طبیعت پر گرانی ضرور ہوئی تھی۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یوں کہتا ہے اچھا! آپ کیا چاہتے ہیں؛ بتاؤ، آپ کی مانگ پوری کروں گا لیکن جب کہا جاتا ہے تو پھر اس کو شوک (Shock) لگتا

ہے، اگرچہ کیا ہوا وعدہ پورا تو کرتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی بعض لوگوں کو جہاد کا عمل ذرا بھاری معلوم ہوا، اگرچہ انہوں نے عمل تو کیا۔ لیکن روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کے آنے پر اولین وہلہ میں ان کو گرانی ہوئی تھی۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ باتیں تو ایسی کرتے تھے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوب ہے تو ہم وہ کریں، جب وہ حکم آیا تو پھر جھجک محسوس کرنے لگے۔ اسی کو کہا گیا: ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ﴾ ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو جو تم کرتے نہیں۔

﴿اپنی ذات پر نگاہ نہ ہو﴾

دیکھو! کوئی آدمی اگر اچھا کام کرنے کی تمنا کرے تو یہ اچھی بات ہے۔ دو درجے ہیں، کسی اچھے کام کے کرنے کا ارادہ جب آدمی ظاہر کرتا ہے تو کبھی تو اس ارادے کو دعویٰ کی شکل میں ظاہر کرتا ہے جیسے اگر ہمیں معلوم ہو جائے تو ہم کریں گے۔ اور ایک بات یاد رہے کہ کسی بھی کام کو آدمی دعوے کی شکل میں ظاہر کرے؛ یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ کیونکہ دعوے کے طور پر جب کوئی بات آدمی زبان سے نکالتا ہے تو اس وقت عام طور پر اس کی نگاہ بجائے اللہ تعالیٰ کے اپنی ذات پر ہوا کرتی ہے، اور یہی خطرناک پہلو ہے۔ جہاں کہیں کسی کام میں آدمی کی نگاہ اپنے آپ پر ہو گئی، اس کو بھروسہ اپنی ذات پر ہو گیا، اپنی قوتِ بازو پر ہو گیا تو گڑبڑ ہو گی۔ چھوٹے سے اور معمولی سے کام میں بھی وہ گڑبڑی میں پڑ جائے گا۔ اور بڑے سے بڑا کام ہو لیکن اس کی نگاہ اپنی ذات پر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی ذات سے انجام ہو کر رہے گا۔ اس لئے یہ ہونا چاہیے۔ ایسے واقعات قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔

﴿حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا قصہ﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت خضر کی ملاقات کے لئے گئے، جس کا قصہ سورۂ کہف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ ان سے ملاقات کہاں ہوگی؟ علامت کیا ہے؟ تو باری تعالیٰ نے کہا تھا کہ جہاں دو دریا ملتے ہیں، اور ساتھ میں ایک مچھلی تل کر لے جاؤ، جہاں وہ مچھلی زندہ ہو کر پانی کے اندر چلی جائے وہاں ہمارے اس بندے سے ملاقات ہوگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چلے تو ان کے ساتھ خادم حضرت یوشع بن نون علیہ السلام بھی تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد نبی بنائے گئے تھے۔ جب وہاں پہنچے جہاں دو دریا ملتے ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام تھکے ہوئے تھے، انہوں نے کہا کہ میں تو سوتا ہوں تم ذرا اس مچھلی کا خیال رکھنا۔ اس پر حضرت یوشع نے کہا کہ یہ کوئی بڑی بات تھوڑے ہی ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے، چھوٹا بچہ بھی اس کام کو انجام دے سکتا ہے۔ لیکن جس وقت یہ جملہ ان کی زبان سے نکلا اس وقت اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونے کے بجائے اپنی ذات پر ہو گیا، تو نتیجہ کیا نکلا؟ وہ بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے سامنے وہ مچھلی زندہ ہوئی اور دریا میں داخل ہوئی۔ انہوں نے یہ سارا منظر دیکھا اور سوچا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب نیند سے بیدار ہوں گے تو بتا دوں گا۔ لیکن جب وہ نیند سے اٹھے تو یہ بھول گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: چلو! آگے بڑھیں۔ ان کو تو معلوم نہیں تھا کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔ وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور چلتے رہے، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھوک لگی تو انہوں نے کہا: کھانا لاؤ۔ اب ان کو یاد آیا کہ اوہو! وہ مچھلی تو زندہ ہو کر دریا میں داخل ہو گئی تھی ﴿وَمَا اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ﴾ یہ شیطان ہی کی حرکت ہے کہ میں آپ سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا۔ (بخاری شریف۔ کتاب العلم، حدیث ۴۴)

﴿حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آنکھ لگی رہ گئی﴾

اسی طرح روایتوں میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، رات بھر آپ نے سفر کیا، آدھی رات کے بعد آپ آرام کے لئے اترے۔ آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ رات کے ابتدائی حصہ میں سفر جاری رکھتے تھے اور آدھی رات کے بعد آرام فرماتے تھے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہم کو کون اٹھائے گا؟ اس لئے کہ آدھی رات کے بعد آرام کر رہے ہیں اور سب تھکے ہارے ہیں، ایسا نہ ہو کہ سب کی آنکھ لگی رہ جائے، اور نماز فوت ہو جائے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مَیں اُٹھاؤں گا، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ سب سو گئے اور ان کو کام حوالے کر دیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں اونٹ کے کجاوے کے ساتھ ٹیک لگا کر سورج کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا کہ جہاں پو پھٹے گی اور صبح کا اجالا نمودار ہو گا؛ سب کو اٹھا دوں گا۔ اور برابر دیکھ رہے ہیں۔ جب پو پھٹنے کا وقت قریب آیا تو ان کی بھی آنکھ لگ گئی اور ایسی لگی کہ سورج طلوع ہو گیا اور سب کی نماز قضا ہو گئی۔ جب سورج بلند ہوا اور تپش آنے لگی تو سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کی آنکھ کھلی۔

نبی کریم ﷺ کی بھی نماز قضا ہوئی اس کی وجہ سے کسی کو کوئی اشکال نہ ہو، یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضا کروائی گئی تھی، کیونکہ قضا کس طرح پڑھی جاتی ہے یہ بھی تو امت کو بتلانا تھا ورنہ یہ حکم کیسے معلوم ہوتا۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے آپ ﷺ فرماتے ہیں ﴿اِنِّیْ لاَ أَنْسیٰ بَلْ أُنَسّٰی لِأَسُنَّ﴾ آپ کو نماز میں کبھی سہو بھی ہوا، اور آپ نے سجدۂ سہو بھی کئے، ایسے کئی واقعات ہیں، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں بھولتا نہیں ہوں بلکہ بھلا دیا جاتا ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھول ڈال دی جاتی ہے؛ تاکہ لوگوں کو طریقہ معلوم ہو۔

(مسلم شریف۔ باب قضاء الصلوۃ الفائتۃ حدیث ۶۸۰)

﴿عہدہ طلب کرنا اسی لئے منع ہے﴾

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ کام چھوٹا سا ہو اس میں بھی اگر آدمی اپنی ذات پر اعتماد کرے تو وہ کام گڑبڑ میں پڑتا ہے، اس لئے کبھی بھی دعوے والی شکل پیدا نہ ہو اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اسی لئے حدیثِ پاک میں روکا گیا ہے کہ کوئی عہدہ مت مانگو، کیونکہ آدمی جب عہدہ مانگتا ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ یوں کہنا چاہتا ہے کہ مَیں اس عہدہ کا حق ادا کروں گا۔ یہ ایک طرح کا دعویٰ ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں آتی۔ یہاں اس آیت میں اس پر تنبیہ کی گئی کہ ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو جس پر بعد میں تم سے عمل نہیں ہو پاتا، یہ بات اللہ تعالی کے یہاں بڑی ناراضگی کی ہے کہ تم اپنی زبان سے ایسی بات نکالو۔

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ دعویٰ الگ ہے، دعوت الگ ہے۔ دعوت کے طور پر کہے، دعوے کے طور پر نہیں۔ لوگوں کو کام کا کہے اور پھر اگر اس سے خود کوتاہی ہوگئی تو اس میں تلافی کی ضرور کوشش کرے۔

﴿بے عمل علماء اور واعظوں کا انجام﴾

بہر حال! کوئی آدمی دوسروں کو نیکی کا حکم کرے اور خود نہ کرے تو اس پر وعیدیں آئی ہیں۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ شبِ معراج میں آپ ﷺ کا گذر کچھ ایسے افراد کے اوپر سے ہوا کہ جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جا رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتلایا کہ یہ آپ کی امت کے وہ علماء اور واعظ ہیں جو لوگوں کو بھلی بات کا حکم کرتے تھے لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے (مسند احمد، حدیث نمبر ۱۲۳۹۱) یہ بڑی خطرناک چیز ہے، آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿حضرت شعیب علیہ السلام کا ارشاد﴾

﴿وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلىٰ مَا أَنْهٰكُمْ عَنْهُ﴾ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری آیت بھی پیش کی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا قول اور ان کا جملہ نقل کیا، وہ اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مَیں ایسا نہیں کرتا کہ جس چیز سے تم کو روکوں؛ وہ خود کروں۔ یعنی بتوں کی پوجا سے تم کو روکوں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے تم کو روکوں اور پھر مَیں خود اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کروں، ایسا مَیں نہیں کرتا، کوئی نبی ایسا نہیں کرسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جو آدمی لوگوں کو بھلی باتوں کا حکم کرے، اس کو اس بات کا اہتمام اور کوشش کرنی چاہیے کہ پہلے خود اس پر عمل کرے اور پھر لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے؛ تو ان شاء اللہ یہ چیز مؤثر ہوگی۔ یہ چیز اس کے کلام میں تاثیر پیدا کرتی ہے اور لوگوں کو عمل کے لئے ابھارتی ہے اس کی وجہ سے کلام میں قوت آتی ہے۔

﴿حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے مناقب﴾

عن أبی زید أسامة بن زید بن حارثة رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: يُؤْتیٰ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقٰى فِي النَّارِ، فَتَنْدَلِقُ أَقْتَابُ بَطْنِهِ، فَيَدُوْرُ بِهَا كَمَا يَدُوْرُ الْحِمَارُ فِي الرَّحَا، فَيَجْتَمِعُ إِلَيْهِ أَهْلُ النَّارِ فَيَقُوْلُوْنَ: يَا فُلَانُ! مَا لَكَ؟ أَلَمْ تَكُ تَأْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ؟ فَيَقُوْلُ: بَلٰى، كُنْتُ آمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا آتِيْهِ، وَأَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ وَآتِيْهِ.

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضرت خدیجہ کے غلام تھے، بعد میں ان کو آزاد کردیا گیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا۔ (تفسیر قرطبی۔۱۴/۱۱۸)

اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ اصل میں تو یہ آزاد تھے، اس زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے اوپر حملہ کرتا تھا اور اس دوران اس قبیلے کی عورتیں پکڑ لی گئی تو ان کو باندی بنالیا، بچے پکڑے گئے تو ان کو غلام بنالیا، ایسا ہوتا رہتا تھا۔ یہ بھی کہیں سفر میں تھے کسی قافلے والوں نے ان کو پکڑ کر غلام بنالیا اور مکہ میں لاکر بیچ دیا، حضرت خدیجہ نے خرید لیا۔ بعد میں جب حضرت خدیجہ کے ساتھ حضور ﷺ کا نکاح ہوا تو انہوں نے حضور کے حوالے کر دیا، آزاد ہو گئے۔ ان کے والدان کی تلاش میں تھے، لوگوں کو پوچھتے رہتے تھے۔ ان کے قبیلے کے کچھ لوگ مکہ مکرمہ بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے تھے، انہوں نے ان کو دیکھ لیا، معلوم ہوا کہ یہ وہی ہیں۔ انہوں نے جا کر ان کے والد کو بتلایا کہ تمہارا بیٹا تو وہاں ہے۔ اب ان کے والد اور چچا ان کو لینے کے واسطے آئے۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارا بیٹا آپ کے پاس ہے اور ہم اس کو لینے کے واسطے آئے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر وہ جانا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے، لیکن اگر وہ نہ چاہتا ہو؛ تو مَیں زبردستی نہیں بھیجوں گا۔ اس کے بعد حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور ان سے کہا کہ ان کو پہچانتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! یہ میرے ابا ہیں۔ ان کو پہچانتے ہو؟ کہا: ہاں! یہ میرے چچا ہیں۔ آپ ﷺ فرمایا: دیکھو! یہ تم کو لینے کے واسطے آئے ہیں، تم کو اگر جانا ہو تو میری طرف سے اجازت ہے اور میرے پاس رہنا ہو تو اس کی بھی اجازت ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: مَیں تو آپ کے پاس رہوں گا۔ اب ابا اور چچا کہتے ہیں کہ عجیب لڑکا ہے، غلامی کو آزادی کی زندگی پر پسند کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مَیں تو یہاں ہی رہوں گا۔ خیر! وہ واپس نہیں گئے۔ انہوں نے حضور ﷺ کے پاس رہنا پسند کیا تو حضور کو ان کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ آپ نے فرمایا: آج سے تم میرے

بیٹے ہو۔ اس وقت تک قرآن میں منہ بولا بیٹا بنانے کی ممانعت آئی نہیں تھی اور عرب میں دستور یہ تھا کہ اگر کوئی کسی کو منہ بولا بیٹا بنا لیتا، جس کو (متبنّٰی) کہتے ہیں اور انگریزی میں (Adopted) کہتے ہیں؛ تو اس کی اسی کی طرف نسبت کرتے تھے، چنانچہ لوگوں نے ان کو زید بن محمد کہنا شروع کر دیا، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعت آئی کہ کسی کو اس طرح منہ بولا بیٹا بنانا کہ اس کو اس کے باپ کے بجائے دوسرے کی طرف نسبت کرو؛ اس کی اجازت نہیں ہے، اس کے حقیقی باپ ہی کی طرف نسبت کرو؛ لہٰذا پھر ان کو زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔

ان کے اور بھی بہت سارے مناقب ہیں، وہ حضور ﷺ کو محبوب تھے، آپ ﷺ ان سے بہت محبت فرماتے تھے، ان کو حِبُّ الرسول کہا جاتا ہے، اور ان کے ہی صاحبزادے حضرت اسامہ ہیں۔ حضرت زید بن حارثہ کا نکاح حضرت امِ ایمن سے ہوا تھا، وہ جنہوں نے حضور کو بچپن میں کھلایا تھا، حضور کے والد کی باندی تھیں، ان سے یہ حضرت اسامہ پیدا ہوئے تھے۔ حضرت زید گورے چٹّے تھے اور حضرت اسامہ ذرا سانولے تھے، چونکہ ان کی والدہ ام ایمن حبشی تھیں، اس لئے ان میں سانولاپن آیا تھا، ان کے سانولے ہونے کی وجہ سے بعض لوگ ان کے نسب میں شک کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ یہ دونوں باپ بیٹا یعنی حضرت زید اور حضرت اسامہ مسجد نبوی کے صحن میں چادر اوڑھے سوئے ہوئے تھے، دونوں کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے اور پیر کھلے ہوئے تھے، اس وقت عرب کا ایک مشہور قیافہ شناس (قائف: جو نشانیاں دیکھ کر بتلائے کہ یہ اس کا باپ یا بیٹا ہے) وہاں سے گذرا، اس نے دونوں کے پاؤں دیکھے، چہرے نہیں دیکھ سکا، اس نے دونوں کے پاؤں دیکھ کر کہا:

﴿اِنَّ هٰذِهِ الْأَقْدَامَ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ﴾ یہ باپ بیٹے کے پاؤں معلوم ہوتے ہیں، یہ سن کر حضور ﷺ کو بہت خوشی ہوئی، واپس تشریف لاکر حضرت عائشہ سے کہا: دیکھو! مُجزّز نے یہ بات کہی ہے۔ (ابوداؤد۔ باب فی القیافہ حدیث ۲۲۶۷) مطلب یہ کہ عرب لوگ جس کی بات کو مانتے ہیں اس نے بھی کہہ دیا، اب تو کسی کو کوئی اشکال نہیں رہے گا۔ ویسے تو ان کا نسب ثابت ہی تھا۔

بہرحال! حضرت زید کے انتقال کے بعد حضور ﷺ ان سے بہت محبت فرماتے تھے یہاں تک کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک ران پر حضور ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھلاتے تھے اور دوسری ران پر ان کو بٹھلاتے تھے اور دعا فرماتے تھے: اے اللہ! مَیں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو اس آدمی سے محبت کرنا جو ان دونوں سے محبت کرے۔ (بخاری شریف۔ باب مناقب الحسن والحسین حدیث ۳۷۴۷) اسی وجہ سے ان کو حِبُّ رسول اللہ یعنی ''حضور ﷺ کے لاڈلے'' کہا جاتا تھا۔ صحابہ کو کوئی بات پیش کرنی ہوتی تھی تو جہاں کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی وہاں ان کو آگے کیا جاتا تھا۔

﴿مساوات کا اسلامی قانون﴾

فتح مکہ کے موقعہ پر ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک عورت فاطمہ مخزومیہ نامی تھی۔ (قبیلۂ مخزوم جس سے ابوجہل تعلق رکھتا تھا، یہ قریش کا بڑا باعزت قبیلہ سمجھا جاتا تھا) یہ فاطمہ مسلمان تھی، لیکن ان کی عادت ایسی تھی کہ کسی سے کوئی چیز مانگ کر لی؛ پھر دیتی نہیں تھی۔ فتح مکہ کے موقعہ پر انھوں نے کسی کا کوئی سامان چرا لیا تھا اور چوری ثابت ہوگئی، اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، اس لئے حضور ﷺ نے اس کا حکم دے دیا۔ جب حضور ﷺ نے یہ حکم دیا تو سنّاٹا چھا گیا، سب ایک دم سے گھبرا گئے کہ قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت کے ہاتھ اگر کاٹے گئے تو قریش کی ناک کٹ جائے گی، یعنی ایک باعزت قبیلے میں ایسا ہوگا تو یہ تو بڑی بدنامی کی بات

ہوگی۔اب سب مشورہ کر رہے ہیں کہ اس سلسلے میں حضور ﷺ سے بات کی جائے۔لیکن حضور کو کہے کون کہ آپ ذرا رعایت فرمایئے۔مشورہ میں یہ طے ہوا کہ حضرت اسامہ کو بھیجا جائے کیونکہ وہ حضور کے لاڈلے تھے۔(میں یہی بتلانا چاہتا ہوں) اس لئے لوگوں نے یہ طے کیا کہ اگر یہ جا کر کچھ کہیں تو امید ہے کہ رعایت ہو جائے۔جب بڑے لوگوں نے ان کو تیار کیا تو یہ کہاں انکار کر سکتے تھے،حضورِ اکرم ﷺ کے پاس گئے اور سفارش کی؛ تو نبی کریم ﷺ بہت غصہ ہو گئے۔اتنا غصہ ہوئے کہ آپ کا چہرۂ انور سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ ان میں کا کوئی کمزور آدمی جب شریعت کے خلاف کوئی کام کرتا تھا تو اس کو تو سزا دیتے تھے اور جب بڑے گھرانے کا ایسا کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے۔اور پھر حضور ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا: ﴿وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْأَنَّ فَاطِمَةَ بِنْت مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا ،اعاذھا اللہ منھا﴾ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہ بھی (اعاذھا اللہ کہنا چاہیے) معاذ اللہ چوری کرے گی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹوں گا اور پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پر بہت بگڑے،آئندہ کے واسطے حضرت اسامہ تو ڈر ہی گئے۔(بخاری باب کراہیۃ الشفاعۃ فی الحد، حدیث ۶۷۸۸) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت کے احکام پر عمل کے معاملہ میں کسی کی کوئی رعایت نہیں ہونی چاہیے۔یہی قانون کی مساوات ہے۔

آج کل لوگوں نے مساوات کا مطلب ہی بدل دیا۔حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے بزرگوں میں سے ہیں،دارالعلوم دیوبند کے مدرس تھے۔وہ فرماتے تھے کہ جو قانون مرد کے لئے ہو وہی قانون عورت کے لئے ہو،لوگوں نے اس کا نام مساوات سمجھ لیا،حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ مساوات کا اصل مطلب یہ ہے کہ قانون پر عمل کرنے کے

معاملے میں کسی کی رورعایت نہ کی جائے۔باقی بڑے کے لئے جو قانون بنائیں گے تو کیا چھوٹے کے لئے بھی وہی قانون بنائیں گے؟ وہاں کیوں مساوات کا نام نہیں لیتے؟ بچوں کے لئے الگ بات ہوتی ہے، بڑوں کے لئے الگ ہوتی ہے۔خود جو لوگ مساوات کے قائل ہیں وہ بھی بہت سی چیزوں میں عورتوں کے لئے الگ قانون بنا رہے ہیں۔اس کی تفصیل کا ابھی موقعہ نہیں ہے، پھر کسی موقعہ پر بات کی جائے گی۔خیر! تو قانون میں مساوات اور برابری ہونی چاہیے۔یہ ایک جملہ ہے جس کا لوگوں نے غلط مطلب لے لیا ہے، مساوات کا مطلب اتنا ہی ہوتا ہے کہ جب ایک قانون بنتا ہے تو اس پر عمل کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہ کی جائے، جو بھی اس قانون کی زد میں آئے گا وہ اس سے نہیں بچ سکتا۔

﴿لیکن خود عمل نہیں کرتا تھا﴾

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز ایک آدمی لایا جائے گا (ایک آدمی کا مطلب ایک آدمی ہی نہیں ہے، بلکہ ایک جنس مراد ہے، اس میں اس طرح کے بہت سارے لوگ آتے ہیں) اور اس کو جہنم میں ڈالا جائے گا، جہنم میں گرنے کے بعد اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی اور وہ ان انتڑیوں کے اردگرد ایسے چکر لگائے گا اور گھومے گا جیسے کولہو کا بیل گھومتا ہے۔اس کی یہ کیفیت دیکھ کر جہنم والے سب اس کے پاس جمع ہو جائیں گے، عجیب وغریب خطرناک منظر ہوگا اور اس کو پوچھیں گے: ﴿یَا فُلَانُ! مَا لَکَ؟﴾ ارے بھائی! تم تو ہمیں بھلی بات کا حکم کیا کرتے تھے، بری باتوں سے روکا کرتے تھے، تم یہاں کہاں؟ وہ جواب میں کہے گا کہ جی ہاں! مَیں تم کو تو بری باتوں سے روکتا تھا، بھلی باتوں کا حکم کرتا تھا؛ لیکن خود عمل نہیں کرتا تھا اس لئے مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔

(بخاری شریف۔باب الفتنۃ اللتی تموج کموج البحر، حدیث ۷۰۹۸)

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ بعض جنت والے کسی کو جہنم میں دیکھیں گے اور کہیں گے: ارے فلاں! تیری باتیں سن کر تو ہم جنت میں آنے والے کام کرنے لگے اور جنت میں آئے؛ اور تو جہنم میں کیسے؟ وہ کہے گا: ہاں بھائی! جو باتیں مَیں تم کو کہتا تھا خود اس پر عمل نہیں کرتا تھا، اس لئے مَیں جہنم میں آیا اور تم نے اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے تم کو جنت میں بھیجا۔ اس لئے آدمی کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اگر وہ اس فریضہ کو انجام دے رہا ہے تو پہلے خود بھی بھلی باتوں پر عمل کرنے کا اہتمام کرے اور بری باتوں سے اپنے آپ کو بچائے۔ یہی چیز تاثیر بھی پیدا کرتی ہے، اور اسی میں برکت بھی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ نیکی کی ہر چھوٹی بڑی بات جو ہم کسی کو کہیں؛ اس پر پہلے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور برائی کی ہر چھوٹی بڑی بات جس سے ہم کسی کو روکیں؛ اللہ تعالیٰ اس سے بچنے کا اہتمام ہمیں نصیب فرمائے۔

﴿ دُعاء ﴾

سُبُحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلیٰ سَیِّدِنَامُحَمَّدٍالنَّبِیِّ الْاُمِّیِّ کَمَاتُحِبُ وَتَرْضٰی بِعَدَدِمَاتُحِبُ وَتَرْضٰی

رَبَّنَاظَلَمْنَااَنْفُسَنَاوَاِن لَّمْ تَغْفِرْلَنَاوَتَرْحَمْنَالَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! امورِ خیر میں سبقت کرنے والا اور جتنے بھی نیکیوں کے طریقے ہیں ان کو اختیار کرنے والا ہمیں بنا۔ اے اللہ! ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھیں، اے اللہ! اپنے شر کو محدود کرنے کی

اور لوگوں کو اپنے شر سے بچانے کا اہتمام کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نفس وشیطان کی شرارتوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! اپنی رضا اور خوشنودی عطا فرما، اپنی معرفت اور محبت کے انوار سے ہمارے قلوب کو منور فرما۔ اے اللہ! اپنی یاد اور ذکر سے ہمارے دلوں کو آباد فرما۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی تجھ سے مانگی؛ وہ ہم کو عطا فرما اور نبی کریم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی؛ ان سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! تو ہمارے بیماروں کو صحت کاملہ، عاجلہ مستمرہ عطا فرما، مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، پریشان حالوں کی پریشان حالی کو دور فرما، حاجت مندوں کی حاجتوں کو پورا فرما، ہماری دعاؤں کو نبی کریم ﷺ کے صدقہ اور طفیل میں قبول فرما۔

ربنا تقبل منا انك أنت السميع العليم وتب علينا انك أنت التواب الرحيم

وصلّى اللّٰه تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيدنا ومولٰنا محمد وآله وأصحابه أجمعين

برحمتك يا أرحم الراحمين